سلسلۂ آصفیہ

یعنی

فارسی شاعری کی تاریخ جسمیں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور اُن کے
خصوصیات اور اسباب سے مفصّل بحث کی گئی ہی، اور اسی کے ساتھ تمام
مشہور شعرا کا مفصّل تذکرہ، اور اُن کی شاعری پر تقریظ اور تنقید ہی

مُصنّفہٗ

شبلی نعمانی

باہتمام مولوی مسعود علی صاحب ندوی

مطبع معارف اعظم گڈھ میں چھپی

سنہ ۱۳۵۹ھ — سنہ ۱۹۴۰ء

طبع چہارم
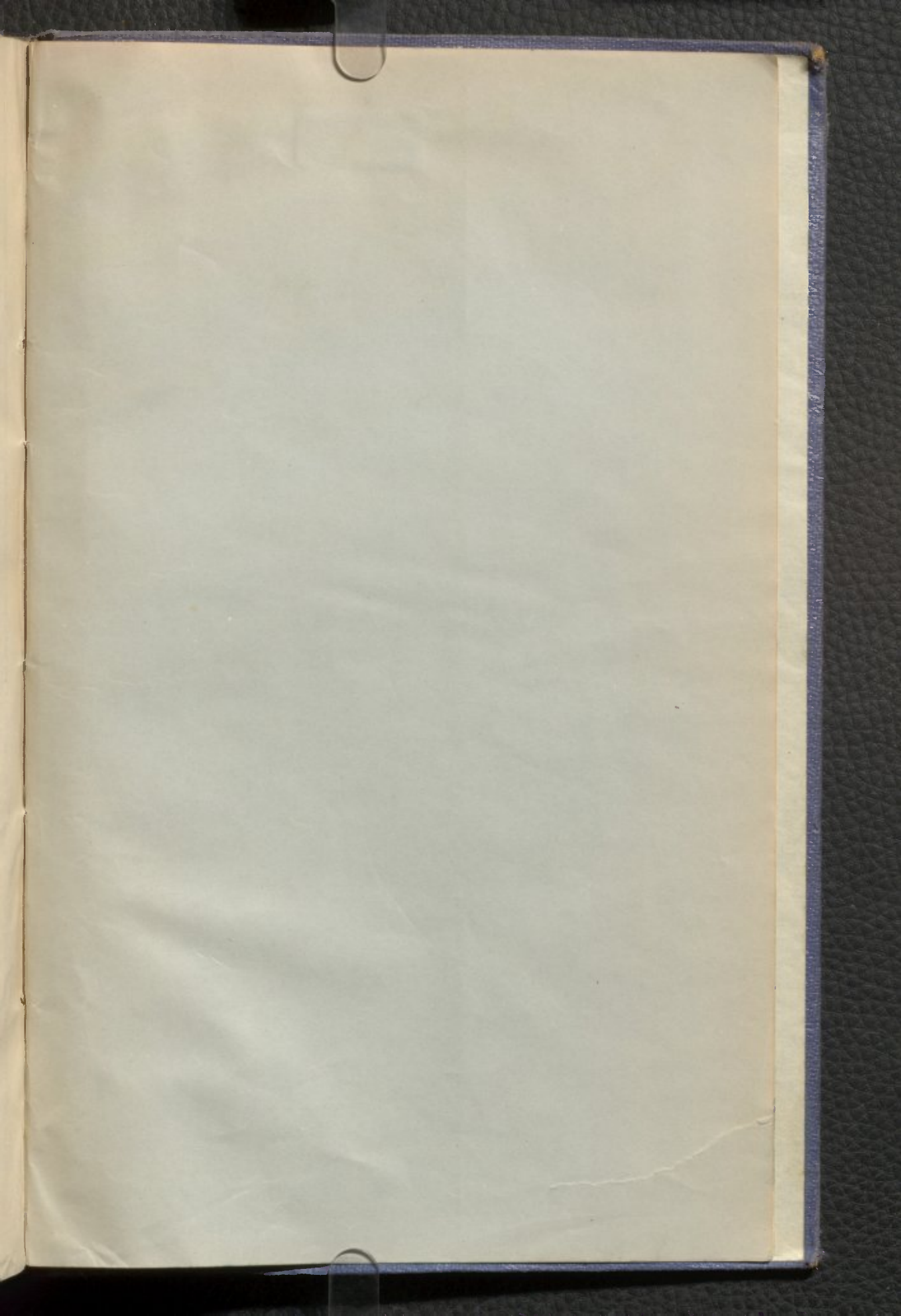
Shibli

Shi'ru-l-'Ajam

شعر العجم

حصّۂ اوّل

عبّاس مروزی سے نظامی تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف	مادۂ تاریخ اختتام تصنیف
تاریخ عجم	تذکرہ
۱۳۲۴ھ	۱۳۲۵ھ

مصنّفہ

شبلی نعمانی رح

طبع چہارم

مطبوعۂ معارف پریس اعظم گڈہ

۱۳۵۹ھ
۱۹۴۰ء

فہرست مضامین شعر العجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرم جویاں، درے رامی پرستند | فقیہاں، دفترے رامی پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد | کہ یاراں دیگرے رامی پرستند

وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ؕ

اسلام ایک ابرِ تھام تھا اور سطحِ خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا، لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی، عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم، سب اس کے حلقہ میں آئے، لیکن قبولِ اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرقِ مراتب تھا، اور فرقِ مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں، جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا، بو علی سینا، غزالی، رازی، طوسی، امام بخاری، مسلم، سیبویہ، جوہری، سب ایران ہی کی خاک سے اٹھے تھے، آج تمام

اسلامی دنیا میں ایران ہی کی تہذیب و معاشرت جاری ہی، ترکوں نے بڑی بڑی پرزور سلطنتیں قائم کیں، لیکن دفتر کی زبان اور دربار کے دستور اور آئین سب فارسی ہی رہے،

ایران کی خاک فنونِ لطیفہ کی قابلیت میں بھی سب سے ممتاز تھی، اور بالخصوص شاعری اس کا خمیر تھا، اسلام نے اس خاص جوہر کو زیادہ چمکایا، اور اس حد تک پہنچایا کہ تمام دنیا کی شاعری ایک طرف، اور صرف ایران کی شاعری ایک طرف، لیکن افسوس یہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی زبان میں ایران کی شاعری کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جس سے ظاہر ہوتا کہ شاعری کب شروع ہوئی، کن اسباب سے شروع ہوئی؟ کس طرح عہد بعہد بڑھی؟ کیا کیا انداز قائم ہوئے؟ کیا کیا صورتیں بدلیں؟ ملکی اور قومی حالتوں نے اس پر کیا کیا اثر کئے، خود اس نے ملک اور قوم پر کیا اثر ڈالا؟

شعرائے کے تذکرے بہت ہیں لیکن وہ درحقیقت بیاض اشعار ہیں جن میں شعرا کے عمدہ اشعار انتخاب کر کے لکھدیئے ہیں، شعرا کے حالات اور واقعات کم اور نہایت کم ہیں، اور شاعری کے عہد بعہد کے انقلابات اور ان کے اسباب کا تو مطلق ذکر نہیں ہی. اس کمی کو مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور اکثر اس ادھیڑبن میں رہتا تھا، مئی ۱۸۹۶ء میں میرے معزز دوست اور اُستاد مسٹر آرنلڈ نے مجھکو اطلاع دی کہ جرمن کے ایک پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر نے اس موضوع پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہی، میں اُس زمانہ میں فرنچ زبان سیکھ رہا تھا، بڑے شوق سے کتاب منگوائی لیکن وہ ۸۰ صفحوں کا ایک

رسالہ تھا جس میں شعرا کے نہایت معمولی حالات تھے، ایک مدت کے بعد اس مصنف کی ایک اور ضخیم کتاب شائع ہوئی، جو تحقیق اور تدقیق کے لحاظ سے نہایت حیرت انگیز تھی لیکن وہ زبان کی تاریخ ہے، جسمیں ژند پہلوی وغیرہ زبانوں پر نہایت محققانہ بحث کی ہے اور اسلام کے قبل کی تصنیفات کا سراغ لگایا ہے، شاعری کی تاریخ سے اُسکو لگاؤ نہیں،

اس اثنا میں سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد کے تعلق سے سلسلۂ کلامیہ کی طرف متوجہ ہوا، اور چند کتابیں لکھیں جو چھپ کر شائع ہوئیں، اس سلسلہ سے فی الجملہ فراغت ہوئی تو پچھلے سال پُرانا خیال پھر تازہ ہوا، اور ۲۰ مارچ ۱۹۰۶ء کو میں نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، لیکن بیچ بیچ میں موازنہ انیس اور الندوہ سدِ راہ ہوتے رہے، جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن، اس کام میں مصروف ہوا، اور فردوسی کے حال تک پہنچا تو، ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو صدمۂ پا کا واقعہ پیش آیا یعنی اتفاق سے میرے پاؤں میں گولی لگی اور پاؤں کاٹ ڈالا گیا[1]، یہ بھی فردوسی کی کرامت تھی کہ واقعہ سے ذرا پہلے شاہنامہ کا یہ مصرع "دریدو برید و شکست و ببست" قلم کی زبان پر تھا، اس حادثہ نے تین چار ہفتہ لکھنے سے معذور رکھا، پھر وہ سلسلہ شروع ہوا، اور باوجود درد اور تکلیف کے کچھ نہ کچھ کام ہوتا گیا، یہانتک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دور اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا،

کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدما، متوسطین، متاخرین کے تین دور ہیں، پہلا دور حنظلہ سے شروع ہو کر نظامی پر تمام ہوتا ہے، دوسرا کمال اسمٰعیل سے جامی تک اور تیسرا فغانی

[1] شبلی نامہ بہ رابہ جزائے عملش   پا برید ند و صدا خاست کہ سر می بایست

سے ابوطالب کلیم تک کلیم کے بعد شاعری شاعری نہیں رہی، بلکہ چیتاں گوئی بن گئی، ان دوروں کے لحاظ سے کتاب تین حصوں پر منقسم ہی، چوتھے حصہ میں شاعری پر عام ریویو ہے اور یہی حصہ گویا کتاب کی جان اور اسکی روح و رواں ہی، اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہی، اگرچہ بہت ہیں، لیکن خاص طرح پر جو ذکر کے قابل ہیں حسبِ ذیل ہیں،

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
لب اللباب	عوفی یزدی	سب سے پہلا تذکرہ ہے مصنف ساتویں صدی ہجری میں تھا اور اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں، پروفیسر براؤن نے تصحیح و تحشیہ کرکے شائع کیا ہی،
چہار مقالہ	نظامی عروضی سمرقندی	مصنف نظامی گنجوی کا ہمعصر تھا، گو مختصر رسالہ ہے، لیکن نہایت مفید باتیں لکھی ہیں، خود بھی باکمال شاعر تھا،
تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی		مشہور تذکرہ ہے، اور گو اکثر جگہ غلطیاں کی ہیں، تاہم دلچسپ اور مفید ہے،
تاریخِ آل غزنیں	بیہقی	مصنف مسعود بن سلطان محمد غزنوی کے زمانہ میں تھا، ضمناً شعرائے عصر کا تذکرہ

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
		کیا ہے،
عرفات	اوحدی	عرفی وغیرہ کا ہم صحبت تھا، یہ تذکرہ دو ضخیم جلدوں میں ہے، حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں،
میخانہ	عبد النبی فخر الزمانی	جہانگیر کے زمانہ میں تھا، صرف اُن شعراء کا حال لکھا ہے جنھوں نے ساقی نامے لکھے، تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل ہے اور اپنے ہمعصروں کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے،
تذکرۃ الشعراء	مرزا طاہر نصیر آبادی	۱۰۸۳ھ کی تصنیف ہے،
مآثر رحیمی	عبد الباقی نہاوندی	مصنف خان خاناں عبد الرحیم کا درباری تھا، کتاب اصل میں خان خاناں کی سوانح عمری ہے ضمن میں تمام شعرائے خاں خانانی کے حالات بھی لکھے ہیں، اور تمام تذکروں کی نسبت زیادہ مفصل اور صحیح لکھے ہیں،
مرآۃ الخیال	شیر خاں لودی	چھپ گیا ہے،
ہفت اقلیم	امین رازی	جہانگیر کے عہد میں لکھا گیا مستند اور معتبر ہے،

نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
تذکرہ میر تقی کاشی		سنہ ۹۹۳ء کی تصنیف ہے،
تذکرہ سامی	سام میرزا صفوی	خاندان صفویہ کا شہزادہ اور جہانگیر کا معاصر تھا معتبر کتاب ہی، مصنف جہانگیر کے عہد میں تھا
ریاض الشعرا،	والہ داغستانی	
سرو آزاد	مولوی غلام علی آزاد	شعرائے عہد تیموریہ کا تذکرہ ہی،
ید بیضا	"	عام تذکرہ ہی،
خزانہ عامرہ	"	صرف اُن شعرا، کا حال ہی جن کو مدح کے معاوضہ میں صلہ ملا،
مجمع النفائس	خان آرزو	
مجمع الفصحا	ہدایت قلی خاں	حال کی تصنیف ہی، شعرا، کا کلام نہایت کثرت سے جمع کیا ہے،

شعرا، کے کلیات اور دیوان جس قدر نظر سے گذرے اُن کی فہرست اس قدر لمبی ہی کہ کئی ورق صرف ہوں گے، اس لئے قلم انداز کرتا ہوں،

عجیب بات یہ ہے کہ یورپ نے فارسی زبان کے ساتھ مسلمانوں سے زیادہ اعتنا کیا، مسلمانوں کو اسلام سے قبل فارسی زبان کی ایک تصنیف کا بھی پتہ معلوم نہ تھا لیکن یورپ نے ان تصنیفات کا اس قدر سرمایہ جمع کر لیا کہ زردشت سے لیکر

نوشیرواں کے عہد تک زبان کی پوری تاریخ مرتب ہوگئی،

پروفیسر وارمسٹیٹر جرمنی نے فرنچ زبان میں ایک ضخیم کتاب لکھی جسمیں کیومرث سے لیکر اسلام کے عہد تک چار دور قائم کئے اور ہر دور کی زبان کی نحو وصرف، لغات، الفاظ وتغیرات پر مفصل ریویو لکھا، (یہ کتاب ہماری نظر سے گذری ہو) یورپ کے اور محققین نے خاص خاص زبانوں پر مستقل تصنیفات لکھیں، خصوصًا اوستا اور ژند کی زبان کے متعلق اسقدر کثرت سے معلومات مہیا کئے کہ نکتہ نکتہ حل ہوگیا، اکثر اساتذہ کے دیوان، جو نایاب تھے انکو بڑی کوشش اور تلاش سے بہم پہنچاکر تصحیح وتحشیہ کے ساتھ چھاپا، منوچہری کے قصائد ایران میں نہایت ناتمام اور غلط سلط چھپے تھے، لیکن فرانس میں اس اہتمام سے چھاپا کہ دیکھکر آنکھیں روشن ہوتی ہیں، اسکے ساتھ فرنچ میں اس کا ترجمہ بھی چھاپا، اور لغات واصطلاحات کی علٰحدہ فرہنگ لکھی، اسی طرح روس کے پروفیسر والنٹن ژوکوسکی نے انوری کے قصائد چھاپے، اور دیباچہ میں انوری کی سوانحمری اور کلام پر ریویو لکھا، پروفیسر نولدیکی نے خاص شاہنامہ کے تاریخی ماخذوں پر ایک مستقل کتاب جرمنی زبان میں لکھی شعرا کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جنمیں سے سرگور اوسلی کا تذکرہ عام طور پر مشہور ہی، سب سے زیادہ مکمل اور جامع کتاب پروفیسر براؤن نے لکھی جو کیمبرج کالج کے فارسی لکچرار ہیں، اس کتاب[1] کے دو حصے شائع ہوچکے ہیں،

ان کوششوں کے علاوہ قدیم فارسی زبان کی اصل کتابیں بہم پہنچائیں اور چھاپ کر

---

[1] اس کتاب کا نام لٹریری ہسٹری آف پرشیا ہے اور لندن میں ۱۹۰۳ء میں چھاپی گئی ہو،

شائع کیں، آج مسلمانوں کے پاس پہلوی زبان کا ایک حرف موجود نہیں لیکن یورپ نے پہلوی زبان کی بہت سی تصنیفات شائع کیں جن میں سے ایک کتاب یات زریراں حضرت عیسیٰؑ سے پانچسو برس قبل کی تصنیف ہے،

ان تصنیفات میں سے بعض بعض میری نظر سے گذریں، اور جن سے فائدہ اٹھا سکنا ممکن تھا میں نے فائدہ اُٹھایا لیکن ان تمام باتوں پر بھی یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کتاب کے لکھنے کا جو حق تھا پورا ہوا، قدیم واقعہ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے جو کمی کی وہ آج کیونکر پوری ہو سکتی ہی، ؎

گیرم کہ مرا طرز نوشتن نشد از یاد بیداست کہ با ایں سروساماں چہ نویسم

شعر کی حقیقت

چونکہ ایک مدت سے علم کی کمی اور طبیعتوں کی بدمذاقی نے شعر کی حقیقت پر پردہ ڈالدیا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ پہلے شعر کی حقیقت پر بحث کیجائے، تاکہ ایک صحیح معیار قائم ہو جس سے ایران کی شاعری کا اندازہ کیا جائے[1]،

شاعری کی حقیقت اور اُس کی ماہیت پر سب سے پہلے ارسطو نے بحث کی، چنانچہ اس نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام بوطیقا (پویٹری) ہے، اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا، اور ابن رشد نے اس کی تلخیص کی، اس تلخیص کے جستہ جستہ حصے پروفیسر

[1] شاعری کی حقیقت پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے نہایت اجمالی لکھا ہے، اسکے متعلق اس قدر مواد موجود ہی کہ ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہی،

شیخو ویس نے اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہی شامل کیے ہیں، افسوس ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا، اسلئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وہ مسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے،

شعر کی عام تعریف

کتب ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے، اور وہی عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہے، یہ ہی کہ کلام موزوں ہو، اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہو" لیکن یہ تعریف درحقیقت عامیانہ تعریف ہے، آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہو چکا ہی لیکن قدما کے کلام میں بھی اسکے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں، کہ شاعری صرف وزن وقافیہ کا نام نہیں کتب ادبیہ میں مذکور ہے، کہ ایک دفعہ حضرت حسان بن ثابتؓ کے صغیر السن بچے کو بھڑ نے کاٹ کھایا وہ حسان کے سامنے روتا ہوا آیا کہ مجھکو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہی حسان نے جانور کا نام پوچھا، وہ نام سے واقف نہ تھا، حسان نے کہا اچھا اُسکی صورت کیا تھی؟ بچے نے کہا۔ "کانہ مُلتفٌّ ببردی حبرۃ" یعنی "گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہی" چونکہ بھڑ کے پروں پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں اسلئے اُس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی، حسان اچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا کہ "واللہ صار ابنی الشاعر" یعنی خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا" فقرہ موزوں نہ تھا لیکن چونکہ نہایت عمدہ تشبیہ تھی، حسان نے سمجھا کہ بچہ میں شاعری کی قابلیت موجود ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے نزدیک شعر کی اصلی حقیقت کیا تھی؟

شعر صرف وزن وقافیہ کا نام نہیں،

ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر و شاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہی، اس میں شعراء اور علماے ادب کے جو اقوال نقل کیے ہیں، اُن سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے،

شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیل کا نام تھا نظامی عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی کا معاصر تھا اپنی کتاب چہار مقالہ میں لکھتا ہی،

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند والیتام قیاس نتیجہ بر آں وجہ کہ معنی خورد را بزرگ کند، و بزرگ را خرد و نیکو را در لباس زشت و زشت را در حلیہ نیکو جلوہ دہد، و با ایہام قوت غضبانی و شہوانی بر انگیزد تا بداں ایہام طبائع را انبساطے و انقباضے بود امور عظام را در نظام عالم سبب گردد"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ مقدماتِ موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدنما اور بری چیز خوش نما ثابت کیجائے، جس سے محبت و غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں، یہ قدما کے اقوال و خیالات تھے، یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں، اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں، مل نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہی جس کا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہی،

یورپ کے محققین کے نزدیک شعر کی ماہیت

انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذباتِ انسانی کو کچھ تعلق نہیں مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں تو اس سے ہم کو غصہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا، لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا، اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے، اور جو چیز ان جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے، وہی شاعری ہی، اس تعریف کی بنا پر تصویر، تقریر

وعظ بھی شعر میں داخل ہو جاتے ہیں، کیونکہ یہ چیزیں بھی جذباتِ انسانی کو برانگیختہ کرسکتی ہیں، اسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کر لیا ہے، لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "انسان جو کلام کرتا ہے اس کی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے، مثلاً اسپیچ، لکچر، وغیرہ، کہ ان سب کا مقصد دوسروں کو متاثر کرنا ہوتا ہے، کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی، بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے، اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے، مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اُس کی زبان سے جو الفاظ نکلیں گے، اُس کی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا، بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا، فرض کرو، وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وہی الفاظ اس کی زبان سے نکلیں گے، شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے، اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ، جو کلام اس قسم کا ہوگا اس سے جذباتِ انسانی برانگیختہ ہوں، اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں، بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اس کا نام شاعری ہے"

مل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے، لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے، اور اگر معیاری معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اردو کا دفترِ بے پایاں بالکل بیکار ہو جائیگا،

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہی جیسا آل صاحب کرنا چاہتے ہیں،
اور نہ اس قدر وسیع جتنا ہمارے علماے ادب نے کیا ہے،

شعر کی اصلی حقیقت

شعر (جیسا کہ ارسطو کا مذہب ہے) ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہی، فرق یہ ہی کہ مصور صرف
مادی اشیار کی تصویر کھینچ سکتا ہے، بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات
کی تصویر کھینچ سکتا ہی،

ایک شخص کا عزیز دوست جدا ہو رہا ہے، اس حالت میں جو اس پر صدمے گذرتے ہیں اور
دلدوز خیالات کا جو طوفان اس کے دل میں اُٹھتا ہے شاعر اُسکی تصویر اسطرح کھینچ سکتا ہے
کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور اُن کی تصویر کھینچی جاتی، تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ
کے ذریعہ سے کھینچی تھی،

اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اسطرح کیا جائے کہ اُس شے کی اصلی تصویر آنکھوں
کے سامنے پھر جائے، تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی، دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا،
باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی
کی طپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج، غم، غیظ، غضب، جوش،
محبت، افسوس، حسرت، خوشی، ان اشیا کا اس طرح بیان کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں میں
پھر جائے، یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے، یہی شاعری ہے،

ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کیجاسکتی ہی،

دنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں خواہ مادی ہوں مثلاً پہاڑ، بیابان، باغ، دریا وغیرہ

خواہ غیر مادی، مثلاً وصل، ہجر، تحسین، نفرین، ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے، اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے، لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہیں، بعض اشخاص پر کم بعض پر زیادہ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے، جو شخص ان مظاہرِ قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور بعینہ اس اثر کو الفاظ سے ادا بھی کرسکتا ہو، وہی شاعر ہے،

شاعر کے جذبات اور احساسات، فطرۃً نہایت نازک، لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں، دوست کی جدائی ہر شخص کے دل پر اثر کرتی ہے، لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہوجاتا ہے، دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے، لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے، ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اسطرح ادا نہیں کرسکتے جس طرح شاعر کرسکتا ہے، حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہرِ قدرت سے اور لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ظاہر کرسکتا ہو وہی شاعر ہے،

برادرِ عزیز مولوی حمید الدین نے جمہرۃ البلاغۃ فن بلاغت میں ایک نادر کتاب لکھی ہے اس میں شعر کی حقیقت نہایت نکتہ سنجی سے بیان کی ہے، اس کا خلاصہ ذیل میں ہے،

"شاعر کے لفظی معنی صاحبِ شعور کے ہیں، شعور اصل میں احساس (فیلنگ) کو کہتے ہیں، یعنی شاعر وہ شخص ہے جس کا احساس قوی ہو، انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی ہیں مثلاً رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا، یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اس سے خاص خاص

حرکات صادر ہوتی ہیں رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں، ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہی، انگڑائی میں اعضا تن جاتے ہیں، اسیطرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہی، شاعر کی طبیعت پر رنج، یا خوشی، یا غصہ، یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے، اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی، اسی کا نام **شاعری** ہی،

حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہی تو مختلف قسم کی آوازوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی، مثلاً شیر کی گونج، طاؤس کی جھنکار، کوئل کی کوک، بلبل کا ترانہ، اسیطرح انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہی تو الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی اور جسطرح حیوانات کے جذبات کبھی حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً طاؤس ناچنے لگتا ہی، سانپ جھومتا اور لہراتا ہی، اسی طرح انسان کو چونکہ نطق کے ساتھ نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوتا ہی، اسلئے موزوں الفاظ منہ سے نکلتے ہیں، اور ساتھ ہی انسان غنغنانے بھی لگتا ہی، اور جب یہ جذبہ زیادہ تیز ہو جاتا ہی تو انسان ناچنے لگتا ہی یہ سب باتیں جمع ہو جائیں تو یہی اصلی شعر ہے، اس بیان سے ظاہر ہوگا کہ شعر الفاظ وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے،

لیکن چونکہ یہ تمام چیزیں، جذبات کی کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں، اسلئے ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضرور نہیں، تاہم کوئی شعر راگ سے خالی نہیں ہو سکتا، وزن جو شعر کا ایک ضروری جزو ہے، راگ کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب ہمیشہ اشعار کو گا کر پڑھتے تھے شعر کے پڑھنے کو جو اہلِ عرب انشاد کہتے ہیں، اِسکی یہی وجہ ہی، کیونکہ انشاد کے اصلی معنی گانے کے ہیں،

ارسطو نے اس بحث میں سخت غلطی کی ہے، وہ کہتا ہو کہ شاعری کے جذبہ کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہی، اسکی وجہ یہ ہو کہ نغمہ اور رقص، ایک قسم کی مصوری ہی یعنی انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، آواز اور حرکات کے ذریعہ سے اُنکی تصویر کھینچتا ہی، چنانچہ رقاص جو کچھ گاتے ہیں، حرکاتِ رقص کے ذریعہ سے اس کو بتاتے جاتے ہیں،

لیکن ارسطو کا یہ خیال غلط ہی اصل یہ ہو کہ جذبات انسانی مثلاً رنج، خوشی وغیرہ انسان کے دل میں نہایت پرزور حرکت پیدا کر دیتے ہیں یہی حرکت آواز، یا راگ یا رقص یا تڑپ بنجاتی ہے مثلاً انسان جب ہنسی آتی ہو، تو دل میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہو، اور یہی حرکت ہنسی بنجاتی ہی، اور چونکہ یہ آثار حرکاتِ نفسانی کے مشابہ ہوتے ہیں، اسلئے وہ حرکاتِ نفسانی پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں جسطرح الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہیں، غرض جسطرح نطق ایک فطری چیز ہے اسی طرح یہ اشارات و حرکات بھی خود بخود سرزد ہوتے ہیں، وہ نقالی اور محاکات کی غرض سے نہیں کئے جاتے، گو یہ ممکن ہو کہ محاکات کا مقصد اس سے حاصل ہو جائے،

ان تمام خیالات سے تمکو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا، اور معلوم ہوگا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اسکی شاعری سے کچھ تعلق نہیں،

فارسی شاعری کی ابتدا

اس قدر عموماً مسلم ہے کہ اسلامی دور میں، شاعری تیسری صدی سے شروع ہوتی ہی ابو العباس مروزی کے اشعار جنکا ذکر آگے چل کر کہیں آئیگا اگر روایۃً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک

اتفاقیہ تفریح خاطر تھی، جو سلسلۂ تاریخی کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی،

شروع اسلام سے کئی سو برس تک فارسی شاعری کیوں وجود میں نہیں آئی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے، کہ دو سو برس تک شاعری کی زبان کیوں بند رہی، فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب یہ بتائے ہیں،

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ چنانکہ مشہور است کہ تمام کتب و تواریخ عجمیاں را عرب سوختند۔ ....

از کتب قدیمہ چیزے بر جا نگذاشتند الا قلیلے کہ پنہاں داشتند، چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی و شعر متروک شد، تا مدتے گذشت واوضاع بنوع دیگر گشت"

یہ مجمع الفصحاء کی عبارت تھی جو زمانۂ حال کا سب سے بڑا مستند تذکرہ ہے، اور ناصر الدین قاچار مغفور کے عہد میں ۱۲۸۴ء میں تصنیف ہوا ہی، یہ خیال اصل میں دولت شاہ کے تذکرہ سے ماخوذ ہے، اُس نے یہ روایت نقل کی ہو کہ "عبد اللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دیجائیں اس بنا پر آلِ سامان کے زمانہ تک فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا"،

ان بزرگوں کی تاریخ دانی کی داد دینے کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے ہمارے مضمون تراجم کو دیکھنا چاہئے جو رسائلِ شبلی کے ساتھ چھپ کر شائع ہوا ہے، لیکن استدلال کسقدر لطیف ہے، یعنی چونکہ ایران کی قدیم کتابیں برباد کر دی گئیں اس لئے اہلِ عجم فارسی میں شعر بھی نہ کہہ سکے،، اسلام نے ملکی زبان سے کبھی کچھ تعرض نہیں کیا، حضرت عمرؓ کے عہد سے حجاج ابن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے، حجاج کے زمانہ سے عربی میں ہو گئے، لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی، رفتہ رفتہ فارسی عربی مخلوط ہو کر اردو کی طرح

ایک جدید زبان پیدا ہوگئی، اور وہ گویا خاص اسلامی زبان تھی، جب خود فارسی زبان سے کسی قسم کے تعصب کا اظہار نہیں کیا گیا، تو فارسی شاعری نے کیا گناہ کیا تھا،

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام جس قوم میں پھیلتا تھا، اس کو مذہبی اثر سے اس قدر لبریز کر دیتا تھا کہ اس کو سوائے مذہب کے دنیا کی کسی چیز سے سروکار نہیں رہتا تھا، خود عرب کو دیکھو، وہ ملک جس کے در و دیوار سے شاعری کی آواز آتی تھی، اسلام کے آتے ہی دفعۃً چاروں طرف سناٹا چھا گیا، ولید کے زمانہ سے جب شاہانہ در و دربار قائم ہوا تو لوازم سلطنت کی حیثیت سے شاعری نے دوبارہ جنم لیا لیکن تخت کی زبان عربی تھی، اسلئے شاعری بھی عربی ہی رہی، شعراء جو مدحیہ قصائد کے ذریعہ سے زندگی بسر کرتے تھے فارسی میں شاعری کرتے تو ممدوح اُن کی زبان کیونکر سمجھتا، اور نہ سمجھتا تو انکی داد کیا دے سکتا، اتنے سے سہارے سے کہ مامون الرشید ایک مدّت تک خراسان میں رہا تھا، اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہو گیا تھا، عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا، اور مامون الرشید نے اُس کے صلہ میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیئے، ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرف تھجی تھا، اس سے پہلے اگر برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے تو ابوحفص حکیم سغدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا، شعر یہ ہے،

آہوئے کوہی در دشت چگونہ دودا ۔۔۔ ونداردیار بے یار چگونہ بودا،

ایک اور بڑا سبب یہ ہوا، کہ چند ہی روز میں اسلام نے اپنے خاص علوم و فنون اور دانشا کا سرمایہ اس قدر وسیع کر لیا تھا، اور ہر شاخ میں وہ اختراعات اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ اُس کے سامنے تمام قوموں کو اپنا قدیم لٹریچر ہیچ اور بے وقعت نظر آتا تھا، دوسری

تیسری صدی ہجری میں اسلام کی جہاں جہاں حکومتیں قائم ہوئیں یعنی ایران، مصر، شام، اندلس، ان تمام ممالک میں اسلامی علوم و فنون نے مفتوحہ قوموں کے علوم و فنون کو بالکل ماند کر دیا، اس لئے عرب کی شاعری کے آگے، دوسری قوموں کو اپنی زبان میں شاعری کرتے شرم آتی تھی خراسان، مصر و شام وغیرہ میں سیکڑوں ہزاروں شعرا پیدا ہو گئے تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے عربی ہی میں کہتے تھے، چنانچہ ثعلبی نے یتیمۃ الدہر میں ان عجمی شعراء کا مفصل تذکرہ لکھا ہے،

شاعری کے پیدا ہونے کے اسباب

تیسری صدی ہجری میں دولت عباسیہ کا آفتاب اقبال ڈھلنا شروع ہوا اور بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو کر نئی نئی حکومتیں قائم ہونے لگیں، اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت جو قائم ہوئی وہ خاندان طاہریہ تھا جو مامون الرشید کے مشہور سپہ سالار طاہر ذوالیمینین کی طرف منسوب ہے، یہ خاندان جو ۵۴ برس حکمراں رہا، اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ خود مختاری کا مدعی نہ تھا، لیکن خراسان میں اس کا اس قدر زور اور اقتدار بڑھ گیا تھا کہ خود مختاری کے تمام سروسامان پائے جاتے تھے، دربار میں شعراء کا ہونا بھی ضروری، اس لئے باوجود اس کے کہ یہ خاندان فارسی زبان سے بہت کم آشنا تھا، تاہم بہت سے شعرا پیدا ہو گئے، منوچہری دامغانی نے ایک قصیدہ میں متقدمین شعرار کا ذکر کیا ہے،

ابو العلاء و بو العباس و بو سلیک و بو المثل	آنکہ آمد از نواحیٔ آں کہ آمد از ہری
از حکیمانِ خراساں کو شہید و رودکی	بو شکورِ بلخی و بو الفتح بستی ہکذی

ان شعروں میں جن شعرار کے نام آئے ہیں، ان میں طاہریہ شعرا بھی ہیں، یعنی حنظلہ بادغیسی محمود وراق، فیروز مشرقی،

حنظلہ بادغیسی، یہ سب سے پہلا شخص ہی جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی ۲۱۹ھ میں انتقال کیا، عروضی سمرقندی[1] کی تصریح سے ثابت ہوتا ہی کہ وہ صاحبِ دیوان تھا چند اشعار یہ ہیں،

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند | از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
اور اسپند و مجمرہ ناید ہمی بکار | با روی ہمچو آتش و با خال چوں سپند

یعنی میرا معشوق نظرِبد سے بچنے کے لئے، آگ پر سپند جلاتا ہے، لیکن اسکو اس کی کیا حاجت ہے اس کا چہرہ خود آگ اور اُس کا قاتل خود سپند ہے خنطلہ نے ۲۱۹ھ میں وفات پائی،[2]

محمود وراق، محمد بن طاہر جو خاندانِ طاہر کا سب سے اخیر فرمانروا تھا یہ اُس کے زمانہ میں تھا، مجمع الفصحار میں اس کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں، ؎

نگارینا بہ نقد جانت ندہم | گرانی در بہا، ارزانت ندہم
گرفتم بہ جاں، دامانِ وصلت | نہم جاں از کف و دامانت ندہم

فیروز مشرقی، اصل میں یمن کا رہنے والا تھا، ۲۸۳ھ میں وفات پائی، اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

مرغی است خدنگ او عجب دیدی | مرغے کہ شکار او ہمہ جانا
دادہ پر خویش کرگسش ہدیہ | تا بچہ اش را برد بہ مہمانا

خاندانِ طاہریہ کے اخیر فرماں روا محمد بن طاہر کو ۲۵۹ھ میں یعقوب صفار نے گرفتار کر لیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا،

---

[1] چہار مقالہ ص ۲۷ [2] یہ تمام حالات اور اشعار مجمع الفصحا سے ماخوذ ہیں،

خاندان صفاریہ کا عہد

یعقوب صفار ذات کا ٹھٹیرا تھا لیکن شاہانہ دل و دماغ رکھتا تھا، یہاں تک کہ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں اُس نے علم بغاوت بلند کیا اور خراسان و فارس پر قابض ہو گیا، ۲۶۵ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بھائی عمرو بن لیث اور اس کے بعد اس کا پوتا طاہر بن محمد چند روز حکمراں رہ کر ۲۹۰ھ میں گرفتار ہوا، اور اس سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا، اس چند روزہ خاندان نے بھی متعدد شعرا پیدا کئے جن میں سے ابو سلیک گرگانی زیادہ ممتاز ہے، منوچہری دامغانی نے اسکو قدماء شعرا میں شمار کیا ہی، مجمع الفصحا میں اسکے یہ شعر نقل کئے ہیں، ؎

اے بلب قاضی و بہ مژگاں دزد	بہ مژہ دل ز من بدزدیدی
اے شگفتا کہ دیدہ دزدی و مزد	مزد خواہی کہ دل ز من بُردی

شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد اسی زمانہ میں ہوئی، یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جاکر گرا، بچہ کی زبان سے بیساختہ یہ مصرع نکلا ع "غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو، یعقوب بھی موجود تھا، اس کو بچہ کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا، لیکن چونکہ اُس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے، شعرا کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے، انھوں نے کہا ہزج ہے، پھر تین مصرع اور لگا کر رباعی کر دیا اور دوبیتی نام رکھا، مدت تک یہی نام رہا، پھر دوبیتی کے بجائے رباعی کہنے لگے[1]

[1] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی،

لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی دو بیتی کہتے ہیں، جس سے اہلِ عرب کی دیانت کا اندازہ ہو سکتا ہے،

خاندانِ سامانیہ

خاندان سامانیہ

اس وقت تک جو کچھ ہوا وہ شاعری کی ابجد تھی، لیکن خاندانِ سامانیہ نے دفعتاً زمین کو آسمان بنا دیا، رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے، اسی دربار کا دست پرورد تھا، شاہنامہ جو عجم کا صحیفۂ آسمانی ہے اس کا عنصر اسی عہد میں تیار ہوا، اس خاندان کا سلسلۂ نسب بہرام چوبین تک پہنچتا ہے، اس لئے اس خاندان میں حکومت کا آنا جم و کسریٰ کا دوبارہ عالمِ وجود میں آنا تھا، عدل و انصاف، جاہ و جلال، شان و شوکت، تربیتِ علم و فن کسی بات میں وہ اپنے اسلاف سے کم نہ تھا،

اس سلسلہ کے قائم ہونے کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ مامون الرشید کی جہاں اور شاہانہ فیاضیاں تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ قدیم خاندانوں کی تربیت کا خیال رکھتا تھا جس زمانہ میں وہ مرو میں تھا، اس سلسلہ کا مورثِ اول اسد بن سامان دربار میں پہنچا، اور مامون نے اس کو پایۂ قرب میں جگہ دی، جب مرو سے بغداد روانہ ہوا تو وہاں کے گورنر کو تاکید کرتا آیا کہ اسد کی اولاد کو معزز عہدے دیئے جائیں، اسد کے چار فرزند تھے، نوح، احمد، یحییٰ، الیاس، چنانچہ وہ سمرقند، فرغانہ، بشناس، ہرات کے گورنر مقرر کئے گئے، نوح کی وفات کے بعد اس کا بیٹا احمد سمرقند کا حاکم مقرر ہوا،

لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے نصر کو اپنا قائم مقام کرکے خود گوشہ نشین ہوگیا، ۲۶۱ھ میں خلیفہ معتضد باللہ نے نصر کو ماوراء النہر کی حکومت دی، اس نے اپنی طرف سے اسمٰعیل کو بخارا کا حاکم مقرر کیا، چند روز کے بعد دراندازوں نے دونوں بھائیوں کو باہم لڑا دیا، یہاں تک کہ نصر میدانِ جنگ میں گرفتار ہوکر اسمٰعیل کے دربار میں آیا، لیکن اسمٰعیل نے حوصلہ شاہانہ سے کام لیا، اور بھائی کو قید سے آزاد کرکے تخت پر بٹھایا، آپ دست بستہ اُس کے سامنے کھڑے ہوکر آدابِ دست بوس کی رسمیں ادا کیں اور عرض کیا کہ میں وہی آپکا ماتحت صوبہ دار ہوں، نصر نے ۲۷۹ھ میں انتقال کیا، اور سمرقند کا صوبہ بھی اسمٰعیل کے ہاتھ آگیا،

سلسلۂ سامانیہ کی مستقل حکومت اسی تاریخ سے شروع ہوتی ہو، چنانچہ اس سلسلہ کا پہلا فرمانروا یہی اسمٰعیل تھا، یہ خاندان ایک سو تیس برس تک قائم رہا، اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ میں وفات پائی، اسمٰعیل کے بعد احمد بن اسمٰعیل اور اس کے بعد نصر بن احمد تخت نشین ہوا اور یہی وہ تاجدار ہے جس کے دربار کا ملک الشعراء رودکی تھا، جو فارسی شاعری کا بانی اوّل کہا جاتا ہو، وہ نہایت فیّاض، عادل اور قدردانِ علم وفن تھا، تیس برس کی حکمرانی کے بعد ۳۳۱ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا نوح فرماں روا ہوا، وہ بھی باپ کی طرح مربیِ علم وفن تھا، فلسفہ وحکمت اور دیگر علوم وفنون کا جو کتبخانہ اس نے مرتب کیا تھا، اسکی نسبت علامہ ابن خلکان نے بوعلی سینا کے حالات کے ذیل میں لکھا ہے،

كانت[1] عديمة المثل فيها من كل	یہ کتبخانہ بے نظیر تھا، اسمیں متداول اور مشہور
فن من الكتب المشهورة بايدي	کتابوں کے علاوہ وہ کتابیں تھیں جو اس کتبخانہ
الناس وغيرهم ما لا يوجد في	کے سوا، اور کہیں نصیب نہیں ہو سکتی تھیں اور
سواها ولا سمع باسمه فضلا عن معرفته	جنکا جاننا تو درکنار کسی نے انکا نام بھی نہیں سنا تھا،

فلسفہ یونان کی بے شمار تصنیفات خلفائے عباسیہ کی بدولت عربی میں ترجمہ ہو چکی تھیں لیکن اکثر ترجمے نامفہوم اور مشتبہ تھے اور جن کتابوں کے متعدد ترجمے ہوئے تھے وہ باہم مختلف تھے نوح بن نصر نے حکیم ابو نصر فارابی کو بلاکر فرمایش کی کہ ان تمام تراجم کو سامنے رکھکر ایک صحیح اور جامع ترجمہ تیار کردے، چنانچہ فارابی نے اس فرمایش کی تعمیل کی اور اس کتاب کا نام تعلیم الثانی رکھا، اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہئے کہ حکمائے اسلام میں فارابی نے معلم ثانی کا جو لقب حاصل کیا ہے وہ اسی کتاب کی بدولت تھا، افسوس ہے کہ یہ کتب خانہ جل گیا، اور چونکہ اس کتاب کا اصل مسودہ فارابی کے ہاتھ کا ضائع ہو گیا، اس لئے آج یہ بے نظیر کتاب ناپید ہے[2]،

---

[1] اس کتب خانہ کا حال خود بو علی سینا کی زبانی طبقات الاطبا میں نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ بہت بڑا کتبخانہ تھا، ہر علم و فن کے لئے الگ الگ مکان تھے اور اسمیں صرف اسی فن کی کتابیں تھیں کتابیں اوپر تلے بہ ترتیب صندوق میں رکھی ہوئی تھیں، بو علی سینا کا بیان ہے کہ میں نے قدما کی کتابوں کی فہرست دیکھی اور اپنی پسند کے موافق کتابیں نکلوا کر دیکھیں، انمیں اکثر ایسی کتابیں تھیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہ تھے اور خود میں نے بھی کبھی انکو نہیں دیکھا تھا [2] یہ واقعہ اکثر کتابوں میں ہے کشف الظنون (باب الحکمۃ) میں اس تمام واقعہ کو منصور بن نوح کے عہد سے منسوب کیا ہے، اور مورخوں کو بھی یہ دھوکا ہوا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے، اسلئے کہ فارابی نے سنہ ۳۳۹ھ میں انتقال کیا ہے، اور منصور سنہ ۳۵۰ھ میں تخت نشین ہوا ہے،

نوح نے ۳۴۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد عبد الملک وہ عبد الملک کے بعد منصور بن نوح تخت نشین ہوا، اس کے دربار کا وزیر ابو علی بن محمد تھا، جس نے تاریخ طبری کا عربی زبان سے فارسی میں ترجمہ کیا، منصور نے ۳۶۵ھ میں وفات پائی، اسکے بعد نوح بن منصور ثانی فرماں روا ہوا، دقیقی مشہور شاعر اسی کے دربار کا شاعر تھا، نوح کے بعد منصور بن نوح، اسکے بعد عبد الملک اور اس کے بعد اسمٰعیل بن عبد الملک تخت نشین ہوا اور اسی پر اس خاندان کا خاتمہ ہوا، جس کی تاریخ ۳۹۵ھ ہے،

شعرائے سامانیہ

سلسلۂ سامانیہ سے پہلے جو خاندان گذرے وہ طاہریہ اور صفاریہ تھے، طاہریہ عربی النسل خاندان تھا، اس لئے فارسی شاعری کو اس کے زمانہ میں عروج نہیں ہو سکتا تھا، صفاریہ نو دولت اور کم اصل تھے، اور ان کی حیثیت ایک فتنہ جو باغی سے بڑھکر نہ تھی، لیکن سامانی خاندان نسلِ کیان کا یادگار تھا، انکی سلطنت نے ایک سو دس برس کی عمر پائی، قدردان علم و فن ہونے کے ساتھ وہ خود بھی صاحبِ کمال اور سخن سنج تھے، وہ دیکھتے تھے، کہ اہلِ عجم اپنے لٹریچر اور ملکی خصوصیات سے بالکل الگ ہوتے جاتے ہیں، یہانتک کہ انکی شاعرانہ قوتیں بالکل ایک غیر زبان (عربی) پر صرف ہو رہی ہیں، خراسان و بخارا میں سینکڑوں ہزاروں شعرا موجود ہیں، جو نسلاً عجم ہیں، لیکن دار الخلافۃ بغداد کے اثر سے جو کچھ کہتے ہیں عربی میں کہتے ہیں، ان اسباب سے اس خاندان نے اپنی قومی اور ملکی زبان کی ترقی پر شاہانہ توجہ کی، شعرا کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں، خاص خاص مضامین پر اشعار لکھوائے، کلیلہ دمنہ

سنسکرت سے اولاً فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی، لیکن جب عبداللہ بن المقفع نے اس ترجمہ کو عربی میں منتقل کیا تو فارسی نسخہ بالکل گمنام ہوگیا، نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کردے، عجم کی تاریخ اب تک نامرتب اور پریشان تھی، اس لئے دقیقی کو اس کام پر مامور کیا، چنانچہ اس نے ہزار شعر لکھے، اور یہ شاہنامہ کا پہلا سنگ بنیاد تھا' تفصیل ان واقعات کی آگے آتی ہو،

خاندان سامانیہ کے شعراء

شعرائے سامانیہ کی تعداد اگرچہ سینکڑوں تک پہنچتی ہو، لیکن عروضی سمرقندی وغیرہ نے جن لوگوں کا نام خصوصیت سے لیا ہو وہ یہ ہیں، ابوالعباس، ابوالمثل، اسحاق جوئباری، ابوالحسن، جبازی نیشاپوری، ابوالحسن کسائی، شہید بلخی، ابوالموئید، ابوعبداللہ فرالاوی، رودکی، دقیقی، رابعہ فرواری، ابوذر معمر جرجانی، ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری، عمارہ مروزی، طخاری، مرادی،

یہ متعین کرنا مشکل ہو کہ اس دور کا پہلا شاعر کون ہے؟ لیکن جہانتک قرائن سے پتہ چلتا ہے ابوعبداللہ فرالاوی، مرادی، شہید، ابوشکور بلخی، اس قافلہ کے پیشرو ہیں، رودکی کا ایک شعر ہے[۱]،

شاعر شہید و شہرہ فرالاوی ۔۔۔ ویں دیگراں بہ جملہ ہمہ راوی

یعنی شاعر اصل میں شہید ہے لیکن فرالاوی مشہور زیادہ ہوگیا ہو، باقی اور شعرا انہی دونوں کے رواۃ ہیں، رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی لکھا ہے، چنانچہ کہتا ہو،

---

[۱] مجمع الفصحا، تذکرہ ابوعبداللہ فرالاوی،

کاروانِ شہید رفت از پیش | وان مارفتہ گیر دمی اندیش،
از شمار دو چشم یک تن کم | وز شمار خرد ہزاران بیش،

رابعہ

اس دور کی یہ خصوصیت یادگار ہے کہ شعر و شاعری کا مذاق عورتوں میں بھی پھیل گیا تھا، رابعہ فرواری بلخی جو رودکی کی ہمعصر تھی، اعلیٰ درجہ کی شاعر تھی، اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا، لیکن رابعہ عجم میں پیدا ہوئی اور اس وجہ سے عربی فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی، نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی، بکتاش نام ایک غلام سے اس کو عشق تھا، لیکن پھر مجازی سے گزر کر عشق حقیقی کی نوبت پہنچی، چنانچہ اس کا شمار صوفیہ میں کیا جاتا ہے، تاہم چونکہ عورت کا کسی اجنبی مرد سے محبت کرنا اسلامی جماعت میں معیوب تھا، اس لئے لوگوں نے اسکو قتل کر ڈالا، مجمع الفصحا میں اس کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں،

دعوتِ من بر تو آں شد کا یزدت عاشق کناد | بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن
تا بدانی درد عشق و داغ ہجر و غم کشی | چوں بہ ہجر اندر بپیچی پس بدانی قدر من

رودکی

اس دور کا مشہور شاعر ہے، تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا،

سامانیوں کے دور میں سینکڑوں شعرا تھے جن میں سے بعض کا تذکرہ آگے آئیگا، لیکن

آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے، شریف گرگانی نے سچ کہا:

اندان چندیں نعیم جاودانی ۔۔۔ کہ ماند از آلِ ساسان وآلِ سامان

ثنائے رودکی ماندست مدحش ۔۔۔ نوائے بار بد ماندست دستان

رودکی کا اصلی نام محمد یا جعفر ہے، رودک، نخشب کے ضلع میں جس کو نسف بھی کہتے ہیں ایک گاؤں کا نام ہے، رودکی اسی گاؤں کی طرف منسوب ہے، بعضوں کا بیان ہے کہ رودکی کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ رود (ایک باجے کا نام ہے) اچھا بجاتا تھا،

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا[1] آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا[1]، پھر علم قرأت کی تکمیل کی، اسی سن میں شعر کہنا شروع کر دیا، شاعری کے مشغلہ کے ساتھ تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے، خوش قسمتی سے نہایت خوش آواز اور طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی، سلاطین و امراء کے دربار میں ایک بڑی خدمت ندیمی کی تھی، تقرب واثر کے لحاظ سے ندیم کا رتبہ وزرا سے بھی بالاتر ہوتا تھا" اس عہدہ کے لئے بذلہ سنجی، لطیفہ طبعی، حاضر جوابی، ظرافت، وسعتِ معلومات ضروری شرطیں تھیں، رودکی میں یہ سب شرطیں جمع تھیں، اس بنا پر نصر بن احمد سامانی کے دربار میں اسکو رسائی حاصل ہوئی، نصر نے اسکی تربیت پر خاص توجہ مبذول کی، تمام اربابِ تذکرہ کا بیان ہے کہ رودکی کو اس قدر جاہ و دولت حاصل ہوئی کہ دربار کے بڑے بڑے امرا کو بھی نصیب نہ ہوئی، جب اسکی سواری نکلتی تو دو سو زریں کمر غلام، رکاب کے ساتھ ساتھ

---

[1] بہارستان جامی،

چلتے، سفر میں اس کا اسباب چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا،

یہ عموماً مسلّم ہے کہ فارسی شاعری عربی کے نمونہ پر قائم ہوئی تھی، لیکن اس زمانہ میں عربی شاعری واقعیت اور حقیقت سے دور ہو کر، ستایش گری اور مداحی کے سوا اور کسی کام کی نہیں رہی تھی، متنبی، ابو تمام، بحتری جو اس دور کے پیغمبرانِ سخن ہیں، انکا تمام تر کارنامہ یہی خوشامد اور ثنا گستری تھا، خلفار اور امرار شاعری کو صرف تفریح طبع کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے، لیکن خاندانِ سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لئے، چنانچہ رودکی کو کلیلہ دمنہ کے نظم کی خدمت دی، اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم عطا کئے، عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش ‌ ‌ ‌ ‌ عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

رودکی کی شاعری کا عام انداز

رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی، پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے، عرب جاہلیہ کی شاعری کا اصلی جوہر یہ تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیتے تھے، فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا اور کسی کام کی نہ تھی، یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہیں آیا، لیکن رودکی اس عام اعتراض سے مستثنیٰ ہے،

نصر بن سامانی نے ایک دفعہ ہرات کا سفر کیا، اور بادغیس میں جو ہرات کا مشہور نزہت گاہ ہے، پڑاؤ ڈالا، بہار کے دن تھے، اور تمام دشت و صحرا چمن زار بنگیا تھا، نصر ان دلفریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گذر گئی، جاڑے آئے تو میووں کی بہتات ہوئی، ان اطراف میں ایک ۱۲۰ سو بیس قسم کے انگور ہوتے ہیں جنمیں ترنیاں اور کلنجدی نہایت خوش مزہ

شاداب اور نرم ہوتے ہیں، نصر صحرا سے اُٹھ کر آبادی میں آیا اور دروازہ میں جو ایک مشہور مقام ہے قیام کیا، یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے، ہر طرف عالیشان قصر وایوان، اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائیں باغ ہوتا تھا، اسی زمانہ میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی، نصر نے جاڑے بھی یہیں گذارے، ہر دفعہ قصد کرتا تھا کہ اب کی بہار گذرنے پر روانہ ہو جاؤنگا، لیکن جب ایک موسم گذر جاتا تھا تو دوسرا زنجیر پا بنجاتا تھا، اسی طرح پورے چار برس گذر گئے، امراء اور فوج کے لوگ تنگ آگئے، تاہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے، آخر رودکی کے پاس گئے اور پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں کہ بادشاہ یہاں سے بخارا کو واپس جائے، اگلے دن رودکی دربار میں گیا، نصر شراب پی رہا تھا، رودکی نے ساز کے ساتھ عشاق کی دُھن میں یہ اشعار گائے،

بوے جوے مولیاں آید ہمے	یاد یارِ مہرباں آید ہمے
ریگ آموی و درشتیہاے او (یعنی دریاے جیحوں)	زیر پایم پرنیاں آید ہمے
آبِ جیحوں با ہمہ پہنا دری	خنگ مارا تامیاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی	شاہ سویت میہماں آید ہمے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں	سرو سوے بوستاں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا آسماں،	ماہ سوے آسماں آید ہمے،

نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اُسی وقت سوار ہو کر بگٹٹ

دوڑتا ہوا پوری ایک منزل پر جاکر دم لیا، سمرقندی نے یہ واقعہ لکھکر حیرت ظاہر کی ہے کہ "یہ ایک سیدھی سادھی نظم ہے، نہ کوئی صنعت ہے نہ مضمون بندی ہے، اس کا اس قدر اثر کیونکر ہو سکتا تھا" دولت شاہ کے زمانہ میں شاعری کی اصلی اور فطری حالت بدل چکی تھی، اس لئے لوگوں کو واقعیت اور اظہارِ فطرت میں مزہ نہیں آتا تھا، لیکن جب تک قوم میں صحیح مذاق باقی رہا شعرا ان اشعار پر سر دھنتے تھے، عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر تھا چار مقالہ میں لکھتا ہے؛

"ہنوز ایں قصیدہ را کسے جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ ازیں مضائق بیروں روند"

سلطان سنجر کے ملک الشعرا امیر معزی سے فرمایش کی گئی تھی کہ اس قصیدہ کا جواب لکھے، چنانچہ اُس نے جو قصیدہ لکھا اُس کا مطلع یہ ہے،

رستم[1] از مازندراں آید ہمے — زیں ملک از اصفہاں آید ہمے

(ممدوح کا نام)

امیر معزی مشہور اور کامل الفن شعرا میں سے ہے، لیکن رودکی کے کلام کے سامنے اسکے شعر کا جو رتبہ ہے، محتاجِ اظہار نہیں، رودکی نہایت پُرگو تھا، رشیدی سمرقندی[2] نے اسکے اشعار کی

---

[1] جس زمانہ میں میں علی گڈہ کالج میں پروفیسر تھا، آسمان جاہ (وزیر ریاست حیدرآباد دکن) علی گڈھ میں آئے سر سید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ سپاسنامہ کے بجائے کالج کی طرف سے قصیدہ پیش کیا جائیگا، وہ تم لکھدو میں نے ایک خاص مناسبت سے، اسی قصیدہ کو پیشِ نظر رکھا، ابتدا میں یہ تمہید تھی کہ لوگوں میں آسمان جاہ کی آمد کا چرچا ہے، پھر یہ اشعار تھے،

ہمچناں با شمیم گرم گفتگو، — قاصد از در ناگہاں آید ہمے
افگند شورِ مبارک باد و پس — ایں حدیثش بر زباں آید ہمے
آسماں جاہ از سوِ ملکِ دکن — جانبِ ہندوستاں آید ہمے

[2] مجمع الفصحا ذکر رودکی،

تعداد ایک لاکھ بتائی ہی، چنانچہ کہتا ہی،

شعراو را بشمردم سیزدہ رہ صد ہزار	ہم فزوں تر آید ار چوناں کہ باید بشمری
یعنی اس کے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھہرے	اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں گے

اقسامِ سخن میں، رودکی کے ہاں قصیدہ، رُباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ، سب کچھ موجود ہے مثنوی کا کوئی نمونہ موجود نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلیلہ دمنہ جو اُس نے لکھی ہی مثنوی ہی ہو گی، کیونکہ مسلسل واقعات مثنوی کے سوا اور کسی طرح ادا نہیں ہو سکتے،

رودکی کی شاعری کی وسعت،

مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے، یعنی واقعہ نگاری خیال بندی، موعظت و نصیحت، عشق و محبت، مدح و ثنا، صنائع و بدائع، سب چیزیں پائی جاتی ہیں، اور درجۂ کمال پر پائی جاتی ہیں، ہم مختصراً ہر ایک کا نمونہ پیش کرتے ہیں،

اخلاق و موعظت اخلاق و موعظت میں حسنِ ادا کے ساتھ، اس نے دقیق نکتے بھی بیان کئے ہیں، مثلاً اس کو یہ کہنا ہے کہ تم کو اوروں کی خوشحالی پر رشک اور حسد نہیں کرنا چاہئے، اسکو وہ اس طرح دلنشین کرتا ہے،

زمانہ پندے آزادہ وار داد مرا	زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار	بسا کسا کہ بروز تو آرزو مند است

یعنی جس طرح تم اوروں کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہو، اسی طرح دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہاری حالت پر رشک کرتے ہیں، اسلئے تم کو شکایت کا کوئی موقع نہیں،

اکثر آدمی لوگوں کی بخالت کی شکایت کرتے ہیں، لیکن ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ کسی

شخص کی بخالت اور سخاوت پر توجہ کرنا گدا طبعی اور طماعی کی دلیل ہی، رودکی اس نکتہ کو یوں ادا کرتا ہے،

تا کے گوئی کہ اہل گیتی
در ہستی و نیستی لیئمند،

چوں تو طمع از جہاں بریدی
دانی کہ ہمہ جہاں کریمند

زمانہ کی بے ثباتی کو اس طرح ادا کرتا ہے،

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز
نہ بہ آخر بمرد باید باز

ہم بہ چنبر گزار خواہد بود
این رسن را اگرچہ ہست دراز

خواہی اندر عناد محنت زی
خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز

خواہی اندک تر از جہاں بپذیر
خواہی از رے بگیر تا بہ حجاز

ایں ہمہ بود و باد تو خواب ست،
خواب را حکم نے مگر بہ مجاز

ایں ہمہ روز مرگ اگر بینی
نشناسی ز یکدگر شاں باز

اپیکورس اور عمر خیام کے فلسفہ کو غالباً فارسی میں اوّل اسی نے روشناس کیا ہی چنانچہ کہتا ہے،

شاد زی، با سیاہ چشماں شاد
کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

ز آمدہ شادماں نہ باید بود
وز گذشتہ نکرد باید یاد

نیک بخت آں کسے کہ داد و بخورد
شور بخت آں کہ او نخورد و نہ داد

باد، و ابر است ایں جہاں افسوس
بادہ پیش آر ہرچہ بادا باد

خواجہ حافظؒ کا سارا دیوان اسی متن کی شرح ہے،

روی به محراب نهادن چه سود	دل به بخارا و بتان طراز
ایزد تا وسوسۂ عاشقے	از تو پذیرد، نه پذیرد نماز

واقعہ نگاری یعنی کسی واقعہ یا حالت کی تصویر کھینچنا شاعری کا ایک عنصر ہے، رودکی کے کلام میں یہ عنصر، ہر جگہ نظر آتا ہے، ایک قصیدہ میں اُس نے جوانی اور بڑھاپے کی کیفیت بیان کی ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

مرا بسود و فرو ریخت هر چه دندان بود	نه بود دندان، لا بل، چراغ خندان بود
یکے نماند کنوں، بل همه بسود و بریخت	چه نحس بود همانا که نحس کیوان بود
نه نحس کیوان بود، و نه روزگار دراز	چه بود؟ راست بگویم، قضائے یزدان بود
همی نه دانی اے ماہروے غالیه موے	که حالِ بنده ازیں پیش بر چه سامان بود
به زلف چوگاں نازش همی کنی تو به ده	ندیدی او را آنگه که زلف چوگاں بود
شد آں زمانه که رویش بسان دیبا بود	شد آں زمانه که مویش بسان قطران بود
شد آں زمانه که او شاد بود و خرم بود	نشاط او به فزوں بود و غم بنقصاں بود
همیشه دستش زی زلفگاں خوشبو بود	همیشه گوشش زی مردم سخنداں بود
همیشه شاد ندانستے که غم چه بود	دلم نشاط طرب را فراخ میداں بود
عیال نه، زن و فرزند نه، مئونت نه	ازیں همه تنم آسوده بود و آساں بود
همی خرید و همی ریخت بے شمار درم	به شهر هر چه همی ترک نار پستاں[1] بود

[1] غنیمت ہے کہ ایرانی شاعر ہو کر مرد کے بجائے عورت کا نام لیتا ہی،

بسا کنیزک نیکو کہ میل داشت بدو ‏ ‏ بشب بزیارت او نزد او بہ نہاں بود

شد آں زمانہ کہ شعر و راجہاں بنوشت ‏ ‏ شد آں زمانہ کہ او شاعرِ خراساں بود

تو رودکی را اے ماہرو کنوں بینی ‏ ‏ بدان زمانہ ندیدی کہ در خراساں بود

بداں زمانہ ندیدی کہ در چمن رفتے ‏ ‏ سرود گویان گوئی ہزار دستاں بود

کہ ابزرگی و نعمت، ازاین و آن بودے ‏ ‏ در ابزرگی و نعمت زآلِ ساماں بود

بداد میر خراسانش چل ہزار درم ‏ ‏ ازو فزونی یک پنج، میر ماکاں بود

کنوں زمانہ دگر گشت، و من دگر گشتم ‏ ‏ عصا بیار کہ وقتِ عصا و انبان بود

مدحیہ مدحیہ شاعری کے جو نمونے پائے جاتے ہیں، اعلیٰ درجہ کے ہیں، اور اُن میں خیال آفرینی بھی پائی جاتی ہے،

شاہے کہ بروزِ رزم از رادی ‏ ‏ زرّیں نہد بہ تیر در پیکاں،

تا کشتۂ او ازاں کفن سازد ‏ ‏ تا خستۂ او، ازاں کند درماں

یعنی "بادشاہ اس درجہ کا سخی ہے کہ لڑائی میں تیر جو استعمال کرتا ہے، اُن کی پیکان سونے کی ہوتی ہیں، جس سے یہ مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص زخمی ہو تو پیکاں کو بیچ کر اپنا علاج کر سکے، اور مر جائے تو تجہیز و تکفین کے کام آئے"

مرثیہ مرثیے متعدد ہیں، اور سب میں مرثیہ کی خالص شان پائی جاتی ہے، ایک مرثیہ میں جو وزیر اعظم کے بیٹے کی وفات پر لکھا ہے، حکیمانہ انداز میں وزیر کو صبر کی تلقین کی ہے،

اے آنکہ غمگینی و سزا واری	واندر نہاں سرشک ہمی باری
اے وہ کہ غمزدہ ہے اور غمزدہ ہونا زیبا بھی ہے	اے وہ کہ چپکے چپکے آنسو بہاتا ہے
رفت آنکہ رفت، آمد آنکہ آمد	بود آنچہ بود خیرہ چہ غم داری
جو گیا، گیا، جو آیا، آیا،	جو ہونا تھا ہوا، اب فضول کیوں غم کرتے ہو
ہموار کرد خواہی گیتی را؟	گیتی است کے پذیرد ہمواری
کیا تم زمانہ کو ہموار کرنا چاہتے ہو	یہ زمانہ ہے، بھلا وہ کب ہموار کر سکتا ہے
مستی مکن، نشنود او مستی	زاری مکن کہ نشنود او زاری
جوش ظاہر نہ کرو، وہ جوش کا لحاظ نہیں کرتا	فریاد نہ کرو، وہ فریاد نہیں سنتا
شو تا قیامت زاری کن	کے رفتہ را بہ زاری باز آری
اچھا جاؤ قیامت تک روتے رہو	لیکن جو شخص چلا گیا، کیا وہ رونے سے واپس آجائیگا

شہید بلخی اور ہراوی جو اس کے زمانہ کے مشہور شاعر تھے ان کا مرثیہ بھی لکھا ہے جو مجمع الفصحا وغیرہ میں منقول ہے،

غزل غزل نے اس وقت تک مستقل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، قصائد کی ابتدا میں جو تشبیب کرتے تھے یہی اُس زمانہ کی غزل تھی، اُس کا نمونہ یہ ہے،

اے جان من از آرزوی تو بہ زماں	بنماے یکے روے بہ بختاے برین جاں
دشوار نمائی رخ و دشوار دہی بوس	آساں بربائی دل و آساں ببری جاں
نزدیک من آسانی تو باشد دشوار	نزدیک تو دشواری من باشد آساں

مشوش است دلم از کرشمۂ سلمے　　چنانکه خاطر مجنوں ز طرۂ لیلے

چو گلشکر دہیم، درد دل شود تسکیں　　جو ترش روے شوی وارہانی از صفرا

بیردہ نرگس تو آب جادوے بابل　　کشادہ غنچہ تو باب معجز عیسے

والۂ داغستانی نے رودکی کی ایک غزل نقل کی ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را　　شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را

لیکن اس زمانہ کا یہ انداز نہیں، ہی، اس کے علاوہ اس غزل کے مقطع میں تخلص بھی مذکور ہے، حالانکہ اُس زمانہ تک غزلوں میں تخلص نہیں لاتے تھے،

رودکی کے ان اشعار کا جو رتبہ ہے ظاہر ہے تاہم عنصری کہتا ہے،

غزل رودکی وار نیکو بود　　غزلہاے من رودکی وار نیست

اِس سے ظاہر ہوتا ہے عنصری رودکی کو غزل گوئی میں اُستاد مانتا تھا، اسلئے یا تو ماننا چاہئے کہ رودکی کی عمدہ غزلیں جاتی رہیں، یا یہ کہ عنصری غزل گوئی میں رودکی سے بھی کم تھا،

قصیدہ | قصیدہ کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا، آج تک قائم ہے، یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ، پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز، جود و سخا، عدل و انصاف، شجاعت و دلیری کا ذکر، پھر دعائیہ، صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جسکو ترصیع کہتے ہیں، یعنی دونوں مصرعوں میں ہموزن الفاظ لاتے ہیں، مثلاً

رما در اشر رقہر او کند شنجرف　(عرفی)　جماد را اثر لطف او کند شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے اور چھٹی صدی تک تمام شعرائ کا یہ عام انداز رہا،

قصیدہ میں اگرچہ صرف مداحی ہی مداحی ہوتی ہے، لیکن رودکی نے جا بجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں،

بہار

از بنفشہ مرزہا گستردہ دیباہا بہ چین — وز شگوفہ شاخہا بربستہ دُرِ شاہوار

زمین

باہوائے اوست گفتی ہر چہ گفتی در نسیم — بر زمینِ اوست گفتی ہر چہ در عالم بہار

از میانِ جوئے آں آبے رواں ہمچو گلاب — شاخہائے گل شگفتہ بر کنارِ جوئبار

بود ہر جا بہر نزہت گاہ بار و نقل و مل — گلستاں در گلستان و میوہ اندر میوہ زار

خزاں

کوہ دیگر کوہ سیمیں گشت و زریں شد چمن — آب دیگر بارہ روشن گشت و تیرہ شد ہوا

برف کی وجہ سے — زرد پتوں کی وجہ سے

گشت خامش فاختہ، تا شد چمن پرداختہ — گشت بلبل بے نوا تا بوستاں شد بے نوا

خالی — آواز — بے سامان

نار چوں برحقۂ زریں نگیں ہائے عقیق — سیب چوں بر چہرۂ سیمیں نشانہائے بکا

انار

باد سرو آمد چو آہِ عاشقاں ہنگام صبح — بانگِ زاغ آمد چو از معشوق پیغام جفا

معرکہ جنگ

بدانگہے کہ دو لشکر بروئے یکدیگر — گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں

ز گرد اسپاں تیرہ شود رخ خورشید — ز بانگِ مرداں خیرہ شود دل کیواں

یکے کشیدہ سنان و یکے کشادہ حسام — یکے کشادہ کمند و یکے کشیدہ کماں

قصیدہ کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے، یعنی تشبیب، کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے، یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و

ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے، رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں، مثلاً ایک قصیدہ میں خزاں کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہی،

بادِ خوارزمی کنارِ باغ پُر دینار کرد چوں کنارِ زائراں را کف دوست بادشا

یا مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہی،

یارِ من گفتا بہشت است اے شگفت !!! ایں باغ نیست
گفتمش ایں باغیست خرم چوں بہشتِ کردگار
آں بہشت ناپدید است، ایں بہشت استے عیاں
ایں بہ نقد است آں بہ نسیہ آں نہاں ایں آشکار
آں مکافاتِ نماز است، ایں مکافاتِ مدیح
آں عطاے کردگار است، ایں عطاے شہریار

یعنی معشوق نے باغ کو دیکھکر کہا کہ یہ تو بہشت ہے میں نے کہا بہشت نہیں باغ ہی، لیکن خدا کی بہشت کے ہم پلہ ہے، فرق یہ ہے کہ خدا کی بہشت کا پتہ نہیں اور یہ علانیہ موجود ہے، یہ نقد ہے وہ ادھار، یہ ظاہر ہے وہ مخفی، وہ نماز پڑھنے سے ہاتھ آتی ہے اور یہ مدح کرنے سے، وہ خدا کا عطیہ ہے اور یہ بادشاہ کا،

بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہی جس کی تقلید کسی نے نہیں کی، مثلاً ایک قصیدہ ۳۳ تینتیس شعروں کا کہا ہے جسمیں صرف مطلع ہی ہیں، پہلا مطلع یہ ہے،

ندانی درد ہجرا ے بت مراز آں نار گردانی دگر زارم نگردانی بہ داغِ ہجر گردانی،

ہجو یا شکایت | ہجو فارسی شاعری کے چہرہ کا نہایت بدنما داغ ہے، لیکن رودکی کی ہجو میں بھی متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے،

زہے سوار وجہاں و تونگر از رہ دور | بخدمت آید نیکو سگال نیک اندیش
پسند آید مر خواجہ را پس از دہ سال | کہ باز گردد پیر و پیادہ و دل ریش

ممدوح سے کہتا ہے کہ کیا یہ مناسب ہے کہ جو لوگ آپ کے دربار میں جوان، دولتمند اور سواریوں پر آئیں، وہ اس قدر آپ کے ہاں اُمیدواری میں پڑے جھولا کریں، کہ جب واپس جانے لگیں تو دولتمند غریب اور سوار پیادہ اور جوان بوڑھا ہو کر جائے،

جدّتِ مضامین | عام قاعدہ یہ ہے کہ ابتدائے شاعری میں مضمون بندی بالکل نہیں ہوتی، لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ رودکی نے کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے، مثلاً،

گھوڑے کی تعریف
آفتابیکہ زجا یک قدمی | برسرِ ذرہ نماید جولاں

شراب کی تعریف
رودکی چنگ برگرفت و نواخت | بادہ انداز، کو سرود انداخت
آں عقیقین مے کہ ہر کہ بدید | از عقیق گداختہ نشناخت

تشبیہ
ہر دو یک گوہر اند لیک بطبع | ایں بفسیرد، واں دیگر بگداخت
نا بسودہ دو دست رنگیں کرد | نا چشیدہ بہ تارک اندر تاخت

یعنی شراب اور عقیق دونوں ایک ہی چیز ہیں، فرق یہ ہے کہ ایک سیال عقیق ہے اور دوسری منجمد، شراب کے رنگ، اور نشہ کی یہ کیفیت ہے کہ بے چھوئے

ہوئے ہاتھ رنگین ہوجاتے ہیں، اور بے چکھے ہوئے دماغ میں دوڑ جاتی ہی،

بنفشہاے طرب خیل خیل سر برکرد چو آتشے کہ بگوگرد بر دوید کبود،

بیار وہاں بدہ آں آفتاب کش بخوری زلب فروشود و از دہاں برآرد دود

یعنی بنفشہ دستہ دستہ اگ رہاہے، جس طرح گندھک سے جلانے کے وقت، رنگ کا شعلہ

اٹھتا ہی، اب وہ آفتاب لاؤ، یعنی شراب، کہ ادھر ہونٹوں سے اترے اور اُدھر منہ سے دھواں اٹھنے لگے،

تیر او مانندۂ روزی کہ زی مردم رسد تیر دشمن باز گردد سوے دشمن چوں صدا

یعنی ممدوح کا تیر، اس طرح نشانے پر لگتا ہی جس طرح انسان کا مقدر، اور دشمن کا تیر

اس طرح دشمن ہی کی طرف پلٹ جاتا ہی جس طرح آواز،

موسم بہار

ہر انچہ بست میان ارم بہم شداد ہر انچہ کرد بزیر زمیں نہاں قارون

سرشک ابر پراگندہ کرد در بستاں نسیم باد پدیدار کرد در ہامون

یعنی باغ ارم میں شداد نے جو چیزیں فراہم کی تھیں، بادل کے آنسوؤں نے وہ سب

باغ میں پھیلا دیں، اور قارون نے زمین کے اندر جو چیزیں چھپا رکھی تھیں، نسیم نے

وہ سب میدان میں کھول کر دکھا دیں،

مہ نیساں شبیخوں کرد، اکنوں بر مہ کانون،

کہ گردوں گشت از وُپر گرد، و صحرا گشت از وُپر خوں

اگر خواہی نشانِ خوں نگہ کن لالہ بر صحرا

اگر خواہی نشانِ گرد بنگر ابر بر گردوں۔

یعنی بہار کے مہینہ نے خزاں کے مہینہ پر شبخون مارا، جس کی وجہ سے صحرا پُر خوں ہو گیا، اور آسمان میں گرد بھر گئی، صحرا میں جو لالہ نظر آتا ہے، یہ وہی خون ہی،

نگار ینا شنید ستم کہ گاہ محنت و محنت را
سہ پیراہن سلب بودہ ست یوسف را بہ عمر اندر

یکے از کید شد پر خوں دوم شد چاک از تہمت
سوم یعقوب را از بوے روشن کرد چشم تر

زخم مانند بداں اوّل، دلم ماند بداں دوم
نصیب من شود در وصل آں پیراہن دیگر

یعنی اے معشوق! میں نے سنا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے تین پیراہن تھے، ایک خون سے رنگین ہوا، دوسرا زلیخا نے چاک کیا، تیسرے نے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روشن کیں، میرا چہرہ پہلے پیراہن کے مشابہ ہے، اور میرا دل دوسرا پیراہن ہی، باقی تیسرا وہ خدا وصل میں نصیب کرے،

زلف ترا جیم کہ کرد، آں کہ او
خال ترا نقطۂ آں جیم کرد

از دہنِ تنگ تو گویا کسے
دانگکے ناز بدو نیم کرد

یعنی تیرا دہن ایسا چھوٹا ہے کہ معلوم ہوتا ہی کہ کسی نے انار کے دانہ کے دو حصے کر دیئے ہیں،

رباعیاں | رباعیاں معمولی ہیں، مجمع الفصحا میں ایک رُباعی نقل کی ہی،

چوں کار دلم ز زلف او ماند گرہ
در ہر رگِ جاں صد آرزو ماند گرہ

امید ز گریہ بود، افسوس افسوس
کانہم شبِ وصل در گلو ماند گرہ

لیکن یہ ہرگز رودکی کے زمانہ کا کلام نہیں ہو سکتا،

قبولیتِ عام اور اعتراف شعر | رودکی کے کمال شاعری کو تمام شعرا نے تسلیم کیا ہی،

خود اس کا معاصر اور ہم فن اور ہمپایہ شہید کہتا ہے،

بسخن ماند شعر شعرا، رودکی را سخنش تلو نباست

شاعراں راخہ واحسنت مدیح رودکی راخہ واحسنت ہجاست
بمعنی خواب

عنصری کہتا ہے،

غزل رودکی وار نیکو بود غزل ہاے من رودکی وار نیست

اگرچہ بکوشم بہ باریک وہم دریں پردہ اندر مرا بار نیست

معروف بلخی کہتا ہے،

از رودکی شنیدم سلطانِ شاعراں

دقیقی کہتا ہے،

کرا رودکی گفتہ باشد مدیح امام فنون و سخنور بود،

دقیقی مدیح آورد نزد او چو خرما بسوے ہجیور بود،

نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے رودکی کی شاعری پر اعتراض کیا تھا نظامی نے اس کے جواب میں لکھا ہے،

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی ایں طعن کردنِ تو از جہل و کودکی است

کانکس کہ شعر داند، داند کہ در جہاں صاحب قرآن شاعری استاد رودکی است

رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی، اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہی،

دقیقی

سلسلۂ سامانیہ کے ہر فرماں روا کا عہد اگرچہ بام ترقی کا ایک نیا پایہ ہے، لیکن نوح بن منصور کا زمانہ آخر المنازل ہے، یہ فخر اسی دور کو حاصل ہو کہ عجم کا سرمایۂ فخر وناز یعنی ''**شاہنامہ**''، جس کو ابن الاثیر قرآن العجم کہتا ہے، اس کا ابتدائی خاکہ اسی عہد میں قائم ہوا، اور اگر ایک اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا، تو سلطان محمود کے کارناموں کی فہرست شاہنامہ کے نام سے خالی رہجاتی،

سامانی خاندان ابتدا سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر، عام زبانوں پر چڑھ جائے، لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی، کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ شعر کے قالب میں آجائے، نوح بن منصور جب ۳۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، تو پایہ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعراء موجود تھے، ان میں دقیقی خاص پایہ تخت کا رہنے والا تھا، اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے، ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابو المظفر نے کی تھی، لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت[1] سپرد کی، دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کرچکا تھا، اُس نے یہ خدمت قبول کی اور کم وبیش بیس ہزار شعر لکھے بعضوں کا بیان ہے کہ صرف ایکہزار شعر تھے جو آج شاہنامہ میں شامل ہیں، فردوسی نے شاہنامہ کی تاریخ کے بیان میں ان واقعات کو اس طرح اجمالاً لکھا ہے،

شاہنامہ کی ابتدا

[1] تذکرۂ ہفت اقلیم و مجمع الفصحا، روایت اخیر،

جوانے بیامد کشادہ زبان | سخنگوی و خوش طبع و روشن رواں
به شعر آرم ایں نامه را گفت من | ازو شادماں شد دلِ انجمن
زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار | بگفت و سر آمد ورا روزگار

کیا عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے کامل الفن کا دامنِ عزت، ایک اخلاقی دھبہ سے داغدار ہے، دقیقی کا ایک خوش رو غلام تھا، جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی لیکن افسوس ہے کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا، غلام نہایت غیور تھا، اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا، فردوسی نے اس ناگوار واقعہ کو ابہام کے پردہ میں ادا کیا ہے،

جوانیش را خوے بد یار بود | ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود،
یکا یک ازو بخت برگشتہ شد | بدستِ یکے بندہ کشتہ شد

فردوسی نے فیاض دلی سے اس کے اشعار شاہنامہ میں شامل کر لئے جس کی بدولت آج اس کا نام زندہ رہ گیا، چنانچہ خود کہتا ہے،

کنوں راز ہا باز جویم ترا | حدیثِ دقیقی بگویم ترا،
چناں دید گوینده یک شب بخواب | کہ یک جام می داشتے چوں گلاب
دقیقی زجاے پدید آمدے | بداں جام مے داستانہا زدے
به فردوسی آواز دادے کہ مے | مخور جز بہ آئین کاؤس کے
کہ شاہے گزیدے زگیتی کہ تخت | بنازد بدو تاج و شمشیر و بخت

شہنشاہ محمود گیرندہ شہر	ز شادی بہر کس رسانندہ بہر
بدیں نامہ گر چند بشتافتے	کنوں ہر چہ جستی ہمہ یافتے
از اندازہ من بیش گفتم سخن	اگر باز یابی بخیلی مکن،
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار	بگفتم سر آمد مرا روزگار
گر آں مایہ نزد شہنشہ رسد	روان من از خاک بر مہ رسد
بداند کہ پیش از تو آخر کسے	دریں داستاں رنج بردش بسے
بہ زیر فتم و داشتم زو سپاس	مرا در دل آمد ز ہر سو ہراس
کہ روزے مرا ہم بباید گزشت	ز گفتار او در نشاید گزشت
ز گفتار او بشنو اکنوں سخن	کہ گفت است ایں داستان کہن

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھ میں جام شراب ہے، دقیقی کہیں سے آنکلا اور اُس نے کہا کہ شراب کیانی طریقہ سے پیو تمکو ایسا بادشاہ ہاتھ آگیا ہے جس پر سلطنت کو ناز ہے تم نے شاہنامہ کیلئے بہت تگ ودو کی، جو تم چاہتے تھے وہ تم کو مل گیا، میں نے بھی گشتاسپ و ارجاسپ کے واقعہ میں ہزار شعر لکھے تھے تم کو اگر یہ اشعار مل جائیں تو اپنی کتاب میں شامل کر دینا کہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اور بھی کسی نے کچھ محنت اُٹھائی تھی،

یہ سنکر میرا دل کانپ اٹھا کہ مجھکو بھی ایک دن مرنا ہے، اسلئے اُسکی خواہش پوری کرنی چاہئیے، اب تم اس کے اشعار سُنو،

فردوسی نے دقیقی کے ساتھ جس ہمدردی اور مردہ پرستی کا اظہار کیا ہے، قدر کے قابل ہے، لیکن داستان کے ختم ہوتے ہوتے نیت بدل جاتی ہے، دقیقی کے اشعار کے بعد کہتا ہے،

نگہ کردم ایں نظم سست آمدم	ہمہ بیتہا نادرست آمدم،
من ایں زاں نوشتم کہ تا شہریار	بداند سخن گفتنِ نابکار
دہاں گر بماند ز خوردن تہی	ازاں بہ کہ ناساز خوانے نہی
دو گوہر نمودم بہ گوہر فروش	کنوں شاہ دارد بہ گفتار گوش
سخن چوں بدینگونہ بایدت گفت	مگوی و مکن رنج با طبع جفت،
چو طبعت نباشد چو آب رواں	مبر دست زی نامۂ خسرواں

یعنی جب میں نے دقیقی کی یہ نظم دیکھی تو تمام اشعار مجھکو سست اور غلط نظر آئے میں نے یہ اشعار اس لئے نقل کر دیئے کہ بادشاہ ان اشعار کی نوعیت سے واقف ہو جائے اگر آدمی کو کھانا نہ دیا جائے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کے سامنے بدمزہ کھانے لائے جائیں، میں نے گوہر فروش کے سامنے دو موتی رکھدیئے ہیں، اب بادشاہ خود تمیز کرلے، جب تم کو اسی طرح کا شعر کہنا آتا ہے، تو اس سے تو نہ کہنا ہی اچھا ہے، جب تمھاری طبیعت میں روانی نہیں ہے، تو سلاطین کی تاریخ پر کیوں ہاتھ ڈالتے ہو،

اگر دقیقی کا کلام نقل کرنے سے اپنے اشعار کا چمکانا مقصود تھا، تو اُس غریب پر احسان رکھنے کی کیا ضرورت تھی، اس سے اندازہ کرنا چاہئے، کہ سلطان محمود کی ہجو میں

دقیقی کا انداز کلام

کس حد تک واقعیت کا پہلو ہوگا،

فردوسی خدائے سخن ہے، اس کے آگے بندوں کو زبان کھولنے کی کیا جرات ہو سکتی ہے؟ لیکن ع انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعت است، ہم سرسری طور پر یہاں دقیقی کے چند اشعار بغیر کسی انتخاب کے نقل کرتے ہیں، جس سے دقیقی کے رتبہ کلام کا اندازہ ہو سکے گا، وہ معرکہ آرائی کا سماں اس طرح کھینچتا ہے،

زبس بانگ اسپان و جوش و خروش | ہمی نالہ کوس نشنیدہ گوش
درفشان بسیار افراشتہ | سر نیزہا، زابر، بگزاشتہ
چو رستہ درخت از بر کوہسار | چو بیشۂ نیستاں بوقتِ بہار
زتاریکی گرد و بانگ سپاہ | کسے روز روشن نمی دید راہ
بکردند یک تیر باراں نخست | بسان تگرگ بہاراں درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب | زپیکانہاے درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر آرد ہمے | وزاں ابر الماس بارد ہمے
ہوا از جہاں بود نیلگوں شدہ | زمیں سر بسر پاک در خوں شدہ
در و دشتہا شد ہمہ لالہ گوں | بہ دشت و بیاباں ہمی ریخت خوں
چناں شد زبس کشتہ آں رزمگاہ | کہ برو بے نہ تانست (نتوانست) رفتن نگاہ

فردوسی کے کلام کا جو اصلی جوہر ہے یہی ہے کہ جس واقعہ کو بیان کرتا ہے، اسکی تصویر کھینچ دیتا ہے، انصاف سے کہو، کیا ان اشعار میں یہ بات نہیں؟ بے شبہہ فردوسی

نے اس وصف کو کمال تک پہنچا دیا، لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ وہی شراب ہے جو دوبارہ کھنچکر تیز ہو گئی ہے، دقیقی کے زمانہ تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی، عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں، لیکن عربی الفاظ، فارسی سے زیادہ ہیں، رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب قریب ہے، سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے، مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہے، وہ دقیقی ہی ہے، اس کے سینکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ، عربی کا ایک لفظ نہیں آتا، دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ اس فخر کا تاج شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھین کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا، دقیقی نے زبان کو جس طرح صاف کیا، اُس کا نمونہ یہ ہے،

دقیقی کے ہاں عربی الفاظ بہت کم ہیں

چو گشتاسپ را داد لہراسپ تخت		فرود آمد از تخت و بربست رخت
بہ بلخ گزیں شد بداں نوبہار	ق	کہ یزداں پرستاں آں روزگار
مرآں خانہ را داشتندے چناں		کہ مر مکہ را تازیاں ایں زماں
بداں خانہ شد شاہ یزداں پرست		فرود آمد آں جاہ و ہیکل بہ بست (اہل عرب)
بہ بست آں در آفریں خانہ را		دراں خانہ نگذاشت بیگانہ را
بپوشید جامہ پرستش، پلاس، (عبادت خانہ)		خدا را چنیں داشت باید سپاس
بیفگند یارہ، فروہشت موے (کنگ اضافت گزی)		سوے روشن داد گر کرد روے
نیایش ہمی کرد خورشید را (کنگن)		چناں بردہ بُد راہ جمشید را

چو گشتاسپ بر شد بہ تخت پدر — کہ فرید ر داشت بخت پدر

بسر بر نہاد آں پدر دادہ تاج — کہ زیبندہ باشد بہ آزادہ تاج

ہنم گفت یزداں پرستندہ شاہ — مرا ایزد پاک داد ایں کلاہ،

بداں داد مارا کلاہ بزرگ — کہ بیروں کنم از رمہ میش گرگ

سوے راہ ورزاں بیاریم جنگ — بہ آزادہ گیتی نداریم تنگ

پس از دفتر نامور قیصرا — کہ ناہید بُد نام آں دخترا،

کتایونش خواندی گرانمایہ شاہ — دو فرزندش آمد چو خورشید و ماہ

یکے نامور فرخ اسفندیار — شہے کارزاری، نبردہ سوار

پشوتن دگر گُرد شمشیر زن — شہے نامبردار لشکر شکن

چو یک چند گاہے بر آمد بریں — درختے پدید آمد اندر زمیں،

از ایوان گشتاسپ بیان کاخ — درختے کشن برگ و بسیار شاخ

ہمہ برگ او پند، بارش خرد — کسے کو چنو بر خورد کے مرد،

خجستہ پے نام او زردہشت — کہ اہرمن بد کنش را بکُشت

ان اشعار میں جا بجا فک اضافت اور الف اشباع ہے جو آج کل متروک و معیوب ہے، لیکن قدمائے کے ہاں اس کا عام رواج تھا، فردوسی بے تکلف ان چیزوں کو برتتا ہے،

دقیقی نے مثنوی کے ساتھ، قصیدہ اور غزل کو بھی ترقی دی، یہ دو شعر جو نامعلوم

طور پر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہیں، اسی کی غزل کے ہیں،

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد | آرے دہد ولیک بعمرِ دگر دہد
من عمر خویشتن بہ صبوری گذاشتم | عمرِ دگر بباید تا صبر بر دہد،

اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں، اور یہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بالکل نئی بات ہی۔ اسکی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رزم و بزم اور عشق و عاشقی کے دائرہ میں محدود نہیں، آج جس چیز کو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں، فارسی میں غالباً سب سے پہلے اسی نے اسکی بنیاد قائم کی، ایک قصیدہ میں بہار کا سماں دکھایا ہے، اس میں خوشرنگ اور رنگ برنگ پھولوں کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے،

نیچرل شاعری

سحر گاہاں کہ بادِ نرم جنبد | بجنباند درخت سُرخ و اصفر (زرد)
تو پنداری کہ از گردوں ستارہ | ہمے بارید بر دیبائے اخضر (کمخواب)
نگار اندر نگار و لون در لون | ہزاراں در شدہ پیکر بہ پیکر

ایک مسلسل غزل بہار کی رنگینی اور معشوق پر لکھی ہے،

غزل مسلسل

در افگند اے صنم ابر بہشتی | زمیں را خلعتِ اُردے بہشتی
زمیں بر ساں خون آلودہ دیبا | ہوا بر ساں (مانند) مشک اندودہ دشتی
بداں ماند کہ گوئی از مے و مشک | مثال (تصویر) دوست بر صحرا نوشتی
بتے رخسار او ہم رنگِ یاقوت | مے بر گونۂ جامہ کنشتی،
جہاں طاؤس گونہ گشت گوئی | بجائے نرمی و جائے درشتی

زگل بوے گلاب آید بدانساں	کہ پنداری گل اندر گل سرشتی،
دقیقی چار خصلت برگزیدست	بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی،
لبِ یاقوت رنگ و نالۂ چنگ	مے خوں رنگ و کیشِ زردہشتی[1]،

مذہب

شہید بلخی

زمانہ کی ناقدردانی کی شکایت

اس دور کا مشہور شاعر ہے، مختصر تذکرہ اس کا اوپر گذر چکا، اشعار کا نمونہ یہ ہے،

دانش و خواستہ است نرگس و گل	کہ بہ یکجاے نشگفند بہم،
ہر کرا دانش است خواستہ نیست	ہر کرا خواستہ است دانش کم
اگر غم را چو آتش دود بودے	جہاں تاریک بودے جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی	خردمندے نیابی شادمانہ
بر فلک ہر دو[2] شخص پیشہ ورند	ایں یکے درزی، آں دگر جولاہ
ایں نہ دوزد مگر کلاہِ ملوک	واں نہ بافد مگر پلاس سیاہ،

تشبیہات

ابر ہمی گرید چوں عاشقاں	باغ ہمی خندد معشوق وار
رعد ہمی نالد مانند من	چونکہ بنالم بہ سحرگاہ زار
چوں چلیپاے روم زاں شد باغ	کاب ریزے است باغ را زحلی
ابر چوں چشم ہند بن عتبہ است	برق مانند ذوالفقارِ علیؓ

[1] یعنی زردشتی، کیونکہ زردشت کے مذہب میں شراب حلال ہی،

موعظت و نصیحت

عیب باشد بہ کار بینک رنگ | گر شتاب آید اے رفیق ملام
عاقبت راہم از نخستین بین | تا بہ غفلت گلو نہ گیرد دام

ابو شکور بلخی

سنہ ۳۳۶ھ میں تھا، اس کا کلام بہت کم ملتا ہے، لیکن جس قدر موجود ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کا ہر قدم آگے بڑھ رہا ہے، سقراط سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ کو اس قدر تحقیقات و تدقیقات کے بعد کیا معلوم ہوا؟ اس نے کہا یہ "معلوم ہوا کہ کچھ نہیں معلوم ہوا" اس فلسفیانہ خیال کو کس قدر عمدہ اور شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے،

تا بدانجا رسیدہ دانشِ من | کہ بدانم ہمے کہ نادانم

یعنی میرا علم اس حد تک ترقی کر گیا کہ اب میں نے جان لیا کہ میں کچھ نہیں جانتا، اس کی مثنوی کے چند اشعار جو منقول ہیں ان میں صاف شاہنامہ کا رنگ نظر آتا ہے،

بہ دشمن برت مہربانی مباد | کہ دشمن درختے است تلخ از نہاد
درختے کہ تلخش بود گوہرا | اگر چرب و شیرین دہد مرورا
ہماں میوۂ تلخت آرد پدید | ازو چرب و شیریں نخواہی مزید

اسی مضمون کو فردوسی نے زیادہ بلند کر دیا ہے،

درختے کہ تلخ است ویرا سرشت | گرش بر نشانی بہ باغِ بہشت
ور از جوے خلدش بہنگامِ آب | بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بہ کار آورد | ہماں میوۂ تلخ بار آورد،

جنازی نیشاپوری

دولت سامانیہ کا نامور شاعر ہے ۳۴۲ھ میں وفات پائی، اس کا کلام بالکل نایاب ہے، ایک قصیدہ کی گریز کے دو شعر مشہور ہیں جن میں متاخرین کی جدتِ مضمون کیساتھ نیچرل رنگ بھی موجود ہے،

می بینی آں دو زلف کہ بادش ہمی برد | گوئی کہ عاشقی است کہ ہیچش قرار نیست
یا نہ کہ دست حاجبِ سالار لشکر است | کز دور می نماید کامروز بار نیست

یعنی معشوق کی زلف جو ہوا سے ہل رہی ہو، گویا ایک بیچین عاشق ہے یا شاہی نقیب کا ہاتھ ہے، جو دور سے اشارہ کر رہا ہے کہ آج دربار نہ ہوگا،

عمارۂ مروزی

مرو کا رہنے والا تھا، ۳۶۵ھ میں انتقال کیا، کلام کا نمونہ یہ ہے،

آتش اگر ندیدی با آبِ ممتزج | اینک نگاہ کن تو بدیں جام و ایں شراب
جام بلور و لعل مے صاف اندرو | گوئیکہ آتشے ست برآمیختہ بہ آب

ان شعراء کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوشگو اور خوش فکر تھے، مثلاً اعجمی، طخارتی، ابو العباس زنجی، جوتباری، ابو المثل بخاری، طلحہ وغیرہ لیکن چونکہ اُن کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لئے ہم اُن کے نام قلم انداز کرتے ہیں،

غزنویہ

شاعری اگرچہ ابتدائے ظہور سے روز افزوں ترقی کرتی جاتی تھی، لیکن غزنویہ دور میں انتہائے کمال تک پہنچگئی، فردوسی، اسدی طوسی، عنصری، فرخی، حکیم سنائی، منوچہری، دامغانی، جن میں ہر شخص اقلیمِ سخن کا صاحبِ تاج و تخت ہے، اسی عہد کی یادگار ہیں،

سلسلۂ غزنویہ، حقیقت میں سامانی حکومت کی ایک شاخ ہے، عبد الملک بن نوح سامانی المتوفی ۳۵۰ھ کے زمانہ میں الپتگین جو اسی خاندان کا غلام تھا، ترقی کر کے امارت کے درجہ تک پہنچگیا، عبد الملک نے اسکو خراسان کا حاکم مقرر کر دیا، عبد الملک کے بعد جب اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا تو الپتگین خراسان چھوڑ کر غزنین چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس تک حکومت کر کے وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق قائم مقام ہوا لیکن چند روز کے بعد مر گیا، الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا، اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحٰق کے بعد لوگوں نے ۳۶۵ھ میں اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا، یہی غلام (در غلام) سلطنت غزنویہ کا بانی اول ہے، اور سلطان محمود فاتحِ ہندوستان اسی نامور کا فرزند ہے سبکتگین پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا، اور

غزنوی خاندان کا اجمالی تذکرہ

جیپال کو بار بار سخت شکستیں دیں، سامانی دربار سے اسکو ناصر الدین کا خطاب ملا، ۳۸۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا بلخ میں تخت نشین ہوا، محمود غزنیں میں تھا، اس نے بھائی کو لکھا، کہ آپ بلخ میں حکومت کیجئے، لیکن غزنیں میرے قبضہ میں رہنے دیجئے، اس نے نہ مانا، اس پر جنگ ہوئی اور اسمٰعیل نے شکست کھائی، محمود باپ کی زندگی ہی میں نوح سامانی کے دربار سے سیف الدولہ کا خطاب حاصل کر چکا تھا، تخت نشینی کے بعد اس کو بغداد کے دربار سے یمین الدولہ کا لقب ملا،

محمود کی شاہانہ فتوحات اور معرکہ آرائیاں ایک دلچسپ داستان ہے جس کی آواز بازگشت آج بھی ہندوستان کے در و دیوار سے آرہی ہی، لیکن شعر العجم کی زبان سے اسکی ملکی فتوحات کے بجائے علمی فتوحات کا ترانہ زیادہ موزوں ہوگا،

سلطان محمود کے علمی کارنامے

محمود جس طرح فاتح و کشورستان تھا اسی طرح علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا جواہر مضیئہ جو فقہائے حنفیہ کے حالات میں ایک نہایت مستند کتاب ہی، اسمیں اس کو فقہا میں شمار کیا ہی، فقہ میں خود اسکی ایک مبسوط تصنیف موجود ہے، غزنیں میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا تھا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا، جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے[1]، ملک میں جو بڑے بڑے مشاہیر فن تھے اکثروں کو بلا کر دربار میں جگہ دی تھی، ان میں سے ایک ابوریحان بیرونی بھی تھا جو متعدد فنون میں

[1] تاریخ فرشتہ،

شعرا کی تربیت اور فیاضی

بوعلی سینا کا ہمپایہ و ہمسر تھا، بوعلی کو بھی اس نے خوانِ کرم پر دعوت دی تھی، لیکن اسکو کچھ وہم پیدا ہوا اور نہ آیا،

شاعری پر اس نے حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی، ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور عنصری کو ملک الشعراء کا خطاب دیکر اس کا افسر مقرر کیا، تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ محمود کے خوانِ کرم سے چارسو شاعر بہرہ یاب تھے، جنکو حکم تھا کہ جو کچھ کہیں پہلے عنصری کو دکھلا کر پھر دربار میں لائیں، ایک موقع پر جب شہزادہ مسعود خراسان سے غزنین میں آیا اور شعرائے نے دربار عام میں قصائد پیش کئے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور زینتی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عطا کئے[۱]، عضاری کو دو شعروں پر دو توڑے دئیے، چنانچہ عضاری خود کہتا ہے،

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں	بر آں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم	برغم حاسد و تیمار بدسگال بکال

عنصری کو ایک رُباعی پر حکم دیا کہ اس کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے،

ان واقعات کو ایک نکتہ چیں محمود کے فضائل کے بجائے اس کے معائب کے دفتر میں لکھے گا، اور واقعی مداحوں اور خوشامدگویوں کی ایک فوج کثیر بہم پہنچانا اور ان پر زر و جواہر کا مینھ برسانا، فیاضی نہیں بلکہ اسراف اور سبک سری ہی، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ محمود کی یہ فیاضیاں، مدح پسندی کی غرض سے نہیں بلکہ فن ادب و تاریخ

[۱] مجمع الفصحا، تذکرہ زینتی،

کی ترقی کی غرض سے تھیں، اس نے فردوسی سے شاہ نامہ لکھوا کر عجم پر یہ احسان کیا، کہ عجم گو خود مٹ گیا، لیکن اُس کے کارنامے آج تک نہ مٹ سکے، اسلامی فتوحات، مسلمانوں کے مذہبی ترانے ہیں، لیکن مسلمان خالدؓ و ضرارؓ کے بجائے، رستم و سہراب کے نام سے زیادہ آشنا ہیں، عبدالملک، ولید، مقتدر، معتضد، معتصم، مستعصم کو کتنے آدمی جانتے ہیں؟ لیکن جم و کیخسرو، کیکاؤس و فریدوں، افراسیاب و اسفندیار کو بچہ بچہ جانتا ہے،

عنصری نے ۱۰۰ اشعروں کا قصیدہ، لکھا جس میں محمود کی تمام لڑائیاں نہایت تفصیل سے بیان کیں، بدایعی بلخی نے نوشیرواں کا نصیحت نامہ نظم کیا، اسدی طوسی نے لغاتِ فارسی کی تدوین کی اور بدائع و صنائع فارسی پر ایک کتاب لکھی، تاریخ و اخلاق کے علاوہ محمودی شعرا نے اصل فن کو ترقی دی، اور شاعری کو اس قابل کر دیا کہ جس قسم کے مطالب چاہیں ادا کر سکیں، واقعہ نگاری، معاملہ بندی، اظہار جذبات، قدرتی مناظر کی تصویر، غرض شاعری کے جتنے انواع ہیں، سب ان کے ہاں پائے جاتے ہیں، غزل البتہ رہ گئی لیکن ابھی اسلام کی ترقی کا شباب تھا، ابھی سے اس فتنۂ خوابیدہ کے جگانے کی کیا ضرورت تھی،

محمودی شعراء اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن جن ناموروں کو محمود نے ندما میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارے تھے یہ ہیں، عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، غفاری، فرخی، منوچہری،

عنصری

حسن بن احمد نام، ابو القاسم کنیت، عنصری تخلص، بلخ کا رہنے والا تھا، آغاز شباب میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، چونکہ آبائی پیشہ تجارت تھا، خود بھی تجارت شروع کی، ایک دفعہ اسی ضرورت سے سفر کو نکلا، راہ میں ڈاکہ پڑا، اور جو کچھ کائنات تھی، سب جاتی رہی،

عنصری نے تجارت کا خیال چھوڑ کر علم کی طرف توجہ کی، اس زمانہ میں تحصیل علم کے لئے فیس وغیرہ کا کچھ جھگڑا نہ تھا، ہر جگہ، ہر طرف بڑی بڑی درس گاہیں کھلی ہوئی تھیں، اور جو شخص جس آزادی سے پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ سکتا تھا، عنصری نے تمام متداول علوم وفنون حاصل کئے، لیکن طبیعت کو قدرتی لگاؤ شاعری سے تھا، اس لئے شاعری کو اپنا فن قرار دیا اور اسی ذریعہ سے سلطان محمود کے چھوٹے بھائی نصر بن سبکتگین کے دربار میں پہونچا،

ملک الشعرائی کا خطاب

نصر نے جوہر قابل دیکھکر محمود کے دربار میں تقریب کی، رفتہ رفتہ **ملک الشعراء** کا خطاب ملا، سلطان محمود نے حکم دیا کہ دربار کے تمام شعراء جن کی تعداد چار سو تھی، اپنا کلام عنصری کو اصلاح کی غرض سے دکھائیں، اور جس کا کلام پیش ہو عنصری کی اصلاح کے بعد پیش ہو، بڑے بڑے شعراء عنصری کی مدح میں قصائد لکھ کر پیش کرتے تھے، اور گراں بہا صلے پاتے تھے،

عنصری کی دولت و ثروت

محمود کی شاہانہ فیاضیوں نے عنصری کو دولت و مال سے اس قدر مالا مال کر دیا کہ چار سو زریں کمر غلام، رکاب میں ساتھ چلتے تھے، اور جب سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان جو عموماً طلائی و نقرئی ہوتا تھا، چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا، انتہا یہ کہ

دیگیں بھی طلائی اور نقرئی ہوتی تھیں[1]، اکثر شعرا نے عنصری کی دولت مندی کا ذکر حسرت و رشک کے ساتھ کیا ہے، خاقانی کہتا ہے،

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان	ز زر ساخت آلاتِ خوان عنصری

محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے جن میں فرخی، عسجدی، عضاری، منوچہری، جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں، لیکن یہ بات اسی کو حاصل ہوئی کہ سلطان محمود کا بقاے نام اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، نظامی سمرقندی کہتا ہے،

بسا کا خا کہ محمود ش بنا کرد	کہ از رفعت ہمی با مہ ندا کرد
نہ بینی زاں ہمہ یک خشت بر پاے	مدیحِ عنصری ماندست بر جاے

عنصری نے سلطان محمود کی وفات کے تقریباً دس برس بعد ۴۳۱ھ میں وفات پائی، اس کے اشعار کی تعداد ۳۰ ہزار بیان کیجاتی ہے، جن میں اب صرف تین ہزار موجود ہیں، قصائد کے سوا متعدد مثنویاں بھی لکھی تھیں، مثلاً وامق وعذرا، سرخ بت و خنگ بت، شادبہر وعین، لیکن آج بالکل ناپید ہیں، اس زمانہ تک شاعری کا بڑا لازمہ ندیمی یعنی فن مجلس تھا، جو شاعر جس قدر زیادہ اس فن میں کمال رکھتا تھا، اسی قدر زیادہ کامیاب ہوتا تھا، اس کے لئے سب سے مقدم چیز بدیہہ گوئی تھی، عنصری اس وصف میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، وہ نہایت پرگو تھا اور برجستہ کہتا تھا آتشکدہ میں لکھا ہے کہ ایک موقع پر رات بھر میں ہزار شعر کہہ ڈالے، اسکی بدیہہ گوئی کے واقعات تذکروں

[1] عنصری کے حالات زیادہ ترمجمع الفصحا، و تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی سے لئے گئے ہیں،

عنصری کی بدیہہ گوئی

میں کثرت سے ملتے ہیں،

سلطان محمود کو ایاز سے جو محبت تھی اگرچہ حد سے متجاوز تھی لیکن ہوس کا شائبہ نہ تھا، ایک دن بزم عیش میں بادہ وجام کا دور تھا، محمود خلاف عادت معمول سے زیادہ پی کر بدمست ہوگیا، اسی حالت میں ایاز پر نظر پڑی، اُس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں، محمود نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈالدیئے، لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقویٰ میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھدے، ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی[1] صبح کو جب محمود سوکر اُٹھا تو ایاز کی صورت دیکھکر سخت مکدّر ہوا، بار بار اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، نُدما اور مقربین دم بخود تھے، آخر علی قریب نے جو حاجب خاص تھا، عنصری کو بُلاکر صورتِ واقعہ بیان کی، عنصری نے محمود کے سامنے جاکر یہ رُباعی پڑھی،

گر عیب سرِ زلف بت از کاستن است	نہ جاے بہ غم نشستن و خاستن است
وقت طرب و نشاط و می خواستن است	کاراستن سرو ز پیراستن است،

یعنی اگر معشوق کی زلفیں ترش گئیں تو یہ رنج وغم کی کیا بات ہے، یہ تو اور خوشی کا موقع ہے، اس لئے کہ سرو جب چھانٹ دیا جاتا ہے تو اور زیادہ وہ موزوں ہو جاتا ہے، محمود نے حکم دیا کہ عنصری کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے، چنانچہ تین دفعہ ایسا کیا گیا، چہار مقالہ میں لکھا ہے کہ منہ کے بجائے دامن بھرا گیا تھا، فیاضی کے مبالغہ کے لحاظ سے شاید یہی روایت صحیح ہو، لیکن منہ بھرنے میں جو بات ہے وہ دامن میں نہیں،

[1] شعرائے اس واقعہ سے مضامین پیدا کئے، مرزا صائب کہتے ہیں " پا از گلیم خویش نباید دراز کرد، تیغ ستم بہ بیں چہ بزلف ایاز کرد

ایک دفعہ سلطان نے فصد لی عنصری نے برجستہ کہا،

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست نیش الماس گوں گرفتہ بدست

طشتِ زریں و آبدستاں خواست بازوے شہریار را بربست

نیش بگرفت و گفت عز علیک ایں چنیں دست را کہ یارد خست

سر فرو برد و بوسہ بردار وز سمن شاخِ ارغوان برجست

پہلے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اوجِ ترقی کے زمانہ میں بھی جرّاحی و فصادی کا کام عیسائی کرتے تھے، ایک دفعہ محمود چوگاں کھیلنے میں گھوڑے سے گر پڑا خفیف سا زخم آیا عنصری نے فی البدیہہ کہا،

شاہا! ادبے کن فلک بد خو را کآسیب رسانید رخِ نیکو را

گر گوی خطا رفت بہ چوگانش زن ور اسپ غلط کرد بمن بخش اورا

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے، ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اس کو بخش دیجئے، دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رو ہے تو مجھے دے ڈالئے، محمود نے اس حسنِ طلب کے صلہ میں گھوڑا عنصری کو دیدیا، عنصری نے ایک اور رُباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی،

رفتم بر اسپ تا ہز ارش بکشم گفتا کہ نخست بشنو ایں عذرِ خوشم

نے گاو زمینم کہ جہاں برگیرم نے چرخِ چہارمم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا، گھوڑے نے کہا پہلے میرا عذر تو سُن

لیجئے، کچھ میں گاؤ زمیں تو نہیں ہوں کہ عالم کا بار اٹھالوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں،

شاعری کے متعلق عنصری نے جو کام کئے ان کی تفصیل یہ ہے،

(۱) قصیدہ میں مخلص اور گریز سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز سمجھی جاتی ہے یعنی غزلیہ مضامین کہتے کہتے بادشاہ کی مدح کی طرف کیونکر رجوع کریں، متاخرین کو ناز ہے کہ یہ نکتہ آفرینیاں انہی کے ساتھ مخصوص ہیں، لیکن انصاف یہ ہے کہ عنصری کے مخلص بھی متاخرین سے کم نہیں، ایک قصیدہ میں ابتدا سے انتہا تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے، اس میں لکھتا ہے،

عنصری کی شاعری کی خصوصیت

غنودستند آں ماہ منور، خط و زلفیں آں، مہ روے دلبر

یکے را سنبل نو رستہ بالیں یکے را لالہ خود روے بستر

بہ روی و موی او بنگر کہ بینی بے آذر، ہر دو آں را فعل آذر
آگ

یکے بے دود سال و ماہ تیرہ یکے بے نور روز و شب منور،

مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی دل پاک و زبان مدح گستر

یکے بر مہر جاناں وقف کردم یکے بر مدح شاہنشاہ کشور

ایک اور قصیدہ ہے،

گہ آں آراستہ زلفش گرہ گرد و گہے چنبر گہ آں پیراستہ جعدش بیارد مشک گہ عنبر

شگفتہ لالہ رخسارہ، حجاب لالہ چرارہ برانہ عاج و دل از خارہ تن از شیر و لب از شکر
زلف

سمن بوے، شبہ موے، بلا جوے، جفا گوے پریزادے، پری روے، پری چہرے، پری پیکر

بپرداز ای دل از روے کہ گاہ آمد کہ حق جوے غزل چندیں چرا گوئی، از عشق آں بتِ دلبر

تناجوے از غزل پاسخ کہ تا ایں ہر دو بود فرخ غزل بر ماہ زیبا رخ، ثنا بر شاہ نیک اختر

ایک قصیدہ سوال و جواب سے شروع کیا ہی، اور اخیر تک یہ انداز قائم رکھا ہے اس میں نہایت خوبی سے مدح کی طرف رجوع کی ہی،

ہر سو الے کز اں گل سیراب دوش کردم مرا بداد جواب

گفتم آتش بر اں رخت کہ فروخت گفت آں کہ دلِ تو کرد کباب

گفتم اندر عذابِ عشق تو ام گفت عاشق نکو بود بہ عذاب

گفتم از چیست روے راحتِ من گفت ہر دم ازروے خسرو شاب

گفتم آں میر نصر ناصر دین گفت آں مالکِ قلوب و رقاب

گفتم اندر جہاں چو او دیدی گفت نے و نخواندہ ام بکتاب

گفتم اعداے او دروغ زن اند گفت ہمچوں مسیلمہ کذاب

گفتم از مدح او نیاسایم گفت زینساں کنند اولو الالباب

گفتم او را چہ خواہم از ایزد گفت عمرِ دراز و دولت شاب

ایک قصیدہ کو تشبیب سے شروع کیا ہی، معشوق کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہی

او و من ہر دو ہمی نازیم و نازِ من بہ است کو بہ حسنِ خویش نازد من بہ مدحِ شہریار

ایک قصیدہ زلف کی تعریف سے شروع کیا ہی،

ای شکستہ زلفِ یار، از بسکہ تو دستاں کنی
دست دست بَتست گر با ساحراں یکساں کنی

ہم زرہ پوشی دہم چوگان زنی بر ارغواں
خوشتین راگہ زرہ سازی وگہ چوگاں کنی

نیستی دیوانہ، بر آتش چرا غلطی ہمی؟
نیستی پروانہ، گردِ شمع چوں جولاں کنی؟

زلف سے خطاب کرتے کرتے اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے،

دل نگہدار ای تن از دوش کہ دل باید ترا
تاثنائے کدخدائے کشور ایراں کنی

(۲) قصیدہ اگرچہ مداحی اور ہجو کے لئے مخصوص ہوگیا تھا، اسی بنا پر عرفی نے کہا ہے، قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی

ایک اور شاعر کہتا ہے،

گر نہ گویم قصیدہ باکے نیست
من خوشامدنمی توانم گفت

لیکن عنصری نے اکثر قصائد سے واقعہ نگاری کا کام لیا ہے، اس نے اکثر قصیدوں میں محمود کی لڑائیاں اور فتوحات نظم کی ہیں، ایک قصیدہ میں جو ۲۰۷ شعروں کا ہے محمود کے تمام معرکے اجمالاً لکھے ہیں[1]، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

شنیدہ خبر شاہِ ہندواں جیپال
کہ بر سپہر بلندش ہمی بسود افسر

بداں صنعت سپہے چوں شب سیاہ بزرگ
بدست ایشاں شمشیرہاے ہمچو سحر

چو دود تیرہ، در و آتشے زبانہ زناں
تو گفتئی کہ پراگندہ شد بدشت سقر

خدایگان خراساں بدشتِ پیشاور
بہ حملۂ بپراگند آں ہمہ لشکر

---

[1] تذکرۂ دولت شاہ میں لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں ۲۰۰ شعر ہیں لیکن دیوان مروجہ میں اس سے کم ہیں،

حکایتِ سفرِ مولتاں ہے دانی ۔۔۔ وگر ندانی تاج الفتوح پیش آور

اگر ز دجلہ فریدوں گذشت بے کشتی ۔۔۔ بہ شاہنامہ بر آں بر حکایت ست سمر

ازاں سپس کہ درو وہم راند پایاب ۔۔۔ وزاں سپس کہ بر آں بادرا نبود عبر

بہ مولتاں شد و در رہ دو بیست قلعہ کشاد ۔۔۔ کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر

بلاد و بت کدہ شاں کشاد و سوخت ہمہ ۔۔۔ ببرد باد ہمہ تودہاے خاکستر

چو باز گشت بہ یک تاختن بہ میمنہ شد ۔۔۔ ازاں کہ بود خراساں ز رنجہا مضطر

خوارزم کی فتح میں لکھتا ہے،

بوقت آں کہ زمیں تفتہ بد ز بادِ سموم ۔۔۔ ہوا چو آتش و گرد اندرو، بجاے شرار

فرو گذاشت بآموبہ شہریارِ جہاں ۔۔۔ بہ فالِ اخترِ نیک و بہ نصرتِ دادار

ہمہ زمیں شدہ، آز روے بندگان کشمیر ۔۔۔ ہمہ ہوا شدہ از عکسِ چاؤشاں فرخار

در آب در ہمہ غرقہ شدند چوں فرعون ۔۔۔ چو بر گذشت آں آب شاہ موسیٰ دار

فراخ جیحوں چوں کوہ شد ز بسکہ درو ۔۔۔ کلاہ و ترکش و زیں بود و جامہ و دستار

کسے کہ زندہ بماند است ازاں ہزیمتیاں ۔۔۔ اگرچہ تنش درست است ہست چوں بیمار

بہ مغزش اندر، تیغ است اگر بود خفتہ ۔۔۔ بہ چشمش اندر تیر است اگر بود بیدار

اگر بہ جنبد، بہ بند قباے او از باد ۔۔۔ گماں کند کہ ہمی بر جگر خورد مسمار

اگر سوال کند، گوید اے سوار مزن ۔۔۔ وگر جواب دہد گوید اے ملک زنہار

اخیر شعروں میں شکست یافتہ فوجوں کی بدحواسی اور خوف زدگی کی تصویر کس خوبی

سے کھینچی ہے، کہتا ہے کہ جب یہ سوتے ہیں، تو خواب میں ان کو ہر طرف تلواریں نظر آتی ہیں، اور آنکھ کھلتی ہے، تو تیر ہی تیر دکھائی دیتے ہیں، قبا کا بند اگر ہوا سے جنبش کرتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ کوئی شخص کلیجے میں کیل ٹھونک رہا ہے، اگر کچھ درخواست کرتا ہے تو یہ کہ میاں سوار! اب نہ مارنا، اور کچھ جواب دیتا ہے تو یہ کہ اے بادشاہ، پناہ دے"

(۳) مناظر قدرت اور خاص خاص چیزوں کے اوصاف بھی اُس نے نہایت خوبی سے لکھے ہیں،

بہار

ابر نوروزی ہمی دُربار دوبت گر شود | تا ز صنعش ہر درختے بعبتے دیگر شود

باغ ہمچوں کلبۂ بزاز پر دیبا شود | باد ہمچوں طبلۂ عطار پُر عنبر شود

روے بندِ[1] ہر زمینے حُلّۂ چینی شود | گوشوارِ ہر درختے رشتۂ گوہر شود

زمین کا ہر تختہ چینی کپڑے کی نقاب پہن لیتا ہے | درخت کانوں میں سونے کے بندے ڈال لیتے ہیں

چوں حجابی لعبتاں خورشید را بینی کہ باز | گہ بروں آید ز میغ، وگہ ز میغ اندر شود

آفتاب، بھان متی کی پتلی بن گیا ہے | کہ کبھی بادل سے نکل آتا ہے اور کبھی بادلوں میں گھس جاتا ہے

افسرِ سیمیں فرو گیرد، ز سر کوہِ بلند | باز مینا چشم و دیبا روے و مشکیں سر شود

پہاڑ نے چاندی کا تاج (برف) سر سے اُتار کر رکھدیا | اور اسکی آنکھیں سبز، چہرہ پرنگار، اور سر مشکیں ہو گیا،

مقصد یہ کہ پہاڑ پر سبزہ، بنفشہ، اور طرح طرح کے پھول پیدا ہو گئے،

[1] نقاب کو کہتے ہیں،

تاریخ کی تعریف،

درخت نارنج، از خامہ گوئیا شنگرف — برخیت است کسے مشت مشت درزنگار

زبرگ و بار ہمہ طوطیانِ پرّانند — کہ برگ شاں ہمہ پرّست و بارشاں منقار

نہر کی تعریف

مجرّہ وار یکے جوے اندرو گزرد — بر آب خضر ہتبہ کردہ، آب او بازار

(کہکشاں) (آب حیات)

اگر بجنبد گوئی ہمے بجنبد جاں — وگر بہ پیچد گوئی ہمے بہ پیچد مار

بسان قارون گاہے فرو شود بزمیں — گہے شود بہ ہوا بر چو جعفر رضہ طیار

ہاتھی کی تعریف

نہ چرخ اند، لیکن ہمہ چرخ گردش — نہ کوہند، لیکن ہمہ کوہ پیکر

چو اندر ہوا، کوہ بر قومِ موسیٰ ؑ — چو بر قومِ عاد آیت بادِ صرصر

چناں گردد، از عرض شاں دشت گوئی — بہ موج اندر آید، ہمی بحرِ اخضر

تنک راہ گیرند، بر آب و آتش — بدنداں بدّرند پولاد و مرمر

(سبک)

زمیں کوہ باشد چو آیند پیدا — چو اندر گذشتند، چاہ مقعرّ

صنائع بدائع | یہ بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن خال خال تھی، اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اس طرف رجوع ہوتا، عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں، اور چونکہ بعض صنعتیں نہایت خوبی سے استعمال کیں، اور شعراء نے بھی تقلید کی، اور ایک عام شاہراہ پیدا ہو گئی، چنانچہ ترصیع یعنی دونوں مصرعوں میں تمام الفاظ کا باہم مساوی الوزن ہونا یا ہم قافیہ ہونا، اس قدر عام ہوا کہ قدماء کے اخیر دور یعنی ساتویں صدی تک تمام قصائد اسی انداز پر لکھے جاتے تھے اور فیصدی . ۸ شعروں میں یہ

صنعت پائی جاتی تھی، لف و نشر، تقسیم، سیاقۃ الاعداد کو بھی رواج ہوا، لیکن نہ اس قدر کہ قصائد کے گلے کا ہار بن جائیں، عنصری نے جس طرح ان صنعتوں کو برتا اُن کی مثالیں درج ذیل ہیں،

ترصیع نمبر ا

درختے است گویا بہ مینا منقش — پرندے ست گویا بہ لولو مشجر

رونده است و رفتنش در مغز شیراں — خورنده است و خوردنش از مغز کافر

نہ وہم ست و گشتنش چوں وہم بر دل — نہ مغز است و بودنش چوں مغز در سر

گہ آں آراستہ زلفش گره گرده گہے چنبر — گہ آں پیراستہ جعدش ببارد مشک گہ عنبر

رخ چوں تو شگفتہ گل، ہمہ گلبن بہ رنگ گل — ہمہ شمشاد، پر سنبل، ہمہ بیجاده پر شکر

بہ رو از نیکوے معنی، بہ غمزه از جادوے دعوی — بہ چہره حجت مانی، بہ خوبی حاجت آذر

سمن بوے، اشبہ موے، بلاجوے، جفاگوے — پری زادے، پری روے، پری چہرے، پری پیکر

دل آرامی، دل آراے، غم انجامے، غم افزاے — نکورویے، نکورایے، بہ حسن اندر جہاں سرور

تمام قصیدہ اسی صنعت میں ہے، اور اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعرائے مابعد نے التزاماً اس کے تتبع میں قصائد لکھے، سلمان ساوجی، امیر خسرو، اور قاآنی نے بعض اور خوبیاں اس میں اضافہ کیں، اور زیادہ حسن پیدا کر دیا، مثلاً قاآنی کہتا ہے،

کنوں کز سنبلید و ارغوان و یاسمن آرد — چمن تزئین، دمن تمکین، زمیں آئیں، زماں زیور

بہ صحن باغ و طرف راغ و زیر سرو و پاے جو — بزن گام و بجو کام و بده جام و بکش ساغر

لف و نشر اور تقسیم کو اگرچہ عنصری نے بہت کم برتا ہے، لیکن نہایت خوبی اور

سادگی سے برتا ہے،

یا بہ بندد یا کشاید یا ستاند یا دہد — تا جہاں باشد ہمی مرشاہ را این یادگار

انچہ بستاند ولایت، انچہ بدہد خواستہ — انچہ بندد دوست دشمن انچہ بکشاید حصار

مبالغہ، اس میں بھی عنصری نے کچھ کمی نہیں کی، لیکن اُس وقت تک تکلف اور بناوٹ کو اس قدر ترقی نہیں ہوئی تھی، اس لئے متاخرین کے مقابلہ میں اس کے مبالغے پھیکے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے،

شگفت آیدازمرکب تو خرد را — کش از باد طبع ست و از خاک منظر

بہ گام پسیں بررود گر برانے — بہ تقریبش از باختر تا بہ خاور

نہ جستن کند کم ز دریا بہ دریا — نہ منزل کند کم، ز کشور بہ کشور

مضمون آفرینی

بہ نور و ظلمت ماند زمین و ابر ہمی — بہ در و مینا ماند سرشک ابر و گیا

فریفتہ است زمیں ابر تیرہ را کہ از و — ہمی ستاند در و ہمی دہد مینا

یعنی زمین اور بادل نور و ظلمت کے برابر ہیں، اور قطرۂ باراں، اور گھاس گویا موتی اور سبز شیشے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بادل زمین کے فریب میں آگئے ہیں، کیونکہ زمین سبز شیشہ دیکر اس کے عوض بادلوں سے موتی لیتی ہی،

ہمانا کہ خورشید رنگ رخش را (گھاس) — بدوزد کہ بخشد بہ یاقوت احمر (قطرۂ باراں)

عام خیال یہ ہے کہ آفتاب، جب کسی پتھر پر چالیس برس تک متصل طلوع ہوتا رہتا ہے تو وہ یاقوت بنجاتا ہے، عنصری کہتا ہے، کہ آفتاب دراصل معشوق کے

چہرے کا رنگ چراتا ہے، اور یاقوت کو دیدیتا ہے،

گھوڑے کی تعریف

زمانِ گذشتہ است کش در نیابی — چو بگذشت از پیش چشم تو دیگر

بہ رجعت بر آں گونہ باشد کہ گوئی — ہمے باز گردد زمانہ مکرر

یعنی جب یہ گھوڑا، سامنے سے نکل جاتا ہے، تو گویا گذرا ہوا زمانہ ہے، جس کو تم پا نہیں سکتے، اور جب چکر لگا کر آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ زمانہ نے پلٹا لیا،

فرخی

علی نام، ابوالحسن کینت، فرخی تخلص، سیستان وطن، باپ کا نام قلوغ تھا، جو امیر خلف بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں ملازم تھا، بچپن میں ادب اور موسیقی کی تعلیم پائی، چنانچہ چنگ بجانے میں کمال پیدا کیا، معاش کی یہ صورت تھی کہ ایک زمیندار کی ملازمت کرتا تھا، جس کے معاوضہ میں سالانہ دو سو کیل غلّہ اور سو درہم مقرر تھے، یہ مختصر سی آمدنی اسکی سادہ زندگی کیلئے کافی تھی، لیکن چند روز کے بعد اس نے امیر خلف کی ایک لونڈی سے شادی کی جسکی وجہ سے خرچ بڑھ گیا، آقا سے تحریری درخواست کی کہ تنخواہ میں ۵۰ درم کا اضافہ کر دے اور غلّہ کی مقدار دو سو کیل کے بجائے تین سو کر دی جائے، آقا نے عرضی کی پشت پر لکھدیا کہ اسقدر حاضر ہی اور اس سے زیادہ کا مجھکو مقدور نہیں،

فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا، اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدردانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے، اسلئے اسکو خیال ہوا کہ اس ذریعہ سے یہ مشکل حل ہوگی، چنانچہ لوگوں سے پوچھتا رہتا تھا کہ اس فن کا کون بڑا قدردان ہی،

ابوالمظفر چغانی اس زمانہ میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا، اور نہایت فیاض طبع اور قدردان سخن تھا، فرخی اسکی فیاضی اور قدردانی کا شہرہ سنکر چغان میں آیا، چنانچہ ایک قصیدہ کی ابتدا اس واقعہ سے کی ہی،

با کاروانِ حلّہ برفتم زسیستاں | باحلۂ تنیدہ ز دل بافتہ زجاں

ابو المظفر کو گھوڑوں سے بہت شوق تھا، اور بڑے اہتمام سے انکی پرداخت و تربیت کرتا تھا، اٹھارہ ہزار گھوڑیاں اور بچھیڑے ہمیشہ چراگاہ میں رہتے تھے، سال میں ایک دفعہ ان بچھیڑوں کا جائزہ لیتا تھا، اور ران کو داغ کرتا تھا، فرخی جب بلخ پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابو المظفر داغگاہ میں گیا ہے، لیکن خوش قسمتی سے عمید اسعد جو ابو المظفر کا مختار کل تھا، موجود تھا، فرخی اسکی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ شاعر ہوں، عمید نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو فرخی کے چہرہ مہرہ ہیئت وضع قطع کسی چیز کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، بھدّا ڈیل ڈول، ڈھیلا ڈھالا کرتا جس کے دونوں طرف چاک، سر پر بڑا سا پگڑ، سخت متعجب ہوا تاہم حسنِ اخلاق کے لحاظ سے کہا کہ میں تمکو امیر کے دربار میں لے چلونگا، لیکن پہلے داغگاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ لاؤ، اسکے ساتھ داغگاہ کی صورت کا نقشہ کھینچکر دکھایا کہ کوسوں تک سبزہ زار ہوتا ہی، جابجا چشمے بہتے ہیں، بے تکلف احباب مل بیٹھتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں شراب پیتے جاتے ہیں، بادشاہ ایک ہاتھ میں پیالہ دوسرے میں کمند لیکر بیٹھتا ہے، شراب پیتا جاتا ہی، اور لوگوں کو گھوڑے انعام دیتا جاتا ہے،

فرخی نے رات بھر میں قصیدہ تیار کرکے صبح کو عمید کے سامنے پڑھا،

چوں پرند نیلگوں برروے پوشد مرغزار | پرنیانِ ہفت رنگ اندر سرآرد کوہسار
خاک را چوں نافِ آہو مشک زاید بیقیاس | بید را چوں پرطوطی برگ روید بےشمار
دوش وقت نیمشب بوے بہار آورد باد | حبذا باد شمال و فرخا بوے بہار
باد گوئی مشک سودہ دارد اندر آستیں | باغ گوئی لعبتان جلوہ دارد درکنار

نسترن لولوے بیضا دارد اندر مسلہ ارغواں لعل بدخشاں دارد اندر گوشوار

باغ بوقلموں لباس و شاخ بوقلموں نمائے آب مروارید گون و ابر مروارید بار

داغگاہ شہریار اکنوں چناں خرم شود کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار

سبزہ اندر سبزہ بینی چوں سپہر اندر سپہر خیمہ اندر خیمہ بینی چوں حصار اندر حصار

ہر کجا خیمہ است خفتہ عاشقے با دوست مست ہر کجا سبزہ است شاداں یارے از دیدار یار

سبزہ ہا بر بانگ چنگ مطرباں چرب دست خیمہا بر بانگ نوش ساقیانِ مے گسار

عاشقاں بوس و کنار و نیکواں ناز و عتاب مطرباں رود و سرود و خفتگاں خواب خمار

بر درِ پردہ سرائے خسروِ پیروز بخت از پے داغ آتشے افروختہ خورشید وار

داغہا چوں شاخہائے بسد یاقوت رنگ ہر یکے چوں ناردانہ گشتہ اندر زیر نار

ریدکان خواب نادیدہ مصاف اندر مصاف مرکبانِ داغ ناکردہ قطار اندر قطار

روئے ہاموں سبزہ چوں گردونِ ناپیدا کراں روئے صحرا، سادہ چوں دریائے ناپیدا کنار

اندراں دریا سماری واں سماری جانور اندریں گردوں ستارہ واں ستارہ بیدار

خسروِ فرخ سیر، بر بارہ، دریا گذر با کمند اندر میان دشت چوں اسفندیار

گردنِ ہر مرکبے چوں گردنِ قمری بہ طوق ز کمندِ شہریارِ شہرگیرِ شہردار

ہر کرا اندر کمند شصت بازی، در فگند گشت نامش بر سرین و شانہ و روئش نگار

روز یک نیمہ کمند و مرکبان تیز تگ نیم دیگر مطرباں و بادۂ نوشیں گوار

عمید نے فرخی کو ساتھ لیا، اور ابوالمظفر کے پاس جا کر اِس تقریب سے پیش کیا کہ دقیقی

کے بعد آج تک اس پایہ کا شاعر نہیں پیدا ہوا، یہ کہکر سارا واقعہ بیان کیا، ابوالمظفر نے فرخی کو دربار میں مناسب موقع پر جگہ دی، شراب کا دور چل رہا تھا، دو تین دور ہو چکے تو فرخی اٹھا، اور دردآمیز لہجہ میں یہ قصیدہ پڑھا ع باکاروانِ حلّہ برفتم زسیستاں، ابوالمظفر خود شاعر تھا، حد سے زیادہ مسرور ہوا، اور فرخی سے کہا کہ ہزار کمیت بچھیرے سامنے ہیں، جس قدر تم سے پکڑے جاسکیں سب تمہارے ہیں، فرخی شراب سے بدست تھا فوراً اٹھا، دستار سر سے پھینک بچھیروں کی قطار میں گھس گیا، وہ بھاگ کر ادھر ادھر پھیل گیے، فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، تھک کر چور ہو گیا، اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا، صبح کو دن چڑھے اُٹھا، ابوالمظفر نے صبح کی نماز سے فارغ ہو کر فرخی کو دربار میں طلب کیا، اور اسپ خاصہ، ایک خیمہ، تین شتر، پانچ غلام، اور پہننے کے کپڑے انعام دیئے، دریافت سے معلوم ہوا کہ فرخی نے جس گلہ پر ہاتھ ڈالا تھا، اس میں بیالیس بچھیرے تھے، ابوالمظفر نے وہ بھی انعام میں دے دئے، چند روز کے بعد فرخی بڑے سروسامان سے سلطان محمود کے دربار میں پہونچا، سلطان نے نہایت قدردانی کی اور شعراے خاص میں داخل کیا[1]، ایک موقع پر اسپ خاصہ عنایت کیا، تو فرخی نے یہ اشعار شکرگذاری میں لکھے،

اسپے کہ چناں شاہ دہد اسپ نباشد
تاجے بود آراستہ از لولوے شہوار

---

[1] یہ تمام واقعہ اگرچہ تمام تذکروں میں منقول ہے، لیکن سب سے زیادہ تفصیل چار مقالہ میں ہی، اور میں نے گویا اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہی،

دشمن کہ بریں ابلقِ رہوار مرا دید | بے صبر شد و کرد غمِ خویش پدیدار

اس وقت تک باوجود تقرب اور منصبِ ندامت کے فرخی کو دربار میں کمربند باندھنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ لباس امرائے فوج کے ساتھ مخصوص تھا، فرخی نے نہایت خوبی سے اس قصیدہ میں اس عہدہ کی آرزو کی ہے،

گفتا کہ بہ میران و بہ سرہنگان مانی | امروز کلاہ و کمرت باید ناچار
گفتم کہ چہ دانی کہ شبِ تیرہ چہ زاید | بشکیب و صبوری کن تا شب بہ نہد بار
من تنگدلی پیشہ نگیرم کہ بزرگاں | کس را بہ بزرگی نرسانند بیک بار

یعنی دشمن نے مجھ سے کہا کہ ابتو تمھارا ٹھاٹھ امرا کا سا ہے، اب کمربند و کلاہ بھی ملنا چاہئے، میں نے کہا تجھکو کیا خبر ہے کہ کل کیا ہوگا؛ جس نے مجھکو اسپ خاصہ کے قابل سمجھا وہ اسکا مستحق بھی سمجھے گا، میں دل گرفتہ نہیں ہوتا کیونکہ سلاطین کا یہ دستور نہیں کہ کسی کو ایک دم سے بڑے رتبہ پر پہنچا دیں، بالآخر فرخی کی دولت و جاہ کی یہ نوبت پہنچی کہ جب اسکی سواری نکلتی تھی تو بیس زریں کمر غلام رکاب میں چلتے تھے،

ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدردان تھا، اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا، ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہانتک کہ فرخی کا دربار بند کر دیا، فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے، بالآخر سلطان صاف ہوگیا، اور فرخی بدستور دربار میں جانے آنے لگا،[1]

[1] مجمع الفصحا،

اس زمانہ کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے، کہ شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے، اس میں علانیہ ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا، فرخی ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

امیر جنگجو ایاز اویماق،	دل و بازوے خسرو روز بیکار
زنانِ پارسا از شوق گردند	بہ کابین کردنی او را خریدار
نہ برخیرہ بدو دل داد محمود	دلِ محمود را بازی مپندار
جز او در پیش سلطاں نیز کس بُود	جز او سلطاں غلاماں داشت بسیار
اگر چوں میر یک تن بود آنجا	نہ چندیں بُد مرا و را گرم بازار

عضاری نے محمود کی فرمائش سے ایاز کی تعریف میں دو شعر لکھکر پیش کیے تو محمود نے دو ہزار اشرفیاں انعام میں دلوائیں، چنانچہ عضاری ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

مرا دو بیت بفرمود شہریار جہاں	براں صنوبر عنبر عذار مشکیں خال
دو بدرہ زر بفرستاد و دو ہزار درم	برغم حاسد تیمار بدسگال نکال

فرخی نے صنائع و بدائع شعری میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا ترجمان البلاغہ نام ہے، رشید الدین وطواط نے حدائق السحر میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "لغو کتاب ہے" بظاہر تعجب ہوتا ہے کہ ایران کے شعرا ابتدا ہی سے صنائع و بدائع کی طرف کیونکر مائل ہوئے، لیکن حقیقت میں یہ تعجب کی بات نہیں، شاعری کا جو نمونہ فارسی شعرا کے پیش نظر تھا وہ عربی شاعری تھی، عرب میں خود اس زمانہ میں صنائع و بدائع کی بدعت ایجاد ہو چکی

تھی، اور عبد اللہ بن معتز کی کتاب البدیع جو اس فن کی پہلی کتاب تھی، گھر گھر پھیلی ہوئی تھی، تاہم فرخی کی سلامت روی دیکھو کہ اس نے صنائع و بدائع پر کتاب لکھی لیکن خود ان تکلفات سے آزاد ہے، فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی،

کلام پر رائے | فرخی کا کلام کا عام جوہر، زبان کی صفائی، اور سلاست و روانی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں اُس نے زبان کو اس قدر صاف کر دیا کہ ہزار برس گذر چکے لیکن آج کی زبان معلوم ہوتی ہے، قاآنی کا بڑا اعجاز یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قصائد میں ہر قسم کے واقعات اس طرح بے تکلف ادا کرتا جاتا ہے گویا دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں، فرخی سے اس کا موازنہ کرو، صاف نظر آئیگا کہ جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی فرخی کو اس وقت حاصل تھی، رمضان اور عید کے ذکر میں قاآنی کا ایک مشہور قصیدہ ہے،

دلگا! ہیچ خبر داری کاں ترک پسر
بامن از ناز دگر بار چہ آورد بہ سر

بلب نوشیں آمد شب دوشیں بسرا
حلقہ بر در زد و بر جستم و بکشودم در

گفت قاآنیکا! تاکے پسی بہ سرا
خیز کز روزہ شد اوضاع جہاں زیر و زبر

غالباً مست چناں خفتۂ اندر رمضان
کز مہ روزہ و از روزہ ترانیست خبر

گفتمش اے ترک دلآرام مگر باز آمد
رمضان آں مہ شاہد کش و زاہد پرور

گفت آرے رمضاں مد و گوید کہ بہ خلق
رقم از بار خدا دارم و از پیغمبر

وقت آں آمد کاں اعظلک انبعد نماز
ہمچو بوزینہ بہ یکبار جہد از منبر

اسی بحر و قافیہ میں فرخی کا قصیدہ دیکھو،

رمضاں رفت و رہی دور گرفت اندر بر — خنک آں کس رمضاں را بہ سزا برد بسر

بس گرامی بود ایں ماہ ولیکن چہ کنم — رفتنی رفتہ بہ در روے نہادہ بہ سفر،

رمضاں گر بشد از راہ فراز آمد عید — عید فرخندہ ز ماہِ رمضاں نیکو تر،

گاہ آں آمد کز شادی بر گردد دل — وقت آں آمد کز بادہ گراں گردد سر

بادۂ روشن و آسودہ و صافی چو گلاب — ساقی دلبر و شایستہ و شیریں چو شکر

مطربا آں غزلِ نغز دلآویز بیار — ور نہ دانی بشنو تا غزلِ گویم تر

اے دریغا دلِ من کاں صنمِ سیمیں بر — دلِ من بردو مرا از دلِ او نیست خبر

اووے داشت گرامی و دلِ دیگر یافت — کاشکے من دلکے یافتمی نیز دگر،

اسی بحر اور قافیہ میں اس کا ایک اور قصیدہ ہے، جو سراپا محاورہ اور روزمرہ ہے،

ترک بتِ روے من از خواب گراں وار دوسر — دوش مے دادہ است از اوّل شب تا بسحر

میرا پری چہرہ معشوق نیند سے سرگراں ہے، — کل شام سے صبح تک شراب پلاتا رہا ہے

من بچشیم او را دو بار نمودم کہ بخسپ — او ہمی گفت بسر تا برم ایں دور بسر

میں نے دو دفعہ آنکھ سے اشارہ کیا کہ سو رہو — لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ یہ دور تو ختم ہونے دو

شب بسر برد بہ مے دادن و ننشست و نخفت — دل من جست کہ ننشست و بخفت آں دلبر

ساری رات شراب پلانے میں گذاری نہ بیٹھا نہ سویا — یہ میری خاطرداری تھی کہ سویا نہیں اور کھڑا رہا

حیلہ سازد کہ می افزوں خورد از نوبت خویش | ور تواند بخورد نوبت یاران دگر،

چالاکی کرکے چاہتا ہو کہ اپنے حصے سے زیادہ پے | اور اسکے امکان میں ہو تو اوروں کا حصہ بھی اڑائے

کیست آں کو؟ بنہد دل بچنیں خدمت دوست | کیست آن کو؟ نہ کشد بار چنیں خدمت گر

مدح کی تشبیب میں فتوحات کا ذکر کرتا ہے،

خسرو ما بہ شکار ملکاں تاختہ بود | ما ز اندیشۂ او خستہ دل و خستہ جگر

خسرو از راہ در از آمد با نہمت و کام | ملک از جنگ عراق آمد با فتح و ظفر

قلعہ ہا کندہ و بنشادہ بہر شہر سپاہ | جنگہا کردہ و بنمودہ بہر جائے ہنر

دیگر

اے پسر اگر دل من کردہی خواہی شاد | از پس بادہ بمن بوسہ ہمی باید داد

نقل با بوسہ بود، بادہ وہی نقل بدہ | دیر گاہ است کہ ایں رسم نہاد آن کہ نہاد

گر ہمی گوئی بوس از دگرے نیز بخواہ | تو مرا از دگراں بردۂ اے حور نژاد

یہ بھی فرخی کے خصوصیات میں ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے، تو اُس کا اصلی سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے، ایک قصیدہ میں مجلس عیش کی خیالی تصویر کھینچی ہے،

سرو ساقی و ماہ رود نواز | پردۂ بستہ دررہ شہناز

باجا | وطن، ایک راگنی کا نام ہے

زخمہ رود زن نہ پست و نہ تیز | زلف ساقی نہ کوتہ و نہ دراز

یعنی سر نہ بہت اونچے نہ بہت نیچے

مجلسے خوب خسروانی وار | از سخن چین، تہی واز غماز

بادشاہانہ

بوستانے ز لالہ و سوسن | ہمچو روے تدرو و سینۂ باز

دوستاں مساعد و یک دل   کہ تواں گفت پیش ایشاں راز

ماہ روے نشاندہ اندر پیش   خوش زبان و موافق و دمساز

جعد او بر پرند گشتی گیر،   زلفِ او بر حریر چوگاں باز

زلف   یعنی چہرہ

بادۂ چوں گلاب روشن و تلخ   ماندہ در خم زگاہِ آدم باز

وقت

ازچنیں مجلس و چنیں بادہ   ہیچ زاہد مراندارد باز

سلطان محمود نے ایک باغ بڑے سروسامان سے تیار کرایا تھا، گلہاے رنگ رنگ کے تختہ زار، جابجا جدولیں، دوطرفہ سرو و شمشاد، ایک طرف مصنوعی خوش نما جھیل، اس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں کانوں میں موتی کے آویزے پہنے تیرتی پھرتی تھیں، تصویر خانہ میں محمود کی مجسم تصویریں، کہیں برچھا ہاتھ میں لئے ہوئے شکار کھیل رہا ہے، کہیں بزمِ عیش میں بیٹھا ہے اور شراب کا دور چل رہا ہی، فرخی اس باغ کا نقشہ دکھاتا ہے،

بہ فرخندہ فال و بہ فرخندہ اختر   زنو باغ میخواست شاہِ مظفر

درو مسکنِ ماہرویانِ مجلس   درو خانۂ شیر گیرانِ لشکر

کجا جاے بزم است گلہاے بیحد   کجا جاے صید است مرغانِ بیمر

ہر نیچ   بے شمار

رواں گرد برگردِ رغنا درختاں   تدرواں، آموختہ مادہ و نر

یکے کاخ شاہانہ اندر میانش   سرِ کنگرہ برکنارِ دو پیکر

بہ کاخ اندروں صفہاے مصفا   درصفہا ساختہ سوے منظر

یکے ہمچو دیبائے چینی منقش — یکے ہمچو ارژنگ مانی مصوّر

نگاریدہ در چند جا مر مصوّر — ستہ شرق را اندراں کاخ پیکر

(سلطان محمود)
بہ یکجائے در صید در دشت وبیں — بہ یک جائے در بزم بر دست ساغر

(نیزہ) (نہر)
ازاں کاخ فرخ چو اندر گذشتی — یکے رود، آب اندرو ہمچو شکر

نہ چرخ است مر جزائے او چوں ستارہ — نہ ابر ست مر آوائے او ہمچو تندر

(آواز)
اگر بگذرد برسرش مرغ موجش — بیالاید اندر ہوا مرغ را پر

بدنیاں بہ باغ اندراں تند رودے — یکے ژرف دریا مراں را برابر

(نہر)
بدو اندراں ماہیاں چوں عروساں — بگوش اندروں پر گہر حلقۂ زر

مکانے برآوردہ پہلوئے دریا — بداں، تا براں می خورد شاہ صفدر

یمینِ دول شاہ محمود غازی — امینِ ملل خسروِ بندہ پرور

ابو المظفر چغانی کے دربار میں جب اس نے جانا چاہا ہے تو راہ میں بہت صعوبتیں پیش آئیں، قصیدہ میں تمام حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں، اور دیکھو مدح کی تمہید کا پہلو کس خوبصورتی سے پیدا کیا ہے،

رہے صعب و شبے تاریک و تیرہ — ہوا چوں قیروزہ ہاموں مقیّر

ہوا اندودہ رخسارہ بدودہ — سپہر آراستہ چہرہ بہ گوہر

(سیاہی)
گماں بردی کہ باد اندر پراگند — برو سے سبز دریا برگ عبہر

(یعنی آسمان، یعنی ستارے)
مجرہ چوں بہ دریا راہ موسے — کہ اندر قعر او بگذشت لشکر
(کہکشاں) (زود نیل)

زمانے رفت و سر بر زد مہ از کوہ — برنگ روے مہجوراں مزعفر

بہ ریگ اندر ہمی شد بارہ تازاں — چو در غرقاب مرد آشنا را

تنکم مالاں (گھوڑا) بہ ہاموں در ہمی رفت — شدہ ہاموں بزیر آں مقعر (تیراک)

دمندہ اژدہاے پیشیم آمد — خروشان و بے آرام[1] و زمیں در

گرفتہ دامن خاور (مشرق) بدنبال (یعنی دریا) — نہادہ بر کرانِ باختر سر

بہ بارانِ بہاران گشتہ فربہ — بگرماے حزیراں گشتہ لاغر (جیٹھ)

مدیح شاہ بر جیحوں بخواندم — برآمد بانگ از آب (مہینہ کا نام) اللہ اکبر

کہ من شاگرد کفّ رادادیم (فیاض) — کہ تو مدحش ہمی برخوانی از بر

بفر شاہ از جیحوں گذشتم — یکے موے از تنِ من ناشدہ تر

وزاں جا تا بدیں درگاہ گفتی — کشادستند مر فردوس را در

ہمہ بالا پُر از دیباے رومی — ہمہ پستی پُر از کالاے ششتر (نام شہر)

تو گفتی ہیکل (بلندی) زر دشت گشتہ است — زبس لالہ ہمہ صحرا سراسر

فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی، اس سے پہلے بھی یہ صفت موجود تھی، لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کرکے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کردی، اور آیندہ نسلوں کے لئے راستہ صاف کردیا، اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ

[1] بے کی ی ظاہر نہیں ہوتی اور یہ قدما کی زبان ہے،

کہ ایک مورخ بے کم وکاست ٹھیک حالات لکھتا جاتا ہے۔ سومنات کی فتح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں ایک ایک مقام کا نام اور اُس کا حال بیان کیا ہے،

گمان کہ برد؟ کہ ہرگز کسے زراہ طراز ... بہ سومنات برد لشکر و چنیں لشکر

یہ کس کو خیال تھا کہ کوئی شخص طراز کی راہ سے ... سومنات پر فوج لیجا سکتا ہے اور فوج بھی ایسی فوج

ہوائے آں وزم و بادِ آں چو دودِ جحیم ... زمین آں سیہ و خاکِ آں چو خاکستر

راستہ میں ہوا ایسی خراب جیسے دوزخ کا دھواں ... زمین بالکل سیاہ اور خاک جیسے راکھ

ہمہ درخت، ومیانِ درخت خار کشن ... نہ خار بلکہ سناں خلندہ و خنجر

تمام جھاڑیاں اور جھاڑیوں کے کانٹے ... کانٹے نہیں بلکہ چبھنے والی برچھیاں اور خنجر

نہ مرد را سرِ آں کاندراں نہادے پے ... نہ مرغ را دلِ آں وازاں کشادے پر

نہ آدمی کو یہ جرأت ہوتی تھی کہ قدم رکھے ... نہ پرند کو یہ ہمت ہوتی تھی کہ اُڑ سکے،

عجب تر اینکہ ملک راہمی چنیں گفتند ... کہ اندریں رہ ماردوسر بود دیمر

سب سے بڑھکر عجیب بات یہ کہ لوگوں نے بادشاہ سے کہا تھا ... کہ اس راہ میں دو موہنے سانپ بے شمار ہیں

بہ شب چو خفتہ بود مرد سر برآرد مار ... ہمی کشد نفس خفتہ تا برآید خور

آدمی جب رات کو سو جاتا ہے تو یہ سانپ نکلتے ہیں ... اور دھوپ نکلنے تک پھنکار مارتے ہیں

چو خور برآمد و گرمی بہ مرد خفتہ رسد ... ببک نہ گردد ازاں خواب تا گہ محشر

جب آفتاب نکل آتا ہے اور آدمی کے بدن کو گرمی پہنچتی ہے ... تو آدمی ٹھنڈا ہو کر رہجاتا ہے اور قیامت تک اٹھ نہیں سکتا

بدریں درشتی و زشتی رہے کہ کردم یاد ... گذشت شاہ بتوفیق خالق اکبر

ایسے سخت اور خراب استہ سے جس کا بیان نہیں کیا ٭ بادشاہ خدا کی توفیق سے گذر گیا

بزود بہر پس ماندگان و گم شدگان ٭ میانِ بادیہ ہا حوضہائے چوں کوثر

پیچھے رہ جانے والوں کے لئے ٭ جنگل میں حوض تیار کرا دئے تھے

بداں رہ اندر چنیں حصار و شہر بزرگ ٭ خراب کرد، و کند اصل ہر یک از بن و بر

سینکڑوں قلعے اور شہر جو راہ میں پڑے ٭ برباد کر دیئے، اور انکی جڑ کھود کے پھینک دی

نخست لار دہ کز روئے برج و بارۂ او ٭ چو کوہ کوہ فرو ریخت آہن و مرمر

پہلا قلعہ لاردہ تھا جس کے برج اور دیوار سے ٭ پہاڑوں کے برابر لوہا اور پتھر برستا تھا

چہ مندھر کہ در مندھر حوضے بود ٭ چنانکہ خیرہ شدے اندرو دو چشم فکر

اور مندھر کا کیا کہنا، جسمیں ایک ایسا حوض تھا ٭ جسکو دیکھکر عقل کی آنکھوں کو چکا چوندھ لگجاتی تھی

فراخ پہنا حوضے بہ صد ہزار عمل ٭ ہزار بتکدہ خرو گرد حوض اندر،

نہایت چوڑا حوض جسمیں ہزاروں کاریگریاں کام میں آئیں ٭ ایک ہزار چھوٹے چھوٹے بتخانے اسکے اندر تھے

یکے حصار قوی بر کرانِ شہر و درو ٭ ز بت پرستاں گرد آمدہ یکے محشر

شہر کے کنارے پر ایک قلعہ تھا، ٭ جس میں بت پرست ٹھٹ کے ٹھٹ اکٹھے تھے،

فریضہ ہر روز آں سنگ را بشستندے ٭ بہ آب گنگ و بہ شیر و بزعفران و شکر

اُس بت کو لازمی طور پر ہر روز ٭ گنگا کے پانی اور دودھ اور زعفران اور شکر سے دھوتے تھے

شکار میں قمرغہ کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے، یعنی کسی بڑے جنگل میں جہاں کثرت سے شکاری جانور ہوتے تھے، چاروں طرف آدمیوں کی صفوں کو پھیلا کر، ایک

بڑا حلقہ قائم کر لیتے تھے، پھر حلقہ کو بتدریج چھوٹا کرتے جاتے تھے یہانتک کہ دو چار میل کی وسعت رہجاتی تھی، اور تمام جانور سمٹ کر اتنے ہی دور میں آجاتے تھے پھر ہر طرف سے اس پر حملے ہوتے تھے، اکثر مارے جاتے، بہت سے زندہ بھی گرفتار ہوتے، سلطان محمود بھی اس طریقہ سے اکثر شکار کھیلا کرتا تھا، فرخی نے ایک قصیدہ میں اسکا سماں دکھایا ہے۔

اے زجنگ آمدہ و روے نہادہ بہ شکار — تیغ و تیر تو بسیر نگر دیدہ زکار
ہرچہ در ایراں پرندہ و دد دامی بود — ہمہ را گرد بہم کردی در یک دیوار
گرد ایشاں پرہ بربستی مانند عقاب — زاں بروں رفت ندانست یک ازیشاں ہیچ کنار
در دوید ندسوے تو بہ قطار از سرِ کوہ — باز گسترد ے در دامن کہ شاں بہ قطار
بامداداں ہمہ کہسار پُر از وحشی بود — شامگاہاں ہمہ پرداختہ بود از کہسار
در زمانے ہمہ آں دشت ز خون دد و دام — لعل کردے چو گلستانے ہنگام بہار
خواہی من کہ بجا یستے بہرام امروز — تا بدید ے و بیاموختے از شاہ شکار

واقعہ نگاری کا اندازہ فرخی پر اس قدر غالب ہے کہ قصائد کی تشبیب میں جو در اصل غزل ہوتی ہے، یہ انداز قائم رہتا ہے، مثلاً ایک قصیدہ کی تشبیب مین لکھتا ہی،

دوش متواریک بہ وقت سحر — اندر آمد بہ خیمہ آں دلبر
چنگ در بر گرفت و خوش بنواخت — واز دو بُسَّد فرو فشاند شکر
پنج شش جام خورد و پرگل گشت — روے آں روے نیکواں یکسر
مست گشت و بہر خفتن ساخت — خویشتن را کنار من بستر

زلف مشکیں بروے در پوشید	دستِ من زیر کرد و زلف زبر
زلف او را بدست بگرفتم	زنخ گرد او بدستِ دگر
راست گفتی، گرفتہ بُد چاکر	گوی و چوگان شہ بدست اندر

دیکھو تشبیب سے مدح کی تمہید کس خوبی سے پیدا کی ہے،

فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں، اور جس قدر ہیں معمولی درجہ کے ہیں، لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا، وہ نہ صرف پُر درد اور پر تاثیر ہے، بلکہ اس فن کے تمام اُصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں،

مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں،

۱۔ ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اُس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اُٹھ گیا،

۲۔ اسکے مرنے سے مُلک میں جو رنج و ماتم برپا ہے اس کا ذکر کیا جائے،

۳۔ اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو کہ انتہائے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اس کے مرنے کی بھی خبر نہیں، اور وہ ابتک اسکو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا تھا،

فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں، اس کے ساتھ الفاظ، بندش اور طرز ادا اس قدر موثر ہے کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے،

شہر غزنیں نہ ہمان است کہ من دیدم پار	چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شد کار

غزنیں اب وہ نہیں ہے جو میں نے پارسال دیکھا تھا

کو بہا بینم پُر شورش و سرتا سر کوے

دیکھتا ہوں کہ تمام گلیوں میں شور برپا اور اس سرے سے اس سرے تک

مہتراں بینم بر روے زناں ہمچو زناں

بڑے بڑے سردار عورتوں کی طرح منہ پیٹ رہے ہیں

ملک امسال دگر باز نیامد زغزا

شاید اس سال بادشاہ جہاد سے واپس نہیں آیا

سیرمے خوردہ مگر دی، کہ بخفت ست امروز

غالباً رات بہت شراب پی گیا اسلئے ابتک سو رہا تھا

خیز شاہا! کہ رسولان شہاں آمدہ اند

اے بادشاہ اُٹھ! بادشاہوں کے قاصد آئے ہیں

کہ تواند؟ کہ برانگیزد از یں خواب ترا

کس کی طاقت ہے کہ تجھکو اس نیند سے جگا سکے

خفتن بسیار اے خواجہ خوے تو نبود

اے آقا! دیر تک سونا تو تیری عادت نہ تھی

یکدمک بایدے درخانہ بایست نشست

ذرا دیر تو تجھکو دربار میں آکر بیٹھنا چاہیے تھا

اس سال کیا پیش آیا کہ وہ حالت بالکل بدل گئی

ہمہ پر جوش و جوشن در و پر خیل و سوار

جوشن پوش گھوڑوں اور سواروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ہیں

چشمہا کردہ زخوں نابہ برنگ گلنار

اور انکی آنکھیں خون سے رنگین ہو گئی ہیں،

دشمنے روے نہادست درین شہر و دیار

اس وجہ سے کہ ملک میں کوئی دشمن آپہنچا ہے

دیر تر خاست مگر رنج رسیدش ز خمار

چونکہ خمار کی تکلیف ہے، اسلئے آج دیر میں اُٹھیگا

ہدیہا دارند او ردہ فراوان و نثار

جو کثرت سے ہر قسم کے ہدیے اور تحفے لائے ہیں،

خفتنی خفتنی، کز خواب نگردی بیدار

تو ایسی نیند سویا کہ اب پھر نہ جاگے گا،

ہیچ کس خفتہ ندیداست ترا زیں کردار

کسی نے اسی طرح تجھ کو سوتے نہیں دیکھا تھا

تا بدیدندے روے تو عزیزان و تبار

کہ عزیز اور قریب تیرا چہرہ دیکھ لیتے،

به حصار از فزع و بیمِ تو رفتند شہاں | تو شہا از فزع و بیم کہ رفتی به حصار؟
تیرے ڈر سے تو تمام سلاطین قلعوں میں بھاگ کر چھپ گئے | تو کس کے ڈر سے قلعہ میں بھاگ کر چھپا ہی
شعرا را به تو بازار برافروخته بود | رفتی و با تو به یکباره برفت آں بازار
تیرے دم سے شاعروں کا بازار گرم تھا | تو گیا، اور وہ بازار بھی جاتا رہا،

صنائعِ شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صنعت ہے، فرخی اس صنعت کا استعمال نہایت خوبی سے کرتا ہے،

مشہور ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب بہشت میں گیہوں کھا لیا تو ان کے بدن کے کپڑے خود بخود اتر گئے اور وہ بالکل برہنہ رہ گئے، فرخی نے اس واقعہ سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا،

مگر درخت شگوفہ گناہِ آدم کرد | کہ از لباس چو آدم ہمی شود عریاں

نوشیرواں نے زنجیر عدل قائم کی تھی، یعنی ایوانِ شاہی میں ایک زنجیر لٹکا دی تھی کہ جس کسی کو کچھ شکایت ہو وہ زنجیر آکر ہلا دے، زنجیر کے ہلنے کے ساتھ وہ کسی حالت میں ہوتا، باہر نکل آتا تھا، دیکھو فرخی اس سے مضمون پیدا کرتا ہے،

من چو مظلوماں، از سلسلہ نوشیرواں | اندر آویختہ زاں سلسلۂ زلفِ دراز

مشہور ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے تخت پر بیٹھ کر سیر کیا کرتے تھے، فرخی نے اس سے تشبیہ کا کام لیا،

پے بازیِ گوے شد خسرو | بر یکے تازی اسپ کہ بیکر،

راست گفتی بہ باد[۱] بر جسم بود | گر بود باد را استمام بہ زر

حضرتِ موسیٰؑ جب رودِ نیل پر پہنچے تو دریا بیچ میں سے پھٹ کر سیدھی سڑک نکل آئی جس سے تمام بنی اسرائیل پار اُتر گئے، فرخی کہکشاں کی تعریف میں کہتا ہے،

مجرہ چوں بدریا راہ موسیٰ | کہ اندر قعرِ او بگذشت لشکر

صنائع و بدائع، عارضِ سخن کے داغ ہیں تاہم چونکہ اس زمانہ میں اس کا رواج عام ہو چکا تھا، فرخی کے کلام میں بھی یہ داغ پائے جاتے ہیں، لیکن چنداں بدنما نہیں معلوم ہوتے، لف و نشر اور صنعتِ تقسیم کو ایک قصیدہ میں جمع کیا ہے،

در رگ و اندر تن و اندر دل و اندر دو چشم
خواب و صبر و روح و خواں رائے مہ فتاد انقلاب
رنج دارد جائے خون رود دارد جائے روح
عشق دارد جائے صبر و آب دارد جائے خواب
ہشت چیز او برد از ہشت ما یہ ہشت چیز
سال و مہ ایں ہشت چیز ش را ہمیں است اکتساب
حلم او سنگِ زمین و طبعِ او لطفِ ہوا
روئے او دیدار ماہ و دستِ او جودِ سحاب
رسمِ او حسنِ بہار و لفظ او قدرِ شکر
خلقِ او بازارِ مشک و خوئے او بوئے گلاب

[۱] یعنی بر باد،

هشت چیزش را برابر یافتم با هشت چیز
هر یکے زاں ہشت سوے فضل او ردار دمآب
تیغِ او را با قضا و تیر او را با قدر
اسپ او را با سپہر و خشت او را با شہاب
حزم او را با امان و عزم او را با ظفر
لفظ او را با قرآن و حفظ او را با کتاب

صنعتِ سوال و جواب،

بر یخت کہ؟ گل سوری، چہ ریخت؟ برگ چرا؟
ز ہجر لالہ کجا رفت لالہ؟ شد پنہاں
از آب چہ خیزد؟ دُرّ و ازیں چہ خیزد؟ زر
سخا کہ ورزد؟ این و عطا کہ بخشد؟ آں،

فردوسی

حسن بن اسحاق بن شرف نام، اور فردوسیؔ[1] تخلص تھا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ کہیں کہیں وہ اپنا تخلص ابن شرف شاہ بھی لاتا ہے، مجالس المومنین میں بعض مؤرخوں کے حوالہ سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخر الدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے،

فردوسی کا وطن

وطن میں بھی اختلاف ہے، چہار مقالہ میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا، دیباچہ شاہنامہ میں گاؤں کا نام شاداب لکھا ہی، بہرحال اس قدر عموماً مسلّم ہی کہ فردوسی کا وطن طوس کے اضلاع میں تھا، اور یہی مردم خیز صوبہ ہے جس کی خاک نے امام غزالی اور محقق طوسی پیدا کئے،

سنہ ولادت معلوم نہیں، البتہ سالِ وفات سنہ ۴۱۱ھ ہے، اور چونکہ عمر کم از کم ۸۰ برس کی تھی جیساکہ وہ خود لکھتا ہی،

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد — اُمیدم بہ یکبارہ برباد شد

[1] فردوسی کا حال تمام تذکروں میں بہ تفصیل مذکور ہے لیکن سب میں باہم سخت اختلاف ہی ان میں سب سے زیادہ قابل اعتبار چار مقالہ ہے، جس کا مصنف خود نامور شاعر اور فردوسی سے قریب العہد ہی تاہم اس میں بھی سخت غلطیاں ہیں، تیمور کے پوتے بای سنقر نے فضلا سے شاہ نامہ پر جو دیباچہ لکھوایا تھا اس میں فردوسی کی مفصل سوانحعمری ہی، لیکن بعض واقعات ایسے لغو لکھے ہیں کہ اعتبار اُٹھ جاتا ہی، دولت شاہ سمرقندی نے بھی کسی قدر تفصیل سے حالات لکھے ہیں، اور وہ بھی غلطیوں سے خالی نہیں، عربی مصنفین میں سے صرف قزوینی نے آثار البلاد میں اس کا حال لکھا ہے، میں نے ان سب میں سے واقعات لئے ہیں، لیکن جا بجا ان کی غلطیوں کی بھی تصریح کر دی ہی،

اس لئے سالِ ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہئے،

فردوسی کی ولادت

فردوسی جب پیدا ہوا تو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ نوزائیدہ بچے نے کوٹھے پر چڑھ کر نعرہ مارا، اور ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں، صبح کو جا کر نجیب الدین سے جو اُس زمانہ کے مشہور معبّر تھے، تعبیر پوچھی، اُنھوں نے کہا "یہ لڑکا شاعر ہوگا، اور اس کی شاعری کا غلغلہ تمام عالم میں پھیلے گا، سن رشد کو پہنچکر تحصیلِ علوم میں مشغول ہوا اور تمام درسی علوم حاصل کئے، چونکہ آبائی پیشہ زمینداری تھا، اور جس گاؤں میں سکونت تھی، خود اسکی ملک میں تھا، اسلئے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا[1] وہ اطمینان کے ساتھ علمی شغلوں میں بسر کرتا تھا، اور کتب بینی کیا کرتا تھا،

شاہنامہ کی ابتدا اور دربار میں رسائی

یہ واقعہ جس قدر قطعی ہے اسی قدر اس کی تفصیل میں اختلاف ہے، عام روایت یہ ہے کہ فردوسی دادرسی کیلئے محمود کے دربار میں گیا یہاں اسکی شاعری کا جوہر کھلا اور شاہنامہ کی تصنیف پر مامور ہوا، لیکن یہ قطعاً غلط ہی فردوسی نے خود بیان کیا ہی کہ شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ برس صرف ہوئے،

سی و پنج سال از سرای سپنج ... بسے رنج بردم بہ امیدِ گنج
چو برباد دادند گنج مرا ... نبُد حاصلے سی و پنج مرا

اور سلطان محمود کی کل مدتِ سلطنت ۳۱ برس ہی،

شاہنامہ کے دیباچہ میں فردوسی نے خود جو سببِ تصنیف بیان کیا ہی اُس سے

[1] چہار مقالہ صـ ۶۱،

بھی اس روایت کی تکذیب ہوتی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمود کے دربار میں پہنچنے سے بہت پہلے وہ شاہنامہ شروع کر چکا تھا تفصیل ان واقعات کی شاہنامہ کے سبب تصنیف میں آگے آئیگی،

شاہنامہ کی ابتدا

بہر حال اس قدر یقینی ہے کہ فردوسی نے وطن ہی میں شاہنامہ کی ابتدا کی، اور ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا، اسکی سرپرستی کی، ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلان خاں مقرر ہوا چونکہ شاہنامہ کا اب ہر جگہ چرچا پھیلتا جاتا تھا، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی، سلان خاں کے نام حکم پہنچا کہ فردوسی کو دربار میں بھیجدو، فردوسی نے پہلے تو انکار کیا، لیکن پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی، اسلئے راضی ہو گیا، اور طوس سے چل کر ہرات میں آیا، لیکن ادھر درانداز یاں شروع ہو گئیں، دربار کا میر منشی بدیع الدین دبیر تھا اسی نے عنصری[1] سے کہا بادشاہ کو مدت سے شاہنامہ کی تصنیف کا خیال تھا، لیکن دربار کے شعراء میں سے کسی نے اس کی ہامی نہیں بھری، اب اگر فردوسی سے اگر یہ کام بن آیا تو تمام شعرائے دربار کی آبرو خاک میں مل جائیگی، عنصری نے کہا بادشاہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کو الٹا پھیر دیجئے، لیکن اسکی اور تدبیر کرنی چاہئے، چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہے، سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا، لیکن اس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا، اسلئے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع دیدی گئی، فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ

---

[1] دیباچہ نویسوں نے عنصری کیساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے، لیکن رودکی اس سے پہلے سنہ ۳۰۴ھ میں مر چکا تھا،

ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو، اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین دبیر میں شکر رنجی پیدا ہوئی، عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا، بدیع الدین ہی کے مشورہ سے لکھا تھا، اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجئے، عنصری نے جو لکھا، خود غرضی سے لکھا تھا، فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں، یہ اشعار بھی خط میں درج کئے،

بگوشش از سروشم بسے مژدہ ہاست	دلم گنج گوہر زباں اژدہاست
چہ سنجد بہ میزان من عنصری	گیا چوں کشد پیش گلبن سرے

غرض ہرات سے چل کر غزنیں میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا، وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی شہر میں جن لوگوں سے راہ و رسم تھی ان کو اپنے آنے کی اطلاع دی، چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعراء یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے، اور بادہ و جام کا دور چل رہا تھا، فردوسی ادھر جا نکلا، حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا، ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آکر چلا جائیگا، عنصری نے کہا، یہ تہذیب اور آدمیت کے خلاف ہے، آخر رائے قرار پائی کہ رباعی کا ایک مصرع طرح کیا جائے سب اس پر طبع آزمائی کریں، اگر یہ بھی مصرع لگائے تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ خود شرمندہ ہو کر اٹھ جائیگا،

شعرا کا معرکہ

عنصری نے ابتدا کی اور کہا ع "چوں عارض تو ماہ نباشد روشن"

فرخی نے کہا ع " مانند درخت گل بنود در گلشن "

عسجدی نے کہا ع " مژگانت ہمی گذر کند از جوشن "

قافیوں میں شین کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ قافیہ باقی نہیں رہا تھا، فردوسی نے برجستہ کہا ع " مانند سناں گیو در جنگ پشن "

سب نے گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی، فردوسی نے تفصیل بیان کی، اُس وقت تو سب نے اس کو شریکِ صحبت کر لیا، لیکن رشک و حسد، ایشیائی قوموں کا خاصہ ہی، سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار تک نہ پہنچنے پائے،

بعض روایتوں میں ہے کہ یہ مشاعرہ خود سلطان محمود کے دربار میں ہوا تھا۔

سلطان محمود کے ندیموں میں ماہک نام ایک شخص صاحبِ مذاق تھا، اُس سے یہیں باغ میں ملاقات ہو گئی تھی، فردوسی کی شیریں زبانی اور قابلیت دیکھکر گرویدہ ہوا اور اپنے گھر میں لا کر رکھا، کھانے کے بعد فردوسی سے اس کا حال دریافت کیا، اس نے اپنی ساری داستان بیان کی،

یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان نے شاہنامہ کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینبی، عسجدی، منجیک، چنگ زن خرمی، ابوبکر، اسکاف، ترمذی اس کام کے لئے انتخاب ہوئے تھے،

ماہک نے فردوسی سے شاہنامہ کی تصنیف اور شعراء کے انتخاب کا ذکر کیا،

---

۵ یہ دیباچہ شاہنامہ کی روایت ہی، دولت شاہ کا بیان ہی کہ اس امتحان کے بعد عنصری نے فردوسی کی تحسین کی، اور خود دربار شاہی میں اسکو بیجا کر پیش کیا،

فردوسی نے کہا میں بھی شعر کہتا ہوں موقع ہو تو دربار میں میرا بھی ذکر کر دینا، ماہک نے اسی دن دربار میں جاکر فردوسی کی تقریب کرنی چاہی، لیکن موقع نہ ملا اس طرح ایک ہفتہ گذر گیا، ایک دن ماہک نے دربار سے آکر بیان کیا کہ آج تمام شعراء دربار میں حاضر تھے اور شاہنامہ کی مختلف داستانیں سنائی جا رہی تھیں، عنصری نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی تھی، جب یہ دو شعر پڑھے،

ہر آنکہ کہ تشنہ شدی تو بخوں	بیالودی ایں خنجرِ آبگوں
زمانہ بخونِ تو تشنہ شود	بہ اندام تو موے دشنہ شود

دربار میں پہنچنے کی تقریب

تو سلطان محمود نے نہایت پسند کیا، اور حکم دیا کہ عنصری ہی اس خدمت کے لئے مقرر کیا جائے، فردوسی اُس وقت چپکا ہو رہا، اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی، رات کو جب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری سے پہلے شعراء نے رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہے، چنانچہ خود میرے پاس ایک نظم موجود ہے، جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت نہیں، یہ کہکر نظم حوالہ کی، سرنامہ تھا،

کنوں خورد باید مے خوشگوار	کہ می بوے مشک آرد از جویبار
ہوا پُر خروش و زمیں پُر ز جوش	خنک آنکہ دل شاد دارد بہ نوش
ہمہ بوستاں زیر برگ گل است	ہمہ کوہ پُر لالہ و سنبل است

ماہک نے سلطان محمود کی خدمت میں جاکر تمہید کے ساتھ پیش کی، محمود نے پوچھا کہ یہ جواہر کہاں سے ہاتھ آئے، ماہک نے فردوسی کا نام لیا، اس وقت طلبی ہوئی، محمود نے نام و نشان

پوچھا فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں، محمود نے اس کے حالات پوچھے، اور اسی سلسلہ میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے، اور کس نے آباد کیا، فردوسی نے تمام واقعات بیان کیے، محمود نے شعرائے سبعہ کو بلوایا اور فردوسی کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ رستم وسہراب کی داستان اسی نے نظم کی ہے، فردوسی نے اس کے اشعار سنائے تو سب حیرت زدہ رہ گئے، محمود نے خلعت عطا کیا، شعراء نے تحسین کی صدا بلند کی، عنصری نے بڑھ کر، فردوسی کے ہاتھ چوم لیے، اس زمانہ میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، محمود نے فردوسی سے فرمائش کی کہ ایاز کے سبزہ وخط کی تعریف میں کچھ کہے، فردوسی نے برجستہ کہا،

بدیہہ گوئی کا امتحان

مست است بتا! چشم تو و تیر بدست	بس کس کہ ز تیر چشم مست تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ، عذرش است	کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

یعنی معشوق کی آنکھیں مست اور تیر بکف ہیں، اُن تیروں نے ہزاروں کے دل چھلنی کر دیئے ہیں، اس لئے اُن سے بچنے کے لئے رخساروں نے زرہ پہن لی ہے؛ (خط کو زرہ سے تشبیہ دی ہے) کیونکہ مست سے سبھی ڈرتے ہیں، خصوصاً جب اس کے ہاتھوں میں تیر ہو،

شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد ہوئی،

محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی، ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ فردوسی کو ایوانِ شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز وسامان سے آراستہ ہو، اور آلاتِ جنگ، اسلحہ عرب، شاہانِ عجم اور بہادروں اور

پہلوانوں کے مرقعوں اور تصویروں سے سجا دیا جائے، ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا، اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دیدی جایا کریں، لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا، اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائے گی تو ایک ساتھ لونگا،

فردوسی جب وطن میں تھا تو اکثر ایک چشمہ کے کنارے بیٹھا کرتا، اور آبِ رواں کی سیر سے لطف اٹھاتا، چشمہ کے اوپر بند تھا، جو برسات کے زمانہ میں ٹوٹ جاتا تھا، اور اس وجہ سے پانی گدلا ہو جاتا تھا، فردوسی کی طبیعت اس سے مکدر ہوتی تھی، قصد کیا کہ بند کو پختہ کرادے، لیکن اتنا مقدور نہ تھا، شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو نیت کی کہ جو کچھ صلہ ملے گا بند کی تیاری میں صرف کروں گا، یہ وجہ تھی کہ اُس نے شاہنامہ کا صلہ متفرق طور پر لینا پسند نہ کیا،

فردوسی نے متصل ۴ سال تک غزنین میں قیام کیا، اور شاہنامہ کی تصنیف میں مصروف رہا، پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا[۱]، اس اثنا میں جو حصہ تیار ہو چکا تھا محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفریں کے صلے حاصل کئے،

اثنائے تصنیف میں بیٹے کا انتقال

شاہنامہ کی تصنیف کے بیسویں سال جب کہ اسکی عمر ۶۵ برس کی تھی، اس کے جوان بیٹے کا انتقال ہوگیا، فردوسی کو سخت رنج ہوا، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر شاہنامہ میں کیا ہے،

مگر بہرہ گیرم از بند خویش ۔۔۔ بر اندیشم از مرگ فرزند خویش

---

[۱] دولت شاہ،

زبدہا تو بودی مراد ستگیر — چرا راہ جستی ز ہمراہ پیر

مگر ہمرہان جوان یافتی — کہ از پیش من تیز بشتافتی

جوان را چو شد سال برسی و ہفت — نہ بر آرزو یافت گیتی و رفت

ہمی بود ہموارہ با من درشت — بر آشفت و یکبارہ بنمود پشت

مرا شصت و پنج و ورا سی و ہفت — نپرسید ازیں پیر و تنہا برفت

علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی، یعنی جب شاہنامہ تیار ہوا تو اس کو اشرفیوں کے بجاے روپے دلوائے گئے،

فردوسی کی ناکامی اور اُسکا سبب

یہ واقعہ عموماً مسلّم ہے، لیکن اسباب مختلف بیان کئے گئے ہیں، اور سب باہم متناقض ہیں،

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی رخ نہیں کیا، اس لئے اُس نے دراندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے، نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا بڑا گروہ وزیراعظم حسن میمندی کا مخالف تھا، اور چونکہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا، اس لئے اسکی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا، دیباچہ میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے تباہ کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزنین اور اطراف و جوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے، فردوسی بھی اشعار کے ذریعہ سے اُنکا شکریہ ادا کرتا تھا، حسن کو یہ ناگوار

معلوم ہوتا تھا، لیکن فردوسی کچھ پروانہیں کرتا تھا، اور کہتا تھا،

من بندہ کز مبادی فطرت نبودہ ام | مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوے در وزیر چرا ملتفت شوم | چوں فارغم ز بارگہ بادشاہ نیز

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ اسلئے بھی اس نے فردوسی کی مخالفت کی، ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے[1]،

دیباچہ نویسوں نے ایک اور نکتہ بیان کیا ہے اور اس پر انکو ناز ہی، وہ یہ کہ فردوسی نے شاہنامہ میں جا بجا شرافت نسب کو بڑی آب و تاب سے لکھا ہی، اور یہ سلطان محمود کو اس وجہ سے ناگوار ہوتا تھا کہ وہ غلام زادہ تھا، اس لئے شرافت کی خوبی پر زور دینا گویا در پردہ اس پر چوٹ تھی،

---

[1] سلطان محمود کی مدتِ حکومت میں تین شخصوں کو وزارت کا رتبہ ملا، سب سے پہلے فضل بن احمد اس منصب پر ممتاز ہوا، وہ ابتدا میں سامانی خاندان کا نائب میر منشی تھا، پھر سبکتگین کے دربار میں وزارت کے رتبہ پر پہنچا، سبکتگین کے بعد سلطان محمود نے اس کا عہدہ بحال رکھا، علم و فن سے عاری تھا لیکن مہمات سلطنت کے انتظام میں خداداد ملکہ رکھتا تھا، دس برس وزارت کرنے کے بعد سلطان محمود نے رقابت کی بنا پر معزول کر دیا، اس کے بعد حسن میمندی وزیر مقرر ہوا، اٹھارہ سال کے بعد وہ بھی معزول ہوا اور حسن بن محمد کو وزارت[2] کی سند ملی، فردوسی نے فضل بن احمد کی مدح شاہنامہ میں لکھی ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد کے دربار میں اسی نے فردوسی کی تقریب کی ہوگی، اور بالآخر جس نے محمود کو فردوسی کی ناکامی پر متوجہ کیا، وہ حسن بن محمد ہوگا،

---

[2] حبیب السیر میں ان وزراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے مذکور ہیں،

تذکرہ نویسوں کا فیصلہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کے شیعہ پن کی وجہ سے اس کی قدردانی میں کمی کی، لیکن اولاً تو محمود کے دربار میں بہت سے شیعی علما و فضلا تھے جو نہایت قدر و عزت سے بسر کرتے تھے، ابوریحان بیرونی جو علانیہ شیعہ تھا محمود نے خود فرمان بھیج کر اُس کو بُلایا تھا اور نہایت قدردانی کرتا تھا، دربار میں ہندو، عیسائی، یہودی ہر مذہب و ملت کے اہلِ کمال تھے، فردوسی نے کیا قصور کیا تھا،

دیباچہ میں ایک اور وجہ بیان کی ہے، اور وہ قرینِ قیاس ہے،

سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ متعصب شیعہ تھے، (دیباچہ میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار فخرالدولہ تھا، وہ فردوسی کا نہایت قدردان تھا، جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اس نے صلہ کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائیگا، یہ خبر تمام غزنین میں پھیل گئی، محمود نے سنا تو اُس کو ناگوار گذرا،

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلاطینِ دیلم عموماً سخت متعصب شیعہ تھے، ۳۵۱ھ میں معزالدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد کی تمام مسجدوں کی دیواروں پر یہ عبارت لکھی گئی، "امیر معاویہ اور غاصب فدک پر لعنت ہے"؛ رات کو لوگوں نے یہ عبارت مٹا دی معزالدولہ نے دوبارہ لکھنے کا حکم دیا، لیکن وزیر مہلبی نے رائے دی کہ صرف اس قدر لکھوا دیا جائے "ظالمینِ آلِ محمد پر لعنت ہے"؛ البتہ معاویہ کا نام بہ تصریح لکھا جائے، چنانچہ اس

حکم کی تعمیل ہوئی[1]، یہ تعصب روز بروز بڑھتا گیا، سیوطی ۳۶۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں :-

وفی هذه السنة وبعدها غلا الرفض وفار بمصر والشام والمغرب (تاریخ الخلفاء)	اس سنہ میں اور اس کے بعد مصر، شام، اور مشرق و مغرب میں رفض ابل پڑا،

فرقہ باطنیہ جو مسلمانوں کو چھپ چھپ کر قتل کرتا رہتا تھا، انکی بڑی جمعیت دیلمیوں ہی کے زیر حمایت تھی، چنانچہ جب ۴۲۰ھ میں سلطان محمود نے مجد الدولہ دیلمی کو گرفتار کیا تو باطنیوں کا ایک گروہ عظیم اس کے ساتھ تھا، ان اسباب سے محمود کو دیلمیوں کے ساتھ نہ صرف مذہبی بلکہ پولیٹکل دشمنی تھی، اس لئے وہ فردوسی کے ساتھ فخر الدولہ دیلمی کی خط و کتابت کو مصالح ملکی کے لحاظ سے بھی گوارا نہیں کرسکتا تھا[2]،

بہرحال وجہ کچھ ہو، واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدردانی کا حق ادا نہ کیا، فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامہ کا صلہ پہنچا، فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں، فردوسی نے بڑی بیتابی سے دستِ شوق بڑھایا، لیکن سونے کے پھول کے بجائے چاندی کے پھول تھے، فردوسی کے دل سے بیساختہ آہ نکلی، تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں، اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ "میں نے یہ خونِ جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کھایا تھا، ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی، محمود نے حسن میمندی کو بلا کر ناراضی ظاہر کی، اور کہا کہ تیری دراندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا،

---

[1] ابن الاثیر واقعات ۳۵۱ھ [2] ایضاً واقعات ۴۲۰ھ،

میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیجدیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگاتا تھا،
انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے، اس چبھتے ہوئے فقرہ نے محمود کے دل میں بھی
اثر کیا، اور برہم ہو کر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا، فردوسی کو
خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا، صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر
رکھدیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے،

چو در ملک سلطاں کہ خرّش ستو	بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظل عدلش قرار	شدہ ایمن از گردشِ روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ	رہے را شمارد یکے زاں گروہ

غلام

سلطان محمود کو رحم آیا، اور اس کی تقصیر معاف کی،

سلطان محمود کی ہجو،

غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سربہ مہر دیا اور کہا کہ میرے
جانے کے ۲۰ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ
کی مُہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے،

یکے بندگی کردم اے شہریار	کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
پے افگندم از نظم کاخِ بلند	کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی	عجم زندہ کردم بدیں پارسی
چو برباد دادند گنجِ مرا،	نہ بُد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاہ را شاہ بودے پدر	بسر بر نہادے مرا تاجِ زر

دگر مادرِ شاہ بانو بُدے، مرا سیم و زرتا بزانو بُدے،

پرستار زادہ نیاید بکار وگر چند دارد پدر شہر یار

سرنا سزایاں برافراشتن وزیشاں اُمید بہی داشتن

سررشتۂ خویش گم کردن است بہ جیب اندروں مار پروردن است

درختے کہ تلخ است ویرا سرشت گرش برنشانی بہ باغ بہشت

ورازجوی خلدش بہ ہنگام آب بہ بیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

سرانجامِ گوہر بہ کار آورد ہماں میوۂ تلخ بار آورد

زبد اصل چشمِ بہی داشتن بود خاک در دیدہ انباشتن

ازاں گفتم ایں بیتہاے بلند کہ تا شاہ گیرد ازیں کار پند

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا بماند ہجا تا قیامت بجا

کلام کی جہانگیری دیکھو، محمود نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں ملک کے ملک غارت کر دیئے، عالم کو زیر و زبر کر دیا، لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں، اور قیامت تک نہیں مٹ سکتے،

فردوسی کا غزنین سے نکل کر آوارہ پھرنا،

فردوسی غزنین سے نکلا تو اس بے سرو سامانی سے نکلا کہ ایک چادر اور عصا کے سوا کچھ پاس نہ تھا، احباب اور قدر دانوں کی کمی نہ تھی لیکن معتوب شاہی کو کون پناہ دے سکتا تھا، تاہم ایاز نے یہ جرأت کی کہ جب فردوسی شہر سے باہر نکل گیا تو مخفی طور پر کچھ نقدی اور سامانِ سفر بھجوا دیا، فردوسی ہرات میں آیا اور اسمٰعیل وراق کے ہاں

مہمان ہوا، چونکہ سلطان محمود نے ہر طرف فرمان بھیجدیئے تھے کہ فردوسی جہاں ہاتھ آئے گرفتار کر کے بھیجدیا جائے چھ مہینے تک روپوش رہا، شاہی جاسوس ہرات میں آئے لیکن فردوسی کا پتہ نہ لگا سکے، اب اُس نے ہرات سے طوس کا رُخ کیا، طوس سے قہستان گیا، ناصر لک یہاں کا حاکم تھا، اسکو خبر ہوئی تو ندیمانِ خاص کو استقبال کے لئے بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا، فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی، جسمیں حاسدوں کی دراندازی، اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی و ناقدردانی کا ذکر تھا،

سلطان محمود کی شکایت کے اشعار

بہ غزنیں مرا گرچہ خوں شد جگر	زبیدادِ آں شاہِ بیداد گر
کزاں ہیچ شد رنج سی سالہ ام	شنید از زمین آسماں نالہ ام
ہمی خواستم تا فغاں ہا کنم	بہ گیتی از و داستاں ہا کنم
بگویم ز مادرش و ہم از پدرش	نہ ترسم بغیر از خداوندِ عرش
چو دشمن نمیداند از دوست باز	بہ تیغ زبانش کنم پوست باز
و لیکن ز فرمودۂ محتشم	ندانم کزیں بیش چوں سر کشم
فرستادم ار گفتۂ داشتم	بہ نزدیکِ خود ہا ہیچ نگذاشتم
اگر باشد ایں گفتہا نا صواب	بسوزاں در آتش بشو آں در آب
گزشتم ایا سرورِ نیک رائے	ازیں داوری تا بدیگر سرائے

ے چہار مقالہ،

رسد لطفِ یزداں بفریادِ من — ستانند بہ محشر ازو دادِ من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصر لک کو سنائے تو اُس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہلِ کمال کی شان نہیں، میں لاکھ روپیہ ان اشعار کے معاوضہ میں دیتا ہوں، اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا، ناصر لک نے سلطان محمود کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا[۱]،

فردوسی جب غزنین سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا،

خجستہ درگہ محمود غزنوی دریا است — چگونہ دریا کان را کرانہ پیدا نیست
چہ غوطہ ہا زدم و اندرو ندیدم دُر — گناہ بختِ من ست ایں گناہ دریا نیست

اتفاق یہ کہ جس دن ناصر لک کا عریضہ پہنچا، سلطان نماز جمعہ پڑھنے کیلئے جامع مسجد میں آیا تھا، اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی، نہایت متاسف ہوا، مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا، جن لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے اُن کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھکو بدنام کر دیا،

ناصر لک نے گو فردوسی کی بہت کچھ خاطر مدارات کی تاہم سلطان محمود کے

---

[۱] یہ دیباچہ کی روایت ہے، چہار مقالہ میں قہستان کے بجائے طبرستان اور ناصر لک کے بجائے سپہبد شیرزاد کا نام ہی، دولت شاہ نے طبرستان کے بجائے رستمدار لکھا ہی، طبرستان اور رستمدار در اصل ایک ہی ہیں لیکن سپہبد اور ناصر لک دو شخص ہیں، دولت شاہ نے ان میں سے ایک کو چھوڑ دیا ہے،

ڈر سے اپنے پاس نہ ٹھہرا سکا، فردوسی یہاں سے بھی نکلا اور مازندران میں آیا یہاں وہ شاہنامہ کی نظر ثانی میں مشغول ہوا،

مازندران کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانہ میں سپہبد فرماں روا تھا، اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بُلایا، فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا، سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے نہ جانے دے، لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا، ایک گراں بہا صلہ بھیجکر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے، اسلیے میں آپکو ٹھہرا نہیں سکتا، آپ اور کہیں تشریف لے جائیے،

دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے کہ "فردوسی یہاں سے بغداد گیا، خلیفہ عباسی نے اس کی بڑی قدر کی، فردوسی نے عربی میں قصیدے لکھ کر پیش کئے اور اہلِ بغداد کی فرمایش سے یوسف زلیخا لکھی، سلطان محمود کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو خلیفہ عباسی کو تہدید کا خط لکھا، کہ فردوسی کو فوراً یہاں بھیجدیجئے، ورنہ بغداد ہاتھیوں کے پاؤں کے نیچے ہوگا، وہاں سے تین حرف الف لام میم لکھ کر آئے کہ سورۂ الم ترکیف کی طرف اشارہ تھا، لیکن یہ تمام بے سروپا مزخرفات ہیں،

ایک دفعہ سلطان محمود ہندوستان کی مہم سے واپس آرہا تھا، راستہ میں دشمن کا قلعہ تھا، وہیں ٹھہر گیا، اور قاصد بھیجا کہ حاضرِ خدمت ہو کر اطاعت بجالائے دوسرے دن قاصد جواب لایا، لیکن ابھی کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم

سے کہا کہ دیکھ کیا جواب لایا ہے،

وزیر نے برجستہ کہا،

اگر جز بکام من آمد جواب — من وگرز ومیدان و افراسیاب

سلطان محمود نے تلافی مافات کا ارادہ کیا

محمود پھڑک اُٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے؟ وزیر نے کہا اُس بدقسمت کا جس نے ۱۵ برس خونِ جگر پیا اور کچھ نہ حاصل ہوا[1]، محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہی، غزنیں پہنچکر یاد دلانا، غرض پایۂ تخت میں پہنچکر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں لیکن تقدیر پر کس کا زور ہے، ادھر شہر کے ایک دروازہ سے جس کا نام رودبار تھا صلہ پہنچا، اُدھر دوسرے دروازہ سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا،

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میر — یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

طوس میں ایک واعظ صاحب تھے اُنھوں نے فتویٰ دیا کہ چونکہ فردوسی رافضی تھا، اس کا جنازہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا، ہر چند لوگوں نے منت سماجت کی لیکن بدنفس واعظ نے ایک نہ مانی، مجبوراً شہر کے باہر، ایک باغ میں کہ فردوسی کی ملک تھا، دفن کیا، سلطان محمود کو پرچہ گذرا تو حکم

[1] یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مروی ہی، میں نے جو روایت لکھی ہی، نظامی سمرقندی سے مروی ہے اور اس لئے زیادہ معتبر ہی کہ اس نے ۵۱۲ھ میں امیر معزی (ملک الشعرا سلطان سنجر) سے سنی تھی اور امیر معزی سے میر عبد الرزاق نے بیان کی تھی، (دیکھو چہار مقالہ واقعات فردوسی)

دیا کہ واعظ شہر سے نکال دیا جائے[۵]،

فردوسی نے اولاد ذکور نہیں چھوڑی تھی، صرف ایک لڑکی تھی، شاہی صلہ اسکی خدمت میں پیش کیا گیا، لیکن اُسکی بلند ہمتی نے گوارا نہ کیا کہ باپ جس چیز کی حسرت میں مرگیا اولاد اس سے تمتع اُٹھائے، سلطان محمود کو اسکی اطلاع دی گئی، حکم دیا کہ اشرفیاں امام ابوبکر اسحٰق کے حوالہ کی جائیں کہ اس سے فردوسی کے نام پر ایک کارواں سرائے بنا دی جائے، ناصر خسرو نے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ۴۳۰ھ میں جب میں طوس میں پہنچا تو ایک بڑی کارواں سرا دیکھی، لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلہ سے تعمیر ہوئی ہے، فرہنگ رشیدی اور چہار مقالہ میں لکھا ہے، کہ اس کا نام چاہ ہے، اور مرو اور نیشاپور کے راستہ میں ہے،

عام تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ فردوسی نے ۴۱۱ھ میں وفات پائی لیکن فردوسی نے شاہنامہ کے خاتمہ میں تصریح کی ہے، کہ شاہنامہ ۴۰۰ھ میں انجام کو پہنچا،

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار کہ گفتم من این نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ اسوقت اسکی عمر اسّی برس کی تھی،

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد امیدم بہ یکبارہ برباد شد

شاہنامہ کے ختم ہونے کے بعد، وہ دو چار برس سے زیادہ زندہ نہیں

[۵] چہار مقالہ،

رہا، اس لئے اس کی وفات سنہ ۴۱۱ھ سے چند برس پہلے ہوئی ہوگی،

فردوسی کا مزار مدت تک آباد اور بوسہ گاہ عالم رہا، نظامی سمرقندی نے سنہ ۵۱۰ھ میں اس کی زیارت کی تھی، دولت شاہ نے لکھا ہو کہ آج اس کا مزار مرجع عام ہے، قاضی نور اللہ شوستری مجالس المومنین میں لکھتے ہیں کہ "عبد اللہ خاں ازبک کی توجہ سے فردوسی کا مقبرہ معمور اور پر رونق ہے، عام لوگ عموماً اور شیعہ خصوصاً زیارت کو جاتے ہیں، میں نے بھی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے"،

هرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

شاہنامہ

سنہ تصنیف و سبب تصنیف کیا عجیب بات ہے، جو واقعہ جس قدر زیادہ مشہور ہوتا ہے اسی قدر اکثر غلط اور بے سروپا ہوتا ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچکر اس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا، اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے،

فردوسی نے خاتمہ میں خود تصریح کی ہو کہ یہ کتاب سنہ ۴۰۰ھ میں تمام ہوئی،

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار   کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

اس کے ساتھ یہ بھی تصریح کی ہے کہ پینتیس برس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوئے

سی و پنج سال از سرائے سپنج   بسے رنج بُردم باُمید گنج

---

۵۷ پانچ کو اسی میں ضرب دیں تو چار سو ہوتے ہیں،

اس بنا پر تصنیف کا آغاز ۳۶۵ھ سمجھنا چاہئے، اور چونکہ سلطان محمود ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوا، اس لئے اس کی تخت نشینی سے مدتوں پہلے شاہنامہ کی ابتدا ہو چکی تھی،

عام خیال یہ ہے کہ شاہنامہ سلطان محمود کی فرمایش سے لکھا گیا، لیکن یہ بھی محض غلط ہے، فردوسی نے خود سببِ تالیف لکھا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکو صرف اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا مقصود تھا،

همی خواهم از دادگر یک خدای — که چندان بمانم به گیتی بجای

که ایں نامهٔ شهریارانِ پیش — به پیوندم از خوب گفتار خویش

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زنده کردم بدیں پارسی

همه مرده از روزگار دراز — شد از گفت من نام شان زنده باز

چو عیسیٰ من ایں مردگان را تمام — سراسر همه زنده کردم بنام

پے افگندم از نظم کاخ بلند — که از باد و باراں نیابد گزند

تیسرے دفتر میں جہاں دقیقی کے اشعار نقل کئے ہیں، خاتمہ پر لکھتا ہے،

من ایں نامه فرخ گرفتم بفال — همی رنج بردم به بسیار سال

ندیدم سرافراز بخشندهٔ — به گاه کیاں بر نشینندهٔ

سخن را نگهداشتم سال بست — بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

جهاندار محمود با فرّ و جود — که اورا کند ماه و کیواں سجود

ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ سلطان محمود کے دربار میں پہنچنے سے بیس سال پہلے شاہنامہ شروع ہو چکا تھا،

دیباچہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آغازِ کتاب اس نے خود اپنے شوق سے کیا، قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، فردوسی فطرۃً شاعر تھا، اس کے ساتھ نسل کا مجوسی یعنی شاہانِ ایران کا ہم قوم تھا، دقیقی نے شاہنامہ کی جو بنیاد ڈالی تھی اور جس قدر شعر لکھ لئے تھے، اس کے چرچے ہر جگہ پھیل گئے تھے اور اس سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس کتاب میں قبولیت کا کس قدر مادہ ہے، یہ اسباب اس بات کے لئے کافی تھے کہ فردوسی نے خود اپنے شوق سے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن چونکہ ایک عظیم الشان کام تھا، اور اعانت کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت تھی کہ تاریخ کا مستند سرمایہ ہاتھ آئے حسنِ اتفاق یہ کہ فردوسی کے وطن ہی میں ایک شخص کے پاس یہ سرمایہ موجود تھا، اور وہ فردوسی کا مخلص دوست تھا، اسکو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے یہ کتاب لاکر فردوسی کو دی، چنانچہ فردوسی دیباچہ میں لکھتا ہے،

به شهرم یکے مهربان دوست بود ۔۔۔ تو گفتی که با من بیک پوست بود

مرا گفت خوب آمد ازیں رائے تو ۔۔۔ به نیکی خرامد مگر پائے تو،

نوشته من ایں نامهٔ پهلوے ۔۔۔ به پیش تو آرم مگر نغنوی

شو، ایں نامهٔ خسرواں باز گوے ۔۔۔ بدیں جوے نزد مهاں آبروے

چو آورد ایں نامه نزدیک من ۔۔۔ برافروخت ایں جانِ تاریک من

فردوسی اگرچہ جیسا کہ نظامی سمرقندی نے لکھا ہے" رئیس زادہ اور خوش حال تھا تاہم جب اس نے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تو علم دوست امرا نے قدردانی کا اظہار کرنا چاہا لیکن منصور بن محمد نے جو طوس کا حاکم تھا ایسی فیاضی کا اظہار کیا، کہ فردوسی تمام لوگوں سے بے نیاز ہو گیا،

بدین نامہ چوں دست کردم دراز | یکے مہترے بود گردن فراز
جواں بود از گوہر پہلواں | خردمند و بیدار روشن رواں
مرا گفت کز من چہ آید ہمے | کہ جانت سخن برگراید ہمے
بچیزے کہ باشد مرا دسترس | بکوشم، نیازت نہ آرم بکس

شاہنامہ کے قدردان

افسوس کہ منصور چند روز کے بعد مر گیا، فردوسی نے اس کا بہت پرزور مرثیہ لکھا، حسین قتیب، علی دیلم، بودلف اور فضل بن احمد کا نام بھی فردوسی کے قدردانوں کی فہرست میں داخل ہے، نظامی سمرقندی نے لکھا ہے کہ "حسین قتیب طوس کا عامل تھا" (غالباً منصور کے مرنے کے بعد مقرر ہوا ہوگا) اس نے فردوسی کے دیہات کی مالگذاری معاف کر دی تھی[1]،

فضل بن احمد سلطان محمود کا وزیر تھا جس کے مرنے کے بعد حسن میمندی اس منصب پر ممتاز ہوا، فضل کا تذکرہ بھی فردوسی نے شاہنامہ میں کیا ہے،

نظامی عروضی کا بیان ہے کہ علی دیلمی شاہنامہ کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا،

---

[1] چہار مقالہ نظامی سمرقندی،

اور بو دلف راوی تھا، یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا، اور جلسوں اور صحبتوں میں لوگوں کو سناتا تھا، لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام اس انداز سے لیا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ فردوسی کے سرپرست اور مربی تھے، کاتب اور راوی نہ تھے،

ازاں نامور نامداران شہر　　　علی دیلم و بو دلف راست بہر

بو دلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہے کہ یہ وہ بو دلف ہے جو ایک محتشم رئیس تھا، جس کے نام پر اسدی طوسی نے گشتاسپ نامہ لکھا ہے، اور دیباچہ میں اسکی مدح و ثنا کی ہے،

ملک بو دلف شہریار زمین　　　جہاندار ازانی پاک دین

بزرگی کہ با آسماں ہمسر است　　　ز نسل براہیم پیغمبر است

خوش اعتقاد دیباچہ نویسوں نے لکھا ہے، کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو شیخ محمد معشوق طوسی کی خدمت میں جو ایک مشہور صاحبدل تھے، حاضر ہوا، اور ان سے اپنا خیال ظاہر کیا، اُنھوں نے کہا تم اس کام کو شروع کرو، خدا تم کو کامیاب کریگا، فردوسی تو کامیاب نہیں ہوا، لیکن شاہنامہ کی کامیابی میں کس کو شک ہوسکتا ہی،

شاہنامہ کا ماخذ

شاہنامہ کا تاریخی مواد

سرجان مالکم صاحب[۱] اپنی تاریخ ص۶۵ میں لکھتے ہیں،

[۱] سرجان مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں انگریزی سرکار کیطرف سے سفیر تھے اُنھوں نے ایران کی تاریخ قدیم و جدید

"قرنِ اوّل کے تمام مورخین لکھتے ہیں کہ چونکہ ایرانیوں نے عرب کے حملے کے روکنے میں نہایت پامردی دکھائی تھی، اس لئے پیروانِ اسلام اس قدر برافروختہ تھے کہ اُنھوں نے ایران کی تمام قومی یادگاروں کو برباد کر دیا، شہروں کو آگ لگادی، آتشکدے برباد کر دیئے موبدوں کو قتل کرا دیا، ہر قسم کی کتابیں عموماً برباد کر دیں، کتبخانوں کے مالکوں کو قتل کرا دیا، یہ متعصب عرب قرآن کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے اور نہ جاننا چاہتے تھے موبدوں کو مجوس کہتے تھے اور ان کو جادوگر سمجھتے تھے یونان اور روم کی کتابوں سے قیاس ہو سکتا ہے کہ اس طوفان میں ایران کی کس قدر کتابیں بچی ہونگی، قریباً چار سو برس گذر گئے اور کسی نے ایرانیوں کی تاریخ لکھنے پر توجہ نہیں کی، سب سے پہلی کوشش اسکے متعلق جو کی گئی وہ سامانیوں نے کی، مورخین کو اس میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ منصور ثانی نے ابتدا کی، بعض کہتے ہیں کہ دقیقی نے شاہنامہ لکھنا اسمٰعیل کے زمانہ میں شروع کیا جو سلسلۂ سامانیہ کا پہلا تاجدار تھا، غرض چونکہ سلاطین سامانی اپنے آپ کو بہرام چوبیں کے خاندان سے سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا چاہا۔"

مالکم صاحب کی متعصبانہ رائے

مالکم صاحب ایک مدت تک ایران میں رہے ہیں، فارسی زبان میں اُنکو پوری مہارت تھی، اسلامی تاریخ کی طرف خاص توجہ تھی، ان سب باتوں کے ساتھ انکی تحقیقات کا یہ عالم ہے کہ اتنی لمبی چوڑی عبارت میں ایک حرف بھی صحیح زبان سے نہ نکلا،

(بقیہ حاشیہ ص۱۱۴) ایک کتاب انگریزی میں لکھی، مرزا حیرت ایرانی نے اسکا ترجمہ کیا جو بمبئی میں ۱۲۸۶ھ میں چھاپا گیا۔

مالکم صاحب کے تعصب کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں، البتہ تاریخی حیثیت سے یہ امر قابلِ بحث ہے کہ فردوسی نے جب شاہنامہ لکھنا چاہا تو ایران کا تاریخی ذخیرہ کس قدر موجود تھا، عام خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں علوم و فنون کی تدوین ۱۴۳ھ سے شروع ہوئی اور درحقیقت اسلامی علوم و فنون کے متعلق اس سے پہلے کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ غیر قوموں کے علوم و فنون کا ترجمہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا، ہشام بن عبدالملک جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا، اور جو سلاطینِ بنی امیہ کا گلِ سرسبد تھا، سب سے پہلے اس نے غیر قوموں کی تاریخ کی طرف توجہ کی، اس کا میر منشی جبلہ بن سالم تھا، اس نے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، جن میں سے جنگ رستم و اسفندیار اور داستان بہرام چوبیں بھی تھی[۱]، شاہانِ عجم کے علمی ذخیرے جو فتوحات میں ہاتھ آئے تھے، اُن میں ایک کتاب تاریخ تھی، یہ ایران کی نہایت مفصل اور مبسوط تاریخ تھی، جس میں سلطنتوں کے حالات کے ساتھ حکومت کے قواعد اور آئین، عہد بعہد کے علوم و فنون تعمیرات وغیرہ کے مفصل حالات تھے، ایک خاص جدت یہ تھی کہ تمام سلاطین کی تصویریں بھی تھیں اور تصویروں میں اُنکی خاص وضع قطع، لباس، زیورات اور تمام خصوصیات کو بعینہٖ دکھایا تھا، ہشام نے اس کتاب کا ترجمہ کرایا، چنانچہ ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ طیار ہوا، مورخ مسعودی نے کتاب الاشراف[۲] میں لکھا ہے کہ میں نے ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ

ایران کی قدیم تاریخیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں،

[۱] کتاب الفہرست ص ۱۱۷ [۲] کتاب مذکور مطبوعہ یورپ ص ۱۰۶،

کتاب دیکھی سلطنت فارس کے متعلق جس قدر کتابیں فارسی میں موجود ہیں یہ سب سے زیادہ مفصل ہے، دولت عباسیہ نے آغاز ہی سے ایران کے علوم و فنون کے ترجمہ کی طرف توجہ کی، ان میں سے تاریخی کتابیں حسب ذیل ہیں،

خدائی نامہ[۱]، یہ نہایت مفصل تاریخ تھی اور اس قدر مقبول عام تھی کہ بہرام بن مروان شاہ نے جو دولت عباسیہ کا مترجم تھا، جب اس کتاب کو بہم پہنچانا چاہا تو بیس مختلف نسخے اس کو ہاتھ آئے، عبداللہ بن المقفع نے اس کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا اور اس کا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا،

آئین نامہ، یہ بھی نہایت مفصل کتاب ہے، علامہ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف (ص۱۰۴ میں) لکھا ہے، کہ یہ بہت ضخیم کتاب اور کئی ہزار صفحوں میں ہے، عبداللہ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

سیر ملوک الفرس	مترجمہ عبداللہ بن المقفع،
سیر ملوک الفرس	مترجمہ محمد جہم البرمکی
سیر ملوک الفرس	مترجمہ زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی
سیر ملوک الفرس[۲]	مترجمہ محمد بن بہرام الاصفہانی،

سکیران، پہلوی زبان میں تھی، مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ اہل عجم اس

---

[۱] خدائی نامہ کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی مطبوعہ یورپ ص۲۴،۲۰،۱۶ اور کتاب الفہرست ص۱۱۸ میں ہے

[۲] ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی ص۸ میں ہے،

کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے، عبد اللہ بن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا،

تاریخ دولت ساسانی — مترجمہ ہشام بن قاسم الاصفہانی، اصلاح دادہ بہرام بن مروان شاہ موبد نیشاپور[1]

کارنامۂ نوشیرواں

شہرزاد و پرویز — اردشیر نے اپنے حالات اور واقعات خود لکھے[2]

کارنامۂ اردشیر بن بابک

کتاب التاج

بہرام و نرسی نامہ

کارنامہ — نوشیرواں کے حالات،

مزدک نامہ

ان کتابوں کے علاوہ سلاطینِ ایران کے عہد نامے، توقیعات اور فرامین مہیا کئے گئے اور اُن کا ترجمہ کیا گیا، مثلاً وصیت نامۂ نوشیرواں بنام ہرمز، عہد نامہ اردشیر بابکاں بنام شاپور، کسریٰ و مرزبان کا مکالمہ، نوشیرواں کا خط سردارانِ فوج کے نام، نوشیرواں اور جواسپ کے مراسلات[3]،

جب تاریخ ایران کا اس قدر ذخیرہ فراہم ہو چکا تو مورخینِ اسلام نے انکی مدد سے خود مستقل تصنیفیں کیں، چنانچہ محدث طبری، علامہ مسعودی، ابو حنیفہ دینوری، یعقوبی،

---

[1] ان دونوں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی ص۹ میں ہی، [2] مروج الذہب مسعودی مطبوعہ یورپ ص۱۶۲ جلد اول، [3] ان چاروں کتابوں کا ذکر فہرست ابن الندیم ص۳۱۵ میں ہی،

حمزہ اصفہانی وغیرہ نے ایران کی مبسوط اور مفصل تاریخیں لکھیں جو یورپ کی بدولت آج چھپ کر شائع ہو چکی ہیں، یہ تمام کتابیں فردوسی کے زمانہ سے پہلے تصنیف ہو چکی تھیں، ان واقعات کے بعد مالکم صاحب کی رائے کو پڑھو کہ "مسلمان چار سو برس تک ایران کی تاریخ سے ناواقف تھے، اور سب سے پہلی کوشش سامانیوں کے دور میں ہوئی"۔

یہ تمام کتابیں عربی زبان میں تھیں، فارسی میں اسوقت تک ترجمہ کے سوا کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی گئی تھی، غالباً سب سے پہلی کتاب جو تاریخ ایران پر لکھی گئی، وہ ابوعلی محمد بن احمد البلخی کی تصنیف تھی، جس کا نام اس نے شاہنامہ رکھا تھا، اسی بنا پر کشف الظنون میں اسکو شاہنامۂ قدیم لکھا ہے،

ابوریحان بیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کا سرمایہ کتب مندرجۂ ذیل سے فراہم کیا، سیر الملوک عبداللہ ابن المقفع، سیر الملوک محمد بن جہم البرمکی، سیر الملوک ہشام بن القاسم، سیر الملوک بہرام شاہ بن مروان شاہ، سیر الملوک بہرام اصفہانی، تصانیف بہرام مجوسی،

غرض جب دقیقی نے شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تو تاریخ عجم کا بہت بڑا ذخیرہ عربی و فارسی میں تیار ہو چکا تھا، دقیقی نے سامانیوں کی فرمائش سے یہ کام شروع کیا تھا، سامانیوں کا کتب خانہ اس زمانہ میں تمام عالم میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، شیخ بوعلی سینا جب اوّل اوّل اس کتب خانہ میں داخل ہوا تو اس پر حیرت چھا گئی،

---

[۱] دیکھو کتاب مذکور مطبوعۂ یورپ صث ۹۹،

چنانچہ اُس نے اقرار کیا ہے کہ میں نے اتنا نادر اور عظیم الشان کتب خانہ نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا"، دقیقی کے لئے یہ تمام تاریخی ذخیرہ مہیا کیا گیا ہوگا، اور چونکہ سلطان محمود غزنوی سامانیوں ہی کا دست پرور اور ان کو مٹا کر انکا جانشین بنا تھا اسلئے ہر طرح قرین قیاس ہے کہ وہ سب سامان محمود کو ہاتھ آیا ہوگا اور فردوسی کو اس سے فائدہ اُٹھانیکا موقع دیا ہوگا، یہ محض قیاس نہیں بلکہ مورخین کی تصریح سے اس کی تائید ہوتی ہے کشف الظنون میں ہی،

تاریخ الفرس لبعض قدماء اھل فارس	تاریخ ایران بعض قدماء ایران کی تصنیف ہے
وقد کان معظما عند العجم لما فیہ	عجمی اس کتاب کی اسلئے بہت عزت کرتے تھے
من اخبار اسلافھم وسیر ملوکھم وھو	کہ اسمیں انکے آبا واجداد اور سلاطین کے حالات
اصل الشھنامہ وغیرھا ونقلہ ابن	تھے اور یہی کتاب شاہنامہ وغیرہ کا ماخذ ہے
المقفع من الفھلویۃ الی العربیۃ	ابن المقفع نے اسکو پہلوی زبان سے ترجمہ کیا،

غالباً یہ وہی خدائی نامہ ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا،

صاحب مجمع الفصحار لکھتے ہیں،

" از جملہ نامہاے قدیم جاسپ نہاد، کتاب لوست کہ در ذکر خسروان ایران بودہ دیگر آئین بہمن است، در احوال بہمن، دیگر داراب نامہ است، دیگر دانش افزاے نوشیروانی کہ جامع آں بزرگ مہر حکیم بودہ، و باستان نامہ و دانشور نامہ وخرد نامہ وحکیم ابوالقاسم محمد بن منصور فردوسی آثار افعال ملوک عجم، را ازان نامہا بدست

آورده"

ان تمام قرائن اور تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی کا ماخذ زیادہ تر ایران کی وہ تاریخیں ہیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی تھیں، لیکن فردوسی کا قومی غرور عرب کے احسان کو گوارا نہیں کرتا، فردوسی کا دعوا ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک نہایت مبسوط تاریخ ایران کی موجود تھی لیکن مرتب و مدوّن نہ تھی، موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزار تھے، ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بڈھے بڈھے پرتم موبد جمع کئے اور اُن پراگندہ اجزار کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کرائی،

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق خود فردوسی کا بیان

یکے نامہ بُد از گہ باستاں	فراواں بدو اندراں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے	ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے
یکے پہلواں بود دہقاں نژاد	دلیر بزرگ و خردمند و راد،
ز ہر کشورے موبدے سالخورد	بیاورد وایں نامہ را گرد کرد
بہ پرسید شاں از نژاد کیاں	وزاں نامداران فرخ گواں
بگفتند پیشش یکایک مہاں	سخنہائے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید ازیں شاں سپہبد سخن	یکے نامور نامہ افگند بُن

فردوسی کا بیان ہے کہ اسی کتاب کو دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن چونکہ ناتمام چھوڑ گیا میں نے اسکی تکمیل کی،

فردوسی کے بیان کے مطابق شاہنامہ کی اصلی بنیاد اسی کتاب پر قائم کی گئی لیکن جستہ جستہ داستانیں اور ذریعوں سے بھی فراہم ہوئیں، رستم و شغاد کا قصہ جہاں شروع کیا ہے تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام و نریمان کی اولاد سے تھا، اس کے پاس سلاطین ایران کی تاریخ تھی، اور رستم کی اکثر داستانیں اسکو زبانی یاد تھیں، شغاد کا قصہ میں نے اس سے لیکر نظم کیا،

یکے پیر بُد نامش آزاد سرو — کہ با احمد سہل بودے بہ مرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے — تن و پیکر پہلواں داشتے
بہ سام نریماں کشیدش نژاد — بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن انچہ زو یافتم — سخن را یک اندر دگر بافتم

فردوسی کا دعویٰ ہے ہم کو انکار کی کوئی وجہ نہیں، لیکن یہ امر غور طلب ہی کہ فردوسی نے خود تیسری جلد میں دقیقی کے اشعار کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہی،

یکے نامہ دیدم پُراز داستاں — سخنہائے آں پُر منش راستاں
فسانہ کہن بود و منثور بود — طبائع ز پیوند او دور بود
گذشتہ بر و سالیاں دو ہزار — گرایدوں کہ برتر نیاید شمار
گرفتم بگویند بر آفریں — کہ پیوند را راہ داد اندریں

تیسرے شعر میں صاف تصریح ہے کہ کتاب مذکور دو ہزار برس کی تصنیف تھی، یہ ظاہر ہے کہ دو ہزار برس پہلے ایران کی جو زبان تھی وہ فردوسی کے زمانہ کی

زبان نہ تھی بلکہ ژندی یا اس کے قریب قریب ہوگی جو سنسکرت سے ملتی جلتی ہے، اور جو پہلوی زبان سے بھی بہت مختلف ہی، اس لئے یہ بات ثابت ہونا ضرور ہو کہ فردوسی اس زبان سے واقف تھا یا کوئی شخص ترجمہ کرتا جاتا تھا، لیکن تذکروں اور خود فردوسی کے بیان میں اسکی کوئی شہادت موجود نہیں،

شاہنامہ کے ماخذ کے متعلق دیباچہ میں اور چند روایتیں مذکور ہیں، واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ہم اُن کو بھی نقل کرتے ہیں، لیکن جہاں ان میں بدیہی غلطی ہی ہم اسکی تغلیط کردیں گے،

سامانیوں کو ایران کی تاریخ کے مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا، ان میں سے نوشیرواں کو سخت شغف تھا، چنانچہ تمام دیار و اطراف میں قاصد بھیجکر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کئے، یزدگرد نے اپنے زمانہ میں ان سب کو دانشور دہقان کے حوالہ کیا کہ کیومرث سے لیکر خسرو پرویز کے زمانہ تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کردے، دانشور مذکور مدائن کے روسا میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا، اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دیکر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی،

عربوں کے حملہ میں یہ کتاب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی گئی آپنے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل نہیں، غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہوکر حبش پہنچی، بادشاہ حبش نے اس کا ترجمہ کرایا، وہاں سے ہندوستان

پہنچی، یعقوب لیث نے اپنے زمانۂ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، چنانچہ تاج بن خراسانی ہروی، یزدان داد شاہ رسیتانی، ماہوی بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی، ان سب نے مل کر ۳۶۰ھ میں اس کا ترجمہ کیا، یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی، اور ان کے حکم سے دقیقی نے اسکو نظم کرنا شروع کیا،

اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب حبش گئی، وہاں ترجمہ ہو کر پھر ہندوستان پہنچی ہندوستان سے ایران میں آئی، صریح غلط اور بیہودہ ہے، باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں، یعنی ایران کی کوئی قدیم تاریخ جو یزدگرد کے عہد میں تیار ہوئی تھی یعقوب لیث کے زمانہ میں پہلوی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی ہو،

دیباچہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ نوشیرواں کے خاندان کا ایک شخص سلطان محمود کے زمانہ میں تھا، اس کا نام خور فیروز تھا، اور فارس میں سکونت رکھتا تھا، زمانہ کے انقلاب سے آوارہ وطن ہو کر، غزنیں پہنچا، یہاں آ کر چرچا سنا کہ سلطان محمود تاریخ عجم کا شیفتہ و دلدادہ ہے، اس کے وطن میں یہ کتاب موجود تھی، چنانچہ وہاں سے منگوا کر سلطان کی خدمت میں پیش کی، اور مورد انعام ہوا،

تیسری روایت یہ ہے کہ جب تمام ملک میں سلطان محمود کے شوق کے چرچے پھیلے تو بادشاہ کرمان نے ایک شخص کو جس کا نام آذر برزین تھا، اور شاپور ذوالاکتاف کے خاندان سے تھا، اور اس وجہ سے تاریخِ ایران کا بڑا سرمایہ اس کے

پاس تھا، اس کو سلطان محمود کی خدمت میں بھیجا،

شاہنامہ کی وقعت تاریخ کے لحاظ سے

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخی درجہ سے گرادیا ہے، تاہم ایران کی کوئی مفصل قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی،

ملکم صاحب بھی تاریخ ایران میں اعتراف کرتے ہیں،

"کتاب فردوسی اگرچہ افسانہ وخیالات شاعری بسیار دارد، لکن تقریباً جمیع اخبارے کہ در تاریخ قدیم ایران و توران در ملک آسیا (ایشیا) یافت می شود دراں مندرج است۔"

مالکم صاحب نے نہایت تفصیل کے ساتھ شاہنامہ کے واقعات کا یونانی مورخین کے بیان سے مقابلہ کیا ہے، اور اکثر جگہ دونوں میں تطبیق دی ہے، علامہ ثعلبی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا، ایران کی قدیم تاریخ پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے، اس نے بھی جابجا شاہنامہ کا حوالہ دیا ہے، تاریخی حیثیت سے شاہنامہ کے متعلق مفصل بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں، البتہ اس قدر جتانا ضروری ہے کہ شاہنامہ کی بے اعتباری کی بڑی وجہ جو آج کل خیال کیجاتی ہے، وہ اس کے دور از کار افسانے ہیں، مثلاً دیو سفید، مار ضحاک، جام کیخسرو وغیرہ وغیرہ، لیکن اولاً تو چند واقعات کی بنا پر تمام کتاب کو غلط نہیں کہہ سکتے، ہیروڈوٹس کو تمام یورپ تاریخ کا آدم مانتا ہے، لیکن اسکی تاریخ میں ہزاروں واقعات فرضی اور وہمی ہیں، اور خود

یورپ کو اس کا اعتراف ہے، دوسرے ایرانیوں کی قدیم تاریخ میں واقعات اسی طرح مذکور تھے، اس لئے فردوسی کا صرف یہی فرض تھا کہ ان واقعات کو بعینہٖ نقل کردے علامہ ثعلبی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ تمام افسانے گو بالکل بے سروپا اور خلاف عقل ہیں، لیکن چونکہ ایران کی تاریخ میں بہ تواتر بیان ہوتے چلے آتے ہیں، اس لئے ہمارا صرف اس قدر فرض ہے کہ جوں کا توں انکو نقل کر دیا جائے، علامۂ موصوف کے یہ الفاظ ہیں، (ذکر قصۂ زال و سیمرغ)

وانا ابرء من عهدة هذه الحكاية ولولا شهرتها بكل مكان وفى زمان وعلى كل لسان وجريها مجرى ما يستطاب ويلهى به الملوك عند الارق لما كتبتها وقد كانت العجائب كثيرة فى ذلك الزمان الاول كبلوغ عمر الواحد من هلة الف سنة وكطاعة الجن والشياطين للملوك ... وغيرها مما يطول ذكره (جلد اول صفحہ مطبوعۂ یورپ)

اسی طرح ہفت خوان رستم کے ذکر میں لکھا ہے، کہ یہ سب لغویات ہیں،

ابوریحان بیرونی آثار الباقیہ میں[1] لکھتا ہے.

ولهم فى التواريخ القسم الاول	ایرانیوں نے پہلے زمانہ کی تاریخ لکھی ہے، انمیں سلاطین
اعمار الملوك وافاعيلهم لمشهورة	کی عمروں اور انکے کارناموں کے متعلق ایسی باتیں
عنهم ما يستنفر عن استماعه القلوب	بیان کرتے ہیں جن کے سننے سے دل اچٹتا ہے کان
وتمجه الاذان ولا تقبله العقول	انکو برداشت نہیں کر سکتے عقل انکو قبول نہیں کرتی

[1] مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۰،

بعض یوروپین مورخین کے نزدیک شاہنامہ کی بے اعتباری کی وجہ یہ ہے کہ اس کے واقعات یونانیوں کی تاریخ سے اکثر جگہ مخالف ہیں لیکن اس عقدہ کو علامہ ثعلبی نے بہت پہلے حل کر دیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے پاس ایران کی تاریخ کے متعلق دو ماخذ ہیں، ایرانی اور یونانی، ہم جانتے ہیں کہ دونوں میں اختلاف ہے، لیکن یہ مسلم مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے، اسلئے ہم نے یونانیوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا"

محققین یورپ کی رائے

یورپ نے نہایت جد و جہد سے اسلام کے قبل کی ایرانی تصنیفات کثرت سے ڈھونڈھ نکالیں، اور اُن میں سے اکثر کو چھاپ کر شائع کیا، چنانچہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ایک خاص عنوان قائم کیا ہے "پہلوی لٹریچر" اس کے ذیل میں اُن تمام کتابوں کی فہرست اور اُن کے حالات لکھے ہیں، ان میں بعض کتابیں اسلام سے پانْ پانْ سو، چھ چھ سو برس پہلے کی تصنیف ہیں، ان میں سے جو کتابیں شاہانِ عجم کی تاریخ ہیں، اُن کا بیان حرف بحرف فردوسی سے مطابق ہے، انہی میں ایک کتاب کارنامک ارتخشتر ہے جو پہلوی زبان میں ہے، اور ۶۰۰ئہ یعنی زمانۂ اسلام سے کسی قدر پہلے کی تصنیف ہے، یہ کتاب اصل پہلوی زبان میں مع جرمنی ترجمہ کے شائع کی گئی ہے، اسکی نسبت براؤن صاحب لکھتے ہیں،

"جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ

فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے، اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے، جرمن کے مشہور فاضل پروفیسر نولدکی نے شاہنامہ کے ماخذ اور اسکی تاریخی حیثیت پر ایک مستقل کتاب جرمن زبان میں لکھی ہے، اسکے اقتباسات کا ترجمہ مسٹر براؤن نے انگریزی میں کیا ہے، اور اپنی کتاب کی جلد اول میں شامل کیا ہے ہم اس کے بعض ضروری مقامات کا ترجمہ نقل کرتے ہیں،

تاریخ وقدامت "اوستا میں شاہنامہ کی فصلوں کا اتنا ذکر آچکا ہے کہ اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب اوستا تصنیف ہوئی تو اُس زمانہ میں اُن قومی فسانوں کی بڑی بڑی باتیں لوگوں کو معلوم تھیں، ان کی قدامت کا صرف یہی ایک ثبوت نہیں ہے، کیونکہ نولدکی نے دکھلادیا ہے کہ یونانی مصنفوں کی کتابوں میں بھی جو انھوں نے شاہانِ ایران کے بارہ میں لکھی ہیں، ان بہادروں کا تذکرہ موجود ہے، خاصکر ٹی۔سی۔ایس[1] کی کتاب میں جو پانسو برس قبل حضرت مسیح، آرٹا یزرک[2] سیزنی من[3] کا طبیبِ دربار تھا، اور اُس نے اپنی کتاب ایرانی تصانیف کی مدد سے لکھی ہے، یہ واقعات بار بار بیان ہوئے ہیں، بلکہ کبھی ایک خاندان سے منسوب ہوئے ہیں، کبھی دوسرے سے، مثلاً سائرس[4]، ایکی می نین[5] کے پہلے بادشاہ کو جو واقعات میڈ[6] یا والوں سے لڑنے میں پیش آئے وہ اردشیر ساسانی اور اُس کی پارتھیون[7] کی جنگ

[1] Ctesias، [2] Artaxerxes، [3] Mnemon، [4] Cyrus، [5] Achaemenian، [6] Medes، [7] Parthian،

کے حالات سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، اسی طرح عقاب، سیمرغ اور ہما شاہ پسند پرندوں کا

ے کی می بنز زال[۱] اور اردشیر کا محافظ ہونا، اسی طور پر نودیر کیانی اور پیروز ساسانی کو

تورانی دشمنوں سے قارین کے خاندان کے دو شخصوں کا بچانا اور اسی قبیل سے دارا

اور پیروز کی ملتی جلتی سرگذشتیں ہیں جو قابلِ غور ہیں،

یات کار زریراں | زریادریس[۲] برادر ہس ٹاس پیس[۳] اور شاہزادی اوداتس[۴] کا قصہ ہم تک

ے تھینیس[۵] سے پہنچا ہی، یہ قصہ اس نے سکندر کی اس تاریخ سے لکھا ہی جو اسکے دیوان[۶] چارس نے

تصنیف کی تھی، یہی داستان سب میں پرانی پہلوی کتاب یات کار زریراں[۷] میں بیان ہوتی

ہے، جو پانسو برس قبل حضرت عیسیٰؑ کے لکھی گئی تھی، یہ چھوٹی مگر ضروری کتاب سب میں قدیم

فارسی کتاب ہے جس میں بہادری کے قصے درج ہیں، گو اسمیں ایک ہی قصہ ہی، مگر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ان کل کہانیوں پر عبور ہے، اسی کتاب کو شاہنامہ

گشتاسپ یا پہلوی شاہنامہ کہتے ہیں۔"

نولدکی کہتا ہے کہ "اگر ہم کو سراسر دھوکا نہوا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس

قصہ میں وہ روح موجود ہے جس کا وجود کئی اور قوموں کے بہادری کے قصوں میں

موجود ہے، خلاصۂ حال سب کو معلوم ہے، اس کے خاص خاص حصوں کو کوشش کرکے

زینت دی گئی ہی، اور اس ڈھانچ میں تھوڑی سی کمی بیشی اور ترتیب سے کم و بیش

ایک مسلسل اور پوری داستان تیار ہو سکتی ہے، اس قصے کے ضروری اجزا

---

۱ Achaemer.ies ۲ Zapiatres ۳ Hystaspes ۴ Odatis

۵ Athessaeus ۶ Charas ۷ Zariran ۱- Yatkar

عربی کے اس مختصر ترجمہ میں موجود ہیں جو طبری نے کیا ہے، اور جو شاہنامہ کے بیان سے بالکل مطابق ہے، بعض جگہ تو لفظ بہ لفظ وہی ہے، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُسی عام قدیمی روایت سے لیا گیا ہے، جو شاہ نامہ کا ماخذ ہے،

اس نئی ترتیب سے جس کی طرف نولدکی نے اشارہ کیا ہے، وہ اضافہ اور اصلاح مراد ہے، جس سے مختلف حصے ایک دوسرے کا پیوند ہو کر ایک دلکش داستان بنجائیں اور کمی سے یہ غرض ہے کہ وہ باتیں اور الفاظ جو مسلمانوں کو ناگوار ہیں نہ آنے پائیں، جیسا فردوسی اور اوروں نے کیا ہے،

شاہنامہ کے ساسانی حصہ کے متعلق ہمارے پاس ایک پہلوی کتاب کارنامک ارتخشتر پاپکاں اصل پہلوی اور جرمن میں موجود ہے، جب اس کتاب کا شاہنامہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے بڑی ایمانداری برتی ہے، اور ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھکر اور بڑھ جاتی ہے کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے اُن سے ترتیب وار مطابقت پائی جاتی ہے، کارنامک غالباً ۶۰۰ء میں تصنیف ہوئی اور اگا تھی اس کا جو ۵۸۰ء میں تھا شاہانِ ایران کی تاریخوں کا ساسان پاپک اور ازدشیر کے حالات میں حوالہ دینا، اس بات کا زائد ثبوت ہے، کہ شاہنامہ کے مختلف قصے اس زمانہ کی پہلوی کتابوں میں پائے جاتے تھے،

فردوسی کے شاہنامہ پر جو دیباچہ تیمور کے پوتے بایسنقر کے حکم سے

۱۴۲۵ء میں لکھ کر لگایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہقان دانشور کا
پورا صحیح نسخہ اس ساری داستان کا کیومرث سے لیکر خسرو پرویز یعنی ۶۲۸ء
تک کا یزدجرد ثانی آخری سامانی فرماں روا کے عہد میں تیار ہو چکا تھا، اس پر
نولدکی لکھتا ہے، کہ "یہ کتاب خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، مگر عرب مورخوں کے
ترجموں کا فردوسی سے خسرو پرویز کی وفات تک مطابق ہونا اور بعد کو مختلف
اس بارۂ خاص میں اُس کی صداقت کا ثبوت ہے، اور اُس کی انتہا درجہ کی
ہمدردانہ کوشش اور حق پسندی سے پایا جاتا ہے، کہ وہ بادشاہ کی سرپرستی
اور نگرانی میں تصنیف ہوئی تھی۔"

اس پہلوی خدائی نامہ کا جس کا حمزہ اور مصنف فہرست وغیرہ اور دیگر
عرب مورخوں نے ذکر کیا ہے، ابن المقفع نے آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں
عربی میں ترجمہ کیا اور اس ذریعہ سے تمام عربی دانوں کو اس کا حال معلوم ہو گیا، مگر
نہایت افسوس ہے کہ یہ ترجمہ ضائع ہو گیا، اسی طرح وہ فارسی نظم کا ترجمہ جو ۹۵۷ء
میں ابو المنصور المعمری کے حکم سے ہوا تھا، اور ہرات، سیستان، شاہ پور اور طوس
کے چار پارسیوں نے، ابو منصور ابن عبد الرزاق حاکم طوس کے لئے کیا تھا، جیسا
کہ البیرونی اور نولدکی نے لکھا ہے، اسی کی بنا پر دقیقی نے ایک شاہ نامہ نوح
ابن منصور سامانی بادشاہ کے لیے جو ۹۷۶-۹۹۷ء تک رہا، فارسی نظم میں لکھنا شروع
کیا تھا، مگر سلطنت گشتاسپ اور زردشت کی آمد کے متعلق چند ہی ہزار

شعر لکھنے پایا تھا کہ اُسے ایک ترکی غلام نے مار ڈالا، یہ فردوسی ہی کا حصہ تھا کہ چند سال بعد اس نے اس قومی فسانے کو جو دقیقی نے شروع کیا تھا، ساٹھ ہزار اشعار میں جس میں دقیقی کے اشعار بھی شامل ہیں تکمیل کو پہنچایا، اتنا کہنا یہاں اور ضروری ہے کہ شاہنامہ قوم کا پورا پورا افسانہ ہے،

داستان اردشیر | اس داستان کی جتنی کہانیاں، شاہنامہ اور کارنامک پہلوی میں پائی جاتی ہیں حسب تفصیل ذیل ہیں،

(۱) ساسان جو بہمن دراز دست کی پانچویں پشت میں تھا، پاپک شاہ فارس کے ہاں مویشی چرانے پر نوکر ہے، پاپک خواب دیکھتا ہے کہ ساسان نسل شاہی سے ہے، اُس سے بلطف و خوشی پیش آتا ہے، اپنی بیٹی کی اس سے شادی کرتا ہے اور اردشیر اُس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے،

(۲) پاپک اردشیر کو متبنیٰ کرتا ہے، اس کے جوان ہونے پر اسکی دلاوری عقلمندی اور شاہانہ خوبیوں کا تذکرہ اردوان (آخری بادشاہ اشکانی) تک پہنچتا ہے، وہ اردشیر کو طلب کرتا ہے، خاطر و مدارات سے پیش آتا ہے، ایک روز اردوان کے بیٹے کے ساتھ شکار کو جاتا ہے، اور وہ اردشیر کے مارے ہوئے شکار کو اپنا بتلاتا ہے اس پر بے قدر ہو کر میر آخور اصطبل شاہی مقرر ہوتا ہے،

(۳) اردوان کی ایک معتمد ہوشیار اور نازنین پرستار اردشیر پر ترس کھاتی ہے اور دو تیز رفتار گھوڑے مہیا کر کے اس کے ساتھ فارس کو بھاگ جاتی ہے، اردوان

تعاقب کرتا ہے، مگر یہ سنکر کہ شوکتِ خسروی ایک خوبصورت مینڈھے کی شکل میں اردشیر تک پہنچ گئی ہے واپس آتا ہے،

(۴) اردشیر آشکانیوں وغیرہ سے لڑتا ہے، اردوان اور اس کے بیٹے کو شکست دیتا ہے اور خود کردوں سے زک اٹھاتا ہے،

(۵) داستان ہفتان بوخت (ہفتواد) اور کرم کرمانی مع جنگ متھرک (مسرک)

(۶) اردوان اپنی بیٹی (اردشیر کی زوجہ) کو موت کا حکم سناتا ہے، ایک موبد جس کا نام ابرسام ہے اس کی جان بچاتا ہے، اسی کے پیٹ سے شاہو پیدا ہوتا ہے، اور باپ اس بچہ کو لیجاتا ہے،

(۷) اردشیر ہندوستان کے حاکم کید یا کیت سے یہ سنکر کہ ایران کی بادشاہت اس کے یا اس کے دشمن متھرک کے گھرانے میں جائیگی، متھرک کا استیصال کرتا ہے، اس کی ایک لڑکی قتلِ عام سے بچکر کسانوں میں پرورش پاتی ہے، شاہو اسے دیکھ کر اس پر عاشق ہوتا ہے، اپنی شادی اور اپنے بیٹے ہرمزد کی پیدائش کو اپنے باپ اردشیر سے چھپاتا ہے، اور ہرمزد کو سات برس کی عمر میں چوگان کے میدان کی بہادری دیکھکر اردشیر پہچان لیتا ہے،

ہر متنفس جس نے کارنامک اور شاہنامہ کا یہ حصہ ساتھ ساتھ پڑھا ہے اس بات کا اقرار کریگا کہ شاہنامہ پورا چربہ کارنامک کا ہے، اس لئے کہ جزئیات میں بھی اختلاف نہیں ہے، ہمارے اس خیال کو کہ فردوسی نے جن قدیم کتابوں سے شاہنامہ

لکھا ہے اُن سے الگ نہیں گیا، پہلوی کے قصہ زریر اور شاہنامہ کے مقابلہ سے اور بھی تقویت ہو جاتی ہی، یہ امر اتفاقی ہے کہ ان حصوں کا ہم اصل کتابوں سے مقابلہ کرسکے، مگر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اور مقامات پر بھی جہاں ہمکو جانچ پرتال کے ذریعہ حاصل نہیں ہیں وہاں بھی فردوسی نے ادنیٰ بات بھی قدیم ماخذوں کے خلاف نہیں لکھی ہوگی، یہاں ہم داستانِ اردشیر کی دونوں روایتوں میں سے صرف دو ایک باتوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں، زیادہ گنجایش نہیں ہی، اوّل ہم اُسکی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں،

کارنامک

سکندر رومی کی وفات پر ایران میں ۲۴۰ مختلف گروہوں کے لوگ حکمراں تھے، اردوان ان سب میں سربرآوردہ تھا اور اصفہان، فارس اور قرب و جوار کے حصہ پر قابض تھا، پاپک محافظ سرحد اور اردوان کی طرف سے فارس کا گورنر تھا اور اصطخر میں رہتا تھا، اس کے کوئی بیٹا نہ تھا، جس سے اس کا نام چلتا، ساسان پاپک کا گوالا تھا اور ہمیشہ اپنے گلوں میں رہتا تھا، مگر وہ دارا ابن دارا کی اولاد میں تھا اور سکندر کے بُرے زمانہ میں وہ بھاگ کر گڈریوں میں جا ملا تھا، پاپک کو یہ بات معلوم نہ تھی، ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ ساسان کے سر سے سورج نکلا ہی، اور اس نے تمام عالم کو منور کر دیا، دوسری رات دیکھا کہ ساسان ایک سپید ہاتھی پر جس پر

لہ شاہنامہ میں اسطرح لکھا ہوا ہے،

قیمتی جھول پڑی ہوئی ہے، سوار جا رہا ہے اور تمام "کشور" کے لوگ اس کے ارد گرد ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں، تیسری رات اس نے دیکھا کہ آتش فروبہ گشسپ اور مہر، ساسان کے گھر میں روشن ہے اور ساری دنیا میں اجالا پھیلا ہوا ہے، ان خوابوں سے گھبرا کر اُس نے تعبیر دینے والوں اور دانش مندوں کو بلایا اور اُن سے تینوں خواب بیان کیے، معبروں نے کہا تو وہ شخص جس کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے یا اسکی اولاد میں سے کوئی شخص تمام دنیا کا بادشاہ ہوگا، کیونکہ سورج اور قیمتی جھول والا ہاتھی، زور، طاقت اور فتح کی علامت ہیں آتش فروبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو مذہب سے خوب واقف ہیں اور اپنے ہمسروں میں ممتاز ہیں، آتش گشسپ سے جنگجو اور جرگوں کے سردار اور آتش برزین مہر سے دنیا کے کاشتکار مراد ہیں، پس بادشاہت اُسے یا اُس کی اولاد کو ملے گی،، پاپک نے یہ تقریر سُنکر سب کو رخصت کیا اور ساسان کو بلا کر اس سے پوچھا، "تم کس خاندان اور نسل سے ہو تمہارے بزرگوں اور پرکھوں میں سے کوئی بادشاہ ہوا ہے"؟ ساسان نے کہا کہ اگر جان بخشی ہو تو عرض کروں، پاپک نے اجازت دی، ساسان نے اپنا راز فاش کر دیا اور سارا حال بتلا دیا، پاپک یہ سن کر خوش ہوا اور کہا کہ میں تمہاری حالت بہتر کر دونگا اور اسکے حکم دیتے ہی پورا لباس شاہی آیا اور ساسان کو عطا ہوا، جب ساسان نے کہا پہنو، اُس نے پہن لیا، وہ پاپک کے حکم سے چند روز عمدہ غذائیں کھاتا رہا جس سے اس کے جسم میں طاقت آگئی، پاپک نے پھر اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی، اور قسمت کی

یاوری سے وہ حاملہ ہوگئی اور اس سے تخشتر پیدا ہوا،

فروبہ، فرہ باگ یا فرن ہاگ کی جگہ فردوسی نے خرید لکھا ہے، کارنامک کی عبارت جہاں ساسان کی آمد کا ذکر ہے، بڑی روکھی پھیکی ہے، فردوسی نے اپنے زورِ قلم سے اس میں جان ڈالدی ہے، اور یہ منجملہ اُن مقامات کے ہے جو فردوسی نے نہایت دلکش پیرایہ میں لکھے ہیں،

اشعار فارسی متعلق قصہ بابک و ساسان

چو دارا بہ رزم اندرون کشتہ شد — ہمہ دودہ را روز برگشتہ شد

پسر بُد مر او را یکے شادکام — خردمند و جنگی و ساساں بہ نام

از اں لشکرِ روم بگریخت اوی — بدام بلا در نیا میخت اوی

بہ ہندوستان در بزاری بمرد — ز ساساں یکے کودکے ماند خرد

بریں ہم نشاں تا چہارم پسر — ہمے نام ساسانش کردے پدر

چو کہتر پسر سوے بابک رسید — بدشت آمد و سرشباں را بدید

بدو گفت مزدورت آید بکار — کہ ایدر گزارد بہ بد روزگار،

بہ پذرفت بدبخت را سرشباں — ہمی داشت بارنج روز و شباں

شبے خفتہ بُد بابک روزیاب — چناں دید روشن روانش بخواب

کہ ساسان بہ پیل ژیاں برنشست — گرفتہ یکے تیغ ہندی بہ دست

بہ دیگر شب اندر چو بابک بخفت — ہمی بود بامغزش اندیشہ جفت

چناں دید در خواب کاتش پرست سه آتش فروزاں به بروے بدست
چو آذر گشسپ و چو خرّاد و مهر فروزاں چو بهرام و ناهید و مهر
همه پیش ساسان فروزاں بدے بهر آتشے عود سوزاں بُدے
سر بابک از خواب بیدار شد روان و دلش پُر ز تیمار شد
کسانیکه در خواب دانا بُدند بداں دانش اندر توانا بُدند
به ایوانِ بابک شدند انجمن بزرگان فرزانه و راے زن
چو بابک سخن برکشاد از نهفت همه خواب یکسر بدیشاں بگفت
پُر اندیشه شد زاں سخن، رهنماے نهاده بدو گوش پاسخ سراے
سرانجام گفت اے سرافراز شاه به تاویل ایں کرد باید نگاه
کسے را که دیدی تو زینساں بخواب به شاهی برآرد سر از آفتاب
گرایدوں که ایں خواب ازو بگذرد پسر باشدش کز جهاں برخورد
چو بابک شنید ایں سخن گشت شاد بر اندازه شاں یک بیک هدیه داد
بفرمود تا سر شباں از رمه، بر بابک آمد به روز دمه
بیامد دماں پیش او با گلیم پُر از برف پشمین و دل پُر ز بیم
بپرداخت بابک ز بیگانه جاے پدر شد پرستنده و رهنماے،
ز ساساں بپرسید و بنواختش بر خویش، نزدیک بنشاختش
بپرسیدش از گوهر و از نژاد شباں زو بترسید و پاسخ نداد

ازاں پس بدو گفت کاے شہریار	شباں را بجاں گر دہی زینہار
بگویم زگوہر ہمہ ہرچہ ہست	چو دستم بہ پیماں بگیری بدست،
چو بشنید بابک زباں برکشاد	زیزدان نیکی دہش کرد یاد
بہ بابک چنیں گفت ازاں پس جواں	کہ من پور ساسانم اے پہلواں
چو بشنید بابک فرو ریخت آب	ازاں چشم روشن کہ او دید خواب
بیاورد پس جامہ پہلوے	یکے اسپ پر آلت خسروے
یکے کاخ پُر مایہ او را بساخت	ازاں سر شبانی سرش بر نواخت
بدو داد پس دختر خویش را	پسندیدہٗ وافسرِ خویش را

کارنامک پہلوی اور شاہنامہ کے بیان میں بہت خفیف فرق ہے جو عموماً تاریخی واقعات میں ہوتا ہے،

مسٹر براؤن نے اور بھی چند داستانیں کارنامک اور شاہنامہ کی مطابقت دکھانے کیلئے درج کی ہیں، لیکن ہم نے طول کے لحاظ سے قلم انداز کیا،

فردوسی کی وقعت شاعری کی حیثیت سے

عام اتفاق ہے کہ ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک نہیں پیدا ہوا، انوری اُن شعرا میں ہے جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہمسر قرار دیا ہے، چنانچہ مشہور ہے،

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

لیکن خود انوری کہتا ہے کہ فردوسی ہمارا خداوند ہے، اور ہم اُسکے بندے ہیں،

آفریں بر روانِ فردوسی آں ہمایوں نژاد فرخندہ

آں نہ استاد بود و ما شاگرد آں خداوند بود و ما بندہ

نظامی کہتے ہیں،

سخن گوی پیشینہ دانای طوس کہ آراست زلفِ سخن چوں عروس

علامہ ابن الاثیر نے مثل السائر کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت و کثرتِ الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کرسکتی، اور درحقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے "

یورپ کے فضلا بھی جو زبان فارسی سے واقف ہیں عموماً فردوسی کے کمالِ شاعری کے معترف ہیں، سرگور اوسلی نے تذکرۃ الشعرا میں فردوسی کو ہومر سے تشبیہ دی ہے اگرچہ ساتھ ہی یہ ناتوان بینی بھی ظاہر کی ہے کہ" وہ اگرچہ دراصل ہومر کا ہمسر نہیں ہوسکتا، لیکن ایشیا میں اگر کوئی ہومر ہوسکتا ہے تو وہی ہے "

لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مسٹر براؤن جو آج کل فارسی دانانِ یورپ میں سب سے ممتاز ہیں، فردوسی کے کمالِ شاعری کے منکر ہیں، وہ اپنی کتاب لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں لکھتے ہیں کہ فردوسی کے بعد جو شعرا پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات اور شوکتِ الفاظ دونوں حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں، شاہنامہ سبعہ معلقہ کی بھی برابری نہیں کرسکتا" صاحب موصوف کو اس پر حیرت

کہ شاہنامہ تمام اسلامی دنیا میں اس قدر کیوں مشہور عام ہوگیا، پھر خود اسکی وجہ یہ بتائی ہے کہ شاہنامہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی فخریہ داستانیں ہیں، اسلئے حب قوم نے اس کا سکہ جما دیا"

ہم ان سب باتوں کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں،

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزش نۂ ناصح　　　بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کن

شاہنامہ کی خصوصیات

اب ہم شاہنامہ کے اوصاف کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں،

پہلی خصوصیت

۱- اسلام کا خاصہ ہے کہ جہاں جہاں گیا ملک کی زبان سرے سے بدل دی یا اس قدر اس کو مغلوب کر دیا کہ وہ مستقل اور آزاد زبان نہیں رہی، اسلام سے پہلے مصر و شام میں قبطی اور سریانی بولی جاتی تھی، اسلام کے ساتھ تمام ملک کی زبان عربی ہوگئی یہانتک کہ آج عیسائی یہودی وغیرہ بھی عربی زبان کے سوا اور کوئی زبان نہیں بول سکتے، ایشیاے کوچک اور قسطنطینہ میں ترک گئے تو ملکی زبان ترکی ہوگئی، کابل اور قندھار کی اصلی زبان پشتو ہے، لیکن خواص فارسی بولتے ہیں، جو اسلامی حکمرانوں کی زبان تھی ایران اور ہندوستان سخت جان تھے، جہاں ملک کی اصلی زبان قائم رہی لیکن عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہوگئے کہ ان کی آمیزش کے بغیر فارسی یا اردو لکھنا چاہیں تو لزوم مالایلزم کی محنت اٹھانی پڑتی ہے،

ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہوگئی تھی، عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا، اسکے چار شعر آج موجود ہیں، جن میں

نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں، رودکی اور ابوشکور بلخی وغیرہ کا کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے، سلطان محمود کے زمانہ میں ایک فاضل نے شاہنامہ کے جواب میں عمرنامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی، وہ ہماری نظر سے گذری ہے، اس کا بھی یہی حال ہے، اسی زمانہ میں شیخ بوعلی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے، لیکن عہدہ برآ نہ ہو سکا، فردوسی کی قدرت زبان دیکھو کہ ساٹھ ہزار شعر لکھکر ڈالدیئے، اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں، اگرچہ اس خصوصیت کا موجد دقیقی ہے، لیکن کل ہزار شعر اور صرف چند معمولی واقعات ہیں، بخلاف اس کے فردوسی نے ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں گوناگوں مطالب ادا کئے اور زبان کے خالص ہونے میں فرق نہ آنے پایا، عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں اکثر وہ ہیں جو خاص مصطلح الفاظ ہیں، مثلاً دین، میمنہ، میسرہ، قلب، سلاح، عنان وغیرہ وغیرہ، یہ الفاظ اس طرح اس زبان میں شائع تھے، جس طرح آج کل اردو میں جج، کلکٹر، ٹکٹ، اسٹیشن وغیرہ ہیں کہ انکے بجائے اگر کوئی شخص اور الفاظ استعمال کرے تو ناموزوں معلوم ہونگے،

حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ اصطلاحیں آتی ہیں اور وہ اس بے تکلفی سے سادی فارسی میں ان کو ادا کرتا ہے، ہے کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں، بوعلی سینا نے بھی حکمت علائیہ میں یہ کوشش کی، لیکن اس کا نمونہ دیکھو، ابطال غیر متناہی کے استدلال میں لکھتا ہے،

"پیشی و پسے بالطبع است چنانکہ اندر شمارست ما بہ عرض چنانکہ اندر اندازہ

است کہ از ہر کدام سو کہ خواہی آغاز کنی وہرچہ اندروے پیشی وپسی است بالطبع باوے مقداری ست کہ اورا بہرہ ہا بہر جا کہ بودند ہمہ بیک جاے حاصل وموجود بودوے متناہی است "

غور کرو اس کوشش کے ساتھ کس قدر عربی الفاظ اب بھی باقی رہ گئے اور جن عربی الفاظ کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ اس قدر نامانوس اور بیگانہ ہیں کہ عبارت معما ہو کر رہ گئی، عبارت کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزوں میں جب تقدّم وتاخر ہوتا ہے تو دو طریقہ سے ہوتا ہے، بلا واسطہ جس طرح ایک عدد دو پر مقدم ہے، یا بواسطہ جس طرح مسافت میں آگا پیچھا ہوتا ہے کہ گو ایک حصہ کو مقدم اور دوسرے حصہ کو موخر کہتے ہیں، لیکن جہاں سے چاہیں مسافت کو شروع کر سکتے ہیں، اب قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز میں بالطبع تقدم وتاخر ہوگا، ضرور ہے، کہ اس میں مقدار ہو اور مقدار کے تمام اجزا مرتب ہوں، یہ بھی ضرور ہے، کہ ایسی چیز متناہی ہو،

غور کرو، بوعلی سینا کی عبارت سے کیا کوئی شخص یہ مطلب سمجھ سکتا ہے؟

فردوسی نے آغاز کتاب میں مخلوقات کی پیدائش کی ابتدا، عناصر کا وجود اور ان کی ترتیب اور انقلابات لکھے ہیں،

از آغاز باید کہ دانی درست	سرمایۂ گوہراں از نخست،
کہ یزداں زناچیز چیز آفرید	بداں تا توانائی آمد پدید،
وزو مایۂ گوہر آمد چہار	برآوردہ بے رنج وبے روزگار

نخستیں کہ آتش ز جنبش دمید | ز گرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود | ز سردی ہماں باز ترسی فزود
چو ایں چار گوہر بجاے آمدند | ز بہر سپنجی سرائے آمدند
گیارست، با چند گونہ درخت | بزیر اندر آمد سراں شان بخت
بیالد ندارد جزیں نیروے | نہ پوید چو پویندگاں ہر سوے
نگہ کن بریں گنبد تیز گرد | کہ درماں ازوی ست و زوی ہست درد
نہ گشتِ زمانہ بفرسایدش، (گردش) | نہ ایں رنج و تیمار بگزایدش
نہ از گردش آرام گیرد ہمی | نہ چوں ما تباہی پذیرد ہمی

یونانیوں کے نزدیک آفرینش کی ابتدا اور اسکی تاریخ یہ ہے کہ خدا نے مادہ پیدا کیا، مادہ سے عناصر پیدا ہوئے، حرکت سے آگ پیدا ہوئی، آگ کی گرمی نے یبوست پیدا کی جس سے خاک کا وجود ہوا، پھر سکون کی وجہ سے رطوبت پیدا ہوئی، رطوبت نے پانی پیدا کیا، اس طرح چار عنصر پیدا ہوئے، پھر نباتات کا وجود ہوا جن میں صرف نمو کی قوت ہے، متحرک بالارادہ نہیں،

آسمان کی نسبت یونانیوں کا خیال تھا کہ وہ ابدی ہیں، اور امتدادِ زمانہ سے ان میں تغیر اور زوال نہیں ہو سکتا، فردوسی نے ان مسائل کو ایسے سادہ اور صاف الفاظ میں ادا کیا ہے کہ معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان میں فلسفیانہ اصطلاحیں ہیں، لیکن درحقیقت سب فلسفہ کے خاص الفاظ ہیں،

ان کے مقابل کے عربی الفاظ دیکھو،

سرمایہ	مادہ	توانائی	وجود
گوہر	عنصر	جنبش	حرکت
آرام	سکون	پوئیدہ	متحرک بالارادہ
گشت	دوراں	فرسودن	تغیّر
تباہی	فنا		

اس طرح اور بہت سے الفاظ ہیں، ہم نے صرف نمونہ دکھایا ہے،

دوسری خصوصیت

۲- ایشیائی تاریخوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں بجز جنگ و خونریزی کے اور کچھ نہیں ہوتا، یعنی وہ حالات بالکل نہیں ہوتے جن سے اس زمانہ کے ملکی معاملات اور قوم کی تہذیب و معاشرت کا حال کھل سکے، یہ شکایت بہت کچھ صحیح ہے، لیکن شاہنامہ اس سے مستثنیٰ ہے، شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے، لیکن عام واقعات کے بیان میں اس تفصیل سے ہر قسم کے حالات آتے جاتے ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہ نامہ کی مدد سے اُس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے، بادشاہ کیونکر دربار کرتا تھا، امرار کس ترتیب سے کھڑے ہوتے تھے، عرض معروض کرنے کے کیا آداب تھے، انعام و اکرام کا طریقہ کیا تھا، بادشاہ اور امرار کا درباری لباس کیا ہوتا تھا، فرامین اور توقیعات کیونکر اور کس چیز پر لکھے جاتے تھے، نامہ و پیام کا کیا انداز تھا، مجرموں کو کیونکر

سزائیں دیجاتی تھیں، بادشاہی احکام پر کیونکر نکتہ چینی کیجاتی تھی، وغیرہ وغیرہ،

شادیوں کے کیا مراسم تھے، جہیز میں کیا دیا جاتا تھا، عروسی کی کیا کیا رسمیں تھیں، دولھا اور دولھن کا کیا لباس ہوتا تھا، پیشخدمت، غلام اور لونڈیوں کی وضع اور انداز کیا تھا،

خط کتابت کا کیا طریقہ تھا، کس چیز سے ابتدا کرتے تھے، خاتمہ کی عبارت کیا ہوتی تھی، خطوط کس چیز پر لکھے جاتے تھے، ان کو کیونکر بند کرتے تھے، کس چیز کی مہر لگاتے تھے،

مالگزاری کے ادا کرنے کا کیا دستور تھا، زمینوں کی کیا تقسیم تھی، مالگذاری کی مختلف شرحیں کیا تھیں، ٹیکس کیا کیا تھے، کون کون لوگ ٹیکس سے معاف ہوتے تھے،

یہ تمام باتیں شاہنامہ سے بہ تفصیل معلوم ہوتی ہیں، نمونہ کے طور پر ہم چند مثالیں نقل کرتے ہیں،

(۱) بیژن کی مہم میں کیخسرو نے رستم کو زابل سے بلایا ہے، اور اُس کے لئے باغ میں دربار کیا ہے، دربار میں تختِ زریں بچھایا گیا ہے، اس پر ایک مصنوعی درخت نصب ہے، جس کا سایہ بادشاہ پر پڑتا ہے، درخت چاندی کا ہے، یاقوت کی شاخیں ہیں، موتیوں کے خوشے دلنے ہیں، زرّیں ترنج اور سیب پھلے ہوئے ہیں، جو مجوف ہیں، اور اُن کے اندر مشک کا برادہ ہے، ہوا جب چلتی ہے تو مشک

چھڑتی ہے، اسی کے قریب قریب وہ فرش تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران کی فتح میں آیا تھا) ان تمام باتوں کو فردوسی نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے،

در باغ بکشادہ سالار بار | نشستگہے ساخت بس شاہوار
بفرمود تا تاجِ زرّین و تخت | نہادند زیرِ گل افشاں درخت
درختے زدند از برِ گاہِ شاہ | کجا سایہ گستر و بر تاج و گاہ
تنش سیم و شاخش زیاقوت زر | بر و گونہ گوں خوشہ ہائے گہر
عقیق و زبرجد ہمہ برگ و بار | فروہشتہ از شاخ چوں گوشوار
ہمہ بار زرّیں ترنج و بہی | میان ترنج و بہی بُد تہی
بدو اندروں مشک سودہ بمے | ہمہ پیکرش سفتہ برسان نے
کرا شاہ برگاہ بنشاندے | براو بادزاں مشک بفشاندے
بیامد نشست او بہ زرینہ تخت | یسر برش ریزندہ مشک از درخت
ہمہ مے گساراں بہ پیش اندرا | ہمہ بر سراں افسراز گوہرا
ہمہ طوق بر سینہ و گوشوار | بہ بر بر ہمہ جامۂ زرنگار

(۲) افراسیاب نے جب اپنی بیٹی فرنگیس کی شادی سیاوش سے کی ہی، اور فرنگیس سیاوش کے گھر آئی ہے، تو اُس کی مہمانی اور عروسی کے ساز و سامان کو اس طرح بیان کیا ہے،

بہ گنج اینچہ بد اندروں نامدار | گزیدند زربفت چینی ہزار

زبرجد طبقها و فیروزه جام — پُر از نافهٔ مشک و پُر عود خام

دو افسر پُر از گوہر گوشوار — دو یاره، یکی طوق و دو گوشوار

ز گستردنیها شتر وار شصت، — ز زر بفت پوشیدنیها سه ست

یکے تختِ زرّیں و کرسی چہار — سہ نعلیں زرّیں زبرجد نگار

پرستنده سی صد به زرّیں کلاه — ز خویشان نزدیک صد نیکخواه

پرستار با جامِ زرّیں دویست — تو گفتی به ایوان درون جائے نیست

ہمی صد طبق مشک و صد زعفران — ہمی رفت گلشہر با خواہراں

اسفندیار کا تابوت رستم نے روانہ کیا تھا، تابوت کے مراسم دیکھو،

یکے نغز تابوت کرد آہنیں — بگسترد فرشے ز دیبائے چین

در اندود یک روئے آہن بہ قیر — پراگند بر قیر مشک و عبیر

وزاں پس کہ پوشید روشن برش — ز پیروزہ بر سر نہاد افسرش

چہل اشتر آورد رستم گزیں — ز بالا فروہشتہ دیبائے چین

یکے اشترے زیر تابوت شاہ — چپ و راست اشتر پس اندر سپاہ

پشوتن ہمی رفت پیش سپاہ، — بریدہ فش و دم اسپ سیاہ

بر و بر نہادہ نگونسار زیں، — ز زیں اندر آویختہ گرز کیں

ہماں نامور خود و خفتان اوے — ہماں ترکش و مغفر جنگجوے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں کسی امیر کا جنازہ نکلتا تھا تو لوہے کے

تابوت میں رکھکر لیجاتے تھے، تابوت کے ایک رخ کو سیاہ رنگ سے رنگ دیتے تھے، پھراس پر مشک وعنبر چھڑکتے تھے، میت کو کپڑے پہناتے تھے اور سر پر تاج رکھتے تھے، تابوت کو اونٹ پر محمل میں رکھتے تھے، اور اس کے دائیں بائیں اور بہت سے اونٹ ساتھ ساتھ چلتے تھے، پیچھے فوج ہوتی تھی، میت کی سواری کا گھوڑا ساتھ ہوتا تھا، اس کی یال اور دم کاٹ دیتے تھے، زین اُلٹ کر رکھتے تھے، میت کے اسلحۂ جنگ زین پر لٹکتے چلتے تھے،

تیسری خصوصیت

(۳) ایشیائی شعرا کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن وعشق کا کہیں اتفاقی موقع آجاتا ہے، تو اس قدر پھیلتے ہیں، کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں، نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں آکر ننگے ہوجاتے ہیں، لیکن فردوسی باوجود اس کے کہ اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے، اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گذر جاتا ہے، بیژن اور منیژہ کی صحبتِ عیش کو جہاں لکھا ہے، لکھتا ہے،

نشستند گہ دو دو می ساختند ۔۔۔ ز بیگانہ خرگہ بپرداختند
پرستندگاں ایستادہ بہ پائے ۔۔۔ ابا بربط و چنگ رامش سرائے
بہ دیبا زمیں کردہ طاؤس رنگ ۔۔۔ ز دینار و دیبا چو پشتِ پلنگ
چہ از مشک و عنبر چہ یاقوت و زر ۔۔۔ سراپردہ آراستہ سربسر

مے سالخوردہ بہ جامِ بلور — برآوردہ بابیژنِ گیو زور،

سہ روز وسہ شب شاد بودہ بہم — گرفتہ براو خواب مستی ستم

زال اور رودابہ کے عاشقانہ اختلاط میں زیادہ پھیلا ہے، پھر بھی یہ رنگ ہی،

گرفت آں زماں دستِ دستاں بدست — برفتند ہر دو بکردار مست

سوئے خانۂ زرنگار آمدند — بداں مجلسِ شاہوار آمدند

شگفت اندراں ماہ بدزالِ زر — بداں روے و بالا وآں موی وفر

دو رخسارہ چوں لالہ اندر چمن — سر جعد زلفش شکن در شکن

زدیدنش رودابہ می نارمید — بہ دزدیدہ دروے ہمی بنگرید

ہمی بود بوس وکنار و نبید، — نگر شیر کو گور را نشکرید[1]

چوتھی خصوصیت

۴- عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا، بے شبہہ یوسف زلیخا میں اسکی شاعری کا رتبہ بہت گھٹ گیا ہے، لیکن یہ اس کے رنج وغم اور دل شکستگی کا زمانہ تھا جب اس کے تمام جذبات افسردہ ہو چکے تھے، یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا، جو اتنی بات پر فردوسی سے ناراض تھے کہ اس نے مجوسیوں کی مدح وثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی، لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے، شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے،

زال رودابہ پر عاشق ہوا ہی، اس کے شوق میں گھر سے نکلا ہی، اس کو خبر ہوتی ہی

[1] یعنی دیکھو شیر نے گورخر کو پاکر شکار نہیں کیا،

وہ لبِ بام آکر کھڑی ہوتی ہے، زال کوٹھے کے برابر آکر اوپر جانے کی تدبیریں سوچتا ہے، رودابہ اپنی چوٹی کھول کر لٹکا دیتی ہے کہ اس کے سہارے چڑھ آؤ، زال زلف کو بوسہ دیتا ہے، اور کمند ڈال کر کوٹھے پر اترتا ہے، دونوں مل جل کر بیٹھتے ہیں، لطف و محبت کی باتیں ہوتی ہیں، شراب کا دور چلتا ہے، یہ سماں دیکھو کس طرح دکھایا ہے،

سپہبد (زال) سوے کاخ بنہاد روے — چناں چوں بود مردم جفت جوے

برآمد سیہ چشم گل رخ بہ بام — چو سروِ سہی بر سرش ماہِ تام

چو از دور دستانِ (زال) سام سوار — پدید آمد آں دخترِ نامدار

دو بیجادہ (یاقوت یعنی لب) بکشاد و آواز داد — کہ شاد آمدی ای جواں مرد شاد

پریروی گفت و سپہبد (زال) شنود — ز سر شعرِ گلنار بکشاد زود،

کمندی کشاد او ز سرو بلند — کس از مشک زاں ساں نپیچد کمند

خم اندر خم و مار بر مار بود — براں عنبریں تار بر تار بود،

فروہشت گیسو ازاں کنگرہ — کہ بازید و شد تا بہ بن یکسرہ

پس از بارہ (قلعہ) رودابہ آواز داد — کہ اے پہلواں (لنگ آیا) بچۂ گرد زاد

بگیر ایں سر گیسو از یک سویم — ز بہرِ تو باید ہمے گیسویم

بداں پروراندیم ایں تار را — کہ تا دستگیری کند یار را

نگہ کرد زاں اندراں ماہروے — شگفتی (متعجب) بماند اندراں روے و موے

بسائید مشکیں کمندش بہ بوس — کہ بشنید آواز بوسش عروس

چنین داد پاسخ کہ این نیست داد	چنین روز خورشید روشن مباد
کمند از رہے بستد و داد خم	بیفگند بالا، نزد، ہیچ دم
بہ حلقہ در آمد سرِ کنگرہ	بر آمد زبُن تا بسر یکسرہ
چو بر بام آن بارہ بنشست باز	بیامد پری روے و بردش نماز

(آگے کے اشعار اوپر گذر چکے)

تم کہوگے کہ رودابہ نے زال کو کہیں جواں مرد، کہیں پہلوان بچہ کہہ کے خطاب کیا ہے، اور خود فردوسی رودابہ کی تعریف میں بالا اور فر وغیرہ الفاظ استعمال کرتا ہے، حالانکہ بزم کی لطافت اور نزاکت ان الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی، لیکن یہ فردوسی کی نکتہ سنجی اور بلاغت شعاری کی دلیل ہے، اس کو معلوم ہے کہ وہ کابل و زابلستان کے محبوب کا ذکر کر رہا ہے، لکھنؤ کا نہیں، وہاں کے لوگ آج بھی اپنے پیارے اور چہیتے کی نسبت یہی الفاظ بولتے ہیں، کابل کا معشوق لکھنؤ کی طرح دھان پان نہیں ہوتا، بلکہ بالیدہ قامت، پُر اندام، اور تنومند ہوتا ہے، اس لئے بالا اور فر کا لفظ وہاں کے معشوق کی اصلی تصویر ہے،

بیژن جب افراسیاب کی سرحد میں پہنچتا ہے، تو گرگیں نے اس سے بیان کیا کہ یہاں سے پاس ایک مرغزار ہے، جہاں سال میں ایک دفعہ افراسیاب کی بیٹی منیژہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کو آتی ہے، اور ہفتوں رہتی ہے، دیکھو فردوسی نے اس موقع پر مرغزار کی بہار اور پریرویوں کے جھرمٹ کی تصویر کس طرح کھینچی ہے،

همه بیشه و باغ و آب روان — یکے جایگاه از درِ پہلوان
زمین پرنیان و ہوا مشک بوے — گلابست گوئی مگر آب جوی
خم آورده از بار شاخ سمن — صنم شد گل وگشت بلبل شمن
خراماں به گرد گلاں بر تدرو — خروشیدنِ بلبل از شاخِ سرو
پریچہرہ بینی ہمه دشت وکوه — ہر سو به شادی نشسته گروه
همه دخت ترکانِ پوشیده رُوے[1] — همه سرو قد و همه مشک بوے
همه رخ پر از گل، همه چشم خواب — همه لب پُر از مے به بوی گلاب

اخیر شعر پر غور کرو "همه چشم خواب"، کے مبالغہ اور بیباختگی پر متاخرین کے ہزاروں تکلفات اور مضمون آفرینیاں نثار ہیں

ایک اور موقع پر ایک پریچہرہ کی تصویر کھینچتا ہے،

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند — به بالا به کردار سرو بلند
دو برگِ گلش سوسن می سرشت — دو شمشاد عنبر فروش از بہشت
بناگوش تابنده خورشید وار — فروہشته زو حلقهٔ گوشوار
لباں از طبرزد زباں از شکر — دہانش مکلل به در و گہر،

ان سادہ اور فطری مبالغوں کو دیکھو "لبان از طبرزد زبان از شکر"

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ وہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے تکلفات سے عہدہ برآ نہیں

---

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ کی رسم ایرانیوں میں بھی قدیم سے ہے،

ہوسکتا، اس انداز میں بھی وہ کسی سے کم نہیں،

به دنبالِ چشمش یکے خال بود | که چشم خودش هم بدنبال بود

سہراب نے جب ایران کی سرحد میں پہنچ کر قلعہ سپید کا محاصرہ کیا ہے تو قلعہ سے ایک عورت مردانہ لباس پہن کر نکلی ہے، اور سہراب سے جنگ آزما ہوئی ہے، دیر تک ردوبدل کے بعد سہراب نے اسکو گرفتار کیا، جھلم چہرے سے ہٹی تو معلوم ہوا کہ عورت ہے، سہراب فریفتہ ہوگیا، لیکن عورت فریب دیکر نکل گئی، سہراب اب سپہگری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا، دیکھو فردوسی اسکے نالہ و زاری کو کس طرح ادا کرتا ہے،

همی گفت ازاں پس دریغا دریغ | که شد ماه تابنده در زیر میغ
غریب آہوئے آمدم در کمند | که از بند جست و مرا کرد بند
عجب ہرن میری کمند میں آیا | کہ خود چھوٹ کر نکل گیا اور مجھکو قید میں ڈالگیا
زہی چشم بندے کہ آں پر فسوں | به تیغم نخست و مرا ریخت خوں
اس شعبدہ کو دیکھو کہ اس جادوگر نے | مجھکو تلوار نہیں ماری لیکن میں قتل ہوگیا
ندانم چه کرد آں فسوں گر بمن | که ناگه مرا بست راهِ سخن
به زاری مرا خود بباید گریست | که دلدار خود را ندانم که کیست
همی گفت و میسوخت از غم بسے | نمی خواست رازش بداند کسے
ولے عشق پنہاں نماند که راز | بهر دم نماید همی اشک باز
غم جاں بر آرد خروش از دروں | اگر چند عاشق بود ذوفنوں

هر چند

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں، استعارات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے، شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں، ع کہ از بند جست و مرا کرد بند، ع بہ تیغم نہ خست و مرا ریخت خوں، یہ سب کچھ ہے، لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی داستان لکھ رہا ہے، محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں، اسلئے فوراً سہراب کو ہومان کی زبان سے نصیحت کرتا ہے، اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح کی نصیحت کا کیا انداز ہے،

انداں کار ہوماں بنودش خبر — کہ سہراب اہست خوں در جگر
ولے از فراست بدل نقش بست — کہ اور اپریشا سینے واد دست
بہ دام کسے پائے بند آمدہ است — ز زلف بتے در کمند آمدہ است
نہاں میکند درد و خونیں دل است — ہوس میرود راہ و پا در گل است
یکے فرصتے جست و گفتش بہ راز — (یعنی بہوس میرود) کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکران جواں — نخواہد کسے کو بود پہلواں
نہ رسم جہانگیری و سروری است — کہ از مہر ماہے بباید گریست
ز توراں بہ کارے بروں آمدیم — شناور بدریاے خوں آمدیم
اگرچند ایں کار باشد بہ کام — ولے ہست در پیش رنجے تمام
بیاید شہنشاہ کاؤس و طوس — چو رستم کہ بر شیر دارد فسوس

(ہرچند)

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے،

توئی مرد میدان این سروراں	چہ کارت بہ عشق پری پیکراں
تو کاے کہ داری نہ بزی بسر	چرا دست بازی بہ کار دگر
بہ نیروی مردی جہاں رابگیر	ز شاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدستِ تو آید فراز	بہر جاے خوباں برندت نماز
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد	دلش بستۂ بند پیکار شد
بگفت اے سرنامدارانِ چین	بگفتار خوبت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو داروی جانِ من	کنوں با تو نو گشت پیمان من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب	در آرم بفرمان افراسیاب
بگفت این و دل راز دلبر بکند	بر آمد بر افرازِ تختِ بلند

دیکھو شجاع دامِ عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے۔ فردوسی نے موقع پاکر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا، اور پھر متانت اور شائستگی کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹا، متاخرین بلکہ نظامی و سعدی کو بھی اتنا سہارا ہاتھ آجاتا تو خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے،

پانچویں خصوصیت

(۵) شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذباتِ انسانی کا اظہار ہے، ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعرار کا پیشرو اور امام ہے، وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے، اسکے تمام جزئیات اور گردوپیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے پھر انکو اس خوبی کیساتھ ہو بہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور شعرا یا تو

واقعہ کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر ڈالنا ضروری نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں لیکن طبیعت فطرت شناس نہیں ہوتی، اس لئے باریک باتوں پر نظر نہیں پڑتی یا پڑتی ہی لیکن زبان پر قدرت نہیں کہ جوں کا توں ادا کردیں، اس لئے یا بات کو بدل کر کہتے ہیں یا استعارات و تشبیہات کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، تم دیکھتے ہو کہ فردوسی استعارہ کے پاس ہو کر نہیں نکلتا، تشبیہیں وہی پاس پاس کی لیتا ہے، مجاز کو بہت کم ہاتھ لگاتا ہی، اسکی یہ وجہ نہیں کہ وہ ان باتوں میں قاصر ہی، بلکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں واقعہ کے چہرہ پر نقاب ڈالدیتی ہیں، اور اس کا اصلی خط و خال نظر نہیں آتا، غور کرو، یہ لکھنا مقصود ہی کہ خاقان چین ہاتھی پر ہی، رستم نے کمند پھینکی اور اسکو گرفتار کرکے ہاتھی سے پٹک دیا، فردوسی اسکو اسطرح ادا کرتا ہی،

چو از دستِ رستم رہا شد کمند — سر شہریار اندر آمد بہ بند

ز پیل اندر آورد و زد بر زمیں، — بہ بستند بازوے خاقانِ چین،

نظامی کو اسی قسم کا موقع پیش آتا ہے وہ کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہریار — بینداخت چوں چنبر روزگار

بے شبہہ عدو بند کے لفظ سے جملہ کی ترکیب چست ہوگئی "چنبر روزگار"، کی تشبیہ نے بھی ندرت پیدا کی، یہ سب کچھ ہوا لیکن سننے والے پر یہ اثر ہوا کہ اصل واقعہ کے بجائے اسکی توجہ الفاظ اور تشبیہ کی طرف متوجہ ہوگئی، اور کمند میں گرفتار ہونے کی اصلی حالت سامنے نہ آسکی، یہی نکتہ ہے کہ فردوسی واقعات اور جذبات کے بیان کرنے میں استعارات اور تشبیہات وغیرہ سے بہت کم کام لیتا ہی، اور جب اسکو طباعی اور انشا پردازی کا

زور دکھانا ہوتا ہے، تو دوسرے موقعے تلاش کرتا ہے، چنانچہ اسکی تفصیل آگے آتی ہی،

واقعہ نگاری کے دقیق نکتوں پر اس کی نظر جس طرح پڑتی ہے، اس کی ایک دو مثالیں ہم لکھتے ہیں،

پہلوان جب جوش شجاعت میں لبریز ہوتا ہی تو اکثر یہ ہوتا ہی کہ لڑائی بھڑائی کچھ نہیں، تنہا بیٹھا ہے، لیکن آپ ہی آپ بپھرا پڑتا ہی، اور جوش میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، سہراب جب ایرانی فوج کے ایک ایک سردار پر نظر ڈال کر ہجیر سے اُنکا نام ونشان پوچھتا ہی تو اس کی نظر رستم پر پڑتی ہے، اور ہجیر سے کہتا ہے، یہ کون شخص ہی جس کی یہ حالت ہے کہ

بجوشد ہر زماں بر خروشد ہمے | تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے
آپ ہی آپ بپھر رہا ہے | اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ گویا دریا جوش مارتا ہے

ایک جسیم اور تناور پہلوان کبھی تخت پر بیٹھا ہوتا ہی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے تخت پر چھایا جاتا ہے، اس حالت کو فردوسی نے اُس موقع پر جب رستم سہراب کے دیکھنے کو گیا ہے اور سہراب تخت پر بیٹھا ہوا اپنے پہلوانوں سے باتیں کر رہا ہی، اس طرح ادا کیا ہے، ع تو گفتی ہمہ تخت سہراب بود

سہراب نے کیکاؤس کے خیمہ کے پاس جاکر برچھی سے خیمہ کی میخیں اُکھاڑ کر پھینکدی ہیں، فردوسی اس واقعہ کو اس طرح ادا کرتا ہی،

ازاں پس بجنبید از جاے خویش | بہ نزدیک پردہ سرا رفت پیش

خم آورد پشت و سنان سیتیج | بزد تند و بر کند ہفتاد میخ،
سراپردہ یک بہرہ آمد ز پائے | ز ہر سو بر آمد دم کرہ نائے

عام شعرا اگر اس واقعہ کو لکھتے تو صرف اس پر قناعت کرتے کہ سہراب نے میخیں اکھاڑ کر پھینکدیں، لیکن یہ خصوصیات کہ "وہ جھکا، جھک کر زور سے نیزہ مارا، ستر میخیں اکھاڑ کر پھینکدیں خیمہ کا ایک حصہ گر پڑا" نظرانداز کر جاتے، حالانکہ واقعہ کی تصویر کھینچنے کے لئے ان تمام باتوں کا ادا کرنا ضروری ہے،

اسی تفصیلی واقعہ نگاری کی بدولت ہمکو بہت سے ایسے محاروں تک رسائی ہوتی ہے جو یوں کبھی عام طریقۂ بیان میں نہیں آسکتے تھے،

مثلاً سہراب نے جب رستم کو گرز مارا ہے تو رستم تلملا جاتا ہی، مگر ضبط سے کام لیتا ہے اور سہراب پر ظاہر نہیں ہونے دیتا، اس واقعہ کو اردو کا محاورہ داں صرف اس لفظ سے ادا کریگا کہ "پی گیا"، فردوسی نے بھی صرف محاوروں سے کام لیا، چنانچہ کہتا ہے، ع بہ پیچید و در دانہ دلیری بخورد، رستم ایک معرکہ میں صرف کمند ہاتھ میں لیکر گیا ہے، حریف سے سوال جواب ہوئے تو اس نے طنز سے کہا کہ "اس دھاگے کے بل پر بہت نہ اتراؤ"، فردوسی اس طنزیہ محاورہ کو بعینہ اسی طرح ادا کرتا ہی،

بدو گفت ہومان کہ چندیں مدم | بہ نیروے ایں رشتہ شصت خم

واقعہ نگاری کی مثالوں سے تمام شاہنامہ بھرا پڑا ہے، ہم نمونہ کے طور پر ایک مختصر لیکن مسلسل داستان یہاں نقل کرتے ہیں،

یہ وہ موقع ہے کہ سہراب ایک ایرانی پہلوان کو لیکر کیکاؤس کے لشکرگاہ کو دیکھنے چلا ہے، فوجیں اپنے اپنے افسروں کے ساتھ الگ الگ ساز و سامان سے آراستہ ہیں، سہراب ایک ایک پر نگاہ ڈالتا جاتا ہے اور ہر ایک کا نام و نشان پوچھتا ہے، ایرانی پہلوان جواب دیتا ہے،

بدو گفت کز تو بپرسم ہمہ　　زگردن کشان و زشاہ و رمہ (فوج)

سراپردۂ دیبۂ (کمخواب) رنگ رنگ　　بدو اندروں خیمہ ہاے پلنگ

بہ پیش اندروں بستہ صد ژندہ (قوی) پیل　　یکے تخت پیروزہ (فیروزہ) برسان نیل

یکے زرد خورشید[1] پیکر درفش (علم)　　سرش ماہ زریں، غلافش بنفش (بنفشی رنگ کا)

بہ قلب سپاہ اندروں جاے کیست　　زگرداں ایران ورا نام چیست

بدو گفت کاں شاہ ایران بود　　کہ بر در گہش پیل و شیراں بود

وزاں پس بدو گفت کز میمنہ　　سواران بسیار و پیل و بنہ (اسباب)

سراپردۂ برکشیدہ سیاہ　　زدہ گردش اندر ستادہ سپاہ

بگرد اندرش خیمہ زاندازہ بیش　　پس پشت (صنف لطیف) پیلاں و شیران بہ پیش

زدہ پیش او پیل پیکر درفش　　بہ نزدش سواران زرینہ کفش

چہ باشد زایرانیاں نام اوے　　بگو تا کجا باشد آرام اوے

چنیں گفت کاں طوس نوذر بود　　درفشش کجا پیل پیکر بود

---

[1] خورشید پیکر یعنی آفتاب کی صورت کا،

بپرسید کاں سرخ پردہ سرائے | یکے لشکرے گشن پیش بپائے
یکے شیر پیکر درفش بنفش | درافشاں گہر در میان درفش

پس پشتش اندر سپاہی گراں | ہمہ نیزہ دارانِ جوشن وراں
چنیں گفت کاں فرآزادگاں | سپہدار گودرز کشوادگان،
سپہ کش بود گاہ کینہ دلیر | دو چل پور دار دچو پیل وچو شیر

اب رستم کی باری آتی ہے،

دگر گفت کان سبز پردہ سرائے | بزرگانِ ایراں بہ پیش بپائے
یکے تخت پُر مایہ اندر میاں | زدہ پیش او اختر کاویاں
بر او بر نشستہ یکے پہلواں | ابا فرو با سفت و یال گواں
ازاں کس کہ بر پائے پیش بر است | نشستہ بیک سر از و بر تر است

جو شخص سامنے کھڑا ہے | رستم کا قد اس سے بیٹھنے کی حالت میں بھی نکلا ہوا ہے

بہ ایراں نہ مردے بہ بالائے او | کمندے فروہشتہ تا پائے او،
درفشش ببیں اژدہا پیکر است | بران نیزہ بر شیر زریں سر است
بجوشد ہر زماں بر خروشد ہمے | تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمے
کہ باشد؟ بنام آں سوارِ دلیر | کہ ہر دم ہمی بر خروشد چو شیر

ہجیر نے رستم کا نام بدل کر بتایا، سہراب اب اور افسروں کا حال پوچھتا ہے،

وزاں پس بپرسید کز مہتراں | کشیدہ سراپردۂ برکراں،

سواران بسیار وپیلاں بپاے ۔۔۔ برآید ہمے نالۂ کرناے (قرنا) ،

میان سراپردہ تختے زدہ ، ۔۔۔ ستادہ غلاماں بہ پیشش ردہ (صف بصف)

زایراں بگو نام آں مرد چیست ۔۔۔ کجا جاے دارد نژادش کیست

چنیں گفت کاں پور گودرز گیو ۔۔۔ کہ خوانند گرداں ورا گیو نیو ،

زگودرزیاں بہتر و مہتر است ۔۔۔ بہ ایراں سپہ بر دو بہرہ سر است (دو تہائی لشکر)

بدو گفت زاں سو کہ تابندہ شید (آفتاب) ۔۔۔ برآید یکے پردہ بینم سپید ،

زدیباے رومی بہ پیشش سوار ۔۔۔ ردہ (صف بصف) برکشیدہ فزوں از ہزار

پیادہ سپردار و نیزہ وراں ۔۔۔ شدہ انجمن لشکرے بیکراں

ز دیبا فروہشتہ زیبا جلیل ۔۔۔ غلام ایستادہ ردہ (صف بصف) خیل خیل

نشستہ سپہدار بر تخت عاج (پردہ) ۔۔۔ نہادہ براں عاج کرسی ساج

چہ نام است اورا زنام آوراں ۔۔۔ سپہبد نژاد است یا سروراں

بدو گفت کو را فرابرز خواں ۔۔۔ کہ فرزند شاہ است و تاج گواں

بدو گفت سہراب کیں درخور است ۔۔۔ کہ فرزند شاہ است و با افسر است

واقعہ نگاری جب اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو اسکو مرقع نگاری یعنی آج کل کے محاورہ میں سین دکھانا کہتے ہیں ،

چھٹی خصوصیت

جذبات رزمیہ میں درد و غم کے اظہار کا کم موقع پیش آتا ہی ، اور آے بھی تو بلاغت یہ ہے کہ اس کو زیادہ پھیلایا نہ جائے ، تاہم کہیں کہیں اسکا موقع پیش آگیا ہی تو فردوسی نے

اس میں بھی کمال دکھایا ہے، سہراب کے مرنے کی خبر سنکر اس کی ماں کی جو حالت ہوئی ہی، اور جس طرح اُس نے نالۂ وزاری کی ہے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

خروشید و جوشید و جامہ درید   بہ زاری براں کودک نارسید (نوجوان)

برآورد بانگ و غریو و خروش   زماں تا زماں زو ہمی رفت ہوش

فرو برد ناخن دو دیدہ بہ کند (آنکھیں نکال ڈالیں)   برآورد و (دمبدم) بالا در آتش فگند

مرآں زلف چوں تاب دادہ کمند   بہ انگشت پیچیدہ و از بن بکند

بہ سر بر فگند آتش و بر فروخت   ہمہ موی مشکیں بہ آتش بسوخت

ہمی گفت کاے جانِ مادر کنوں   کجائی؟ سرشتہ بخاک و بخوں

دو چشمم بہ رہ بود گفتم مگر   ز سہراب و رستم بیابم خبر

چہ دانستم اے پور کآید خبر   کہ رستم بخنجر دریدت جگر

دریغش نیامد ازاں روے تو   ازاں برز و بالا و بازوے تو

بپروردہ بودم تنش را بہ ناز   بہ رخشندہ روز و شبان دراز

کنوں آں بخوں اندروں غرقہ گشت   کفن بر تنِ پاک او خرقہ گشت

کنوں من کرا گیرم اندر کنار   کہ خواہد بدن مر مرا غمگسار

پدر جستی اے گرد لشکر پناہ   بہ جاے پدر گورت آمد براہ

چرا نامدم با تو اندر سفر،   کہ گشتی بہ گردانِ گیتی سمر (مشہور)

مرا رستم از دور بشناختے،   ترا با من اے پور بنواختے

بینداختی تیغ آں سرفراز — نگرددے جگرگاہت اے پورناز

ہمی گفت و می خست و می کند موے — ہمیزد کفِ دست بر خوبروے

زخوں او ہمی کرد لعل آب را — بہ پیش آوریدا اسپ سہراب را

سرِ اسپ او بہ بر در گرفت — بماندہ جہانے درا و در شگفت (متعجب)

گہے بوسہ زد بر سرش گہ بروے — زخوں زیر سمش ہمی راند جوے

بیاورد آں جامۂ شاہوار — گرفتش چو فرزند اندر کنار

بیاورد خفتان و درع و کمان — ہماں نیزۂ و تیغ و گرز گراں

بسر برہمی زد گراں گرز را — ہمے یاد کرد آں برو برز را

بیاورد زین و لگام و سپر — لگام و سپر را ہمی زد بہ سر

سہراب کی ماں نے جو کچھ کہا ہے کس قدر سچ اور کس قدر پُر تاثیر ہے، سہراب کے گھوڑے کو گود میں لینا، اس کے ہاتھ پانوں چومنا، سہراب کے کپڑوں کو بچہ کی طرح آغوش میں لینا، ہتھیاروں کو سر پر مارنا، کس قدر اصلی حالت کی سچی تصویر ہے،

بیژن ایرانی پہلوان تھا، افراسیاب کی لڑکی منیزہ اس پر عاشق ہوگئی اور چوری سے لیجا کر گھر میں رکھا، جب افراسیاب کو خبر ہوئی تو اُس نے بیژن کو ایک کنویں میں قید کر دیا، اور منیزہ کو گھر سے نکال دیا، منیزہ بیژن کی تیمار داری اور خبر گیری کرتی تھی، رستم بیژن کے چھڑانے کو سوداگر بن کر گیا، اور توران پہنچکر تجارت کے سامان پھیلائے منیزہ کو خبر ہوئی، دوڑی ہوئی آئی اور رستم سے بیژن کے حالات بیان کئے، رستم

نے اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہو جائے، منیزہ کو جھڑک دیا کہ میں بیژن ویژن کو کچھ نہیں جانتا، منیزہ دل شکستہ ہو کر کہتی ہے،

بہ رستم نگہ کرد و بگریست زار	ز خواری بیارید خوں در کنار
بدو گفت کاے مہتر پر خرد	ز تو سرو گفتن نہ اندر خورد،
رستم سے کہا کہ اے سردار	اسطرح رکھائی سے جواب دینا آپکے شایاں نہیں
سخن گر نہ گوئی مرانم ز پیش	کہ من خود دلے دارم از درد ریش
اگر بات نہیں کرتے تو نہ کرو لیکن مجھکو کہدیتے کیوں ہو	میرا دل تو خود مصیبت سے زخمی ہو رہا ہی،
چنیں باشد آئین ایراں مگر	کہ درویش را کس نہ گیرد خبر،
کیا ایران کا یہی دستور ہے	کہ لوگ غریبوں سے بات نہیں کرتے
زدی بانگ بر من چو جنگ آوراں	نہ ترسی تو از داور داوراں
مجھکو پہلوانوں کی طرح ڈانٹ بتاتے ہو	تمکو بادشاہ ہونکے بادشاہ (خدا) کا کچھ ڈر نہیں
منیزہ منم دخت افراسیاب	برہنہ ندیدہ تنم آفتاب
کنوں دیدہ پر خون و دل پر ز درد	ازیں در بداں در دو رخسارہ زرد
برائے یکے بیژن شور بخت	فتادم ز تاج و فتادم ز تخت

اختصار اور زور | بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں، کہ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جب حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے، تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پر زور مختصر جملہ کام دیتا ہے، قرآن مجید میں اوحی الی عبدہ ما اوحی۔ غشیہم من الیم ما

غشیہ میں جو بات ہے وہ سینکڑوں جملوں سے ادا نہیں ہو سکتی، روم کے فاتح کا مشہور جملہ تم نے سنا ہو گا "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کیا"، شاہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، سہراب کی پر درد داستان اس شعر سے شروع کی ہے،

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو — دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

صرف "ایں ہم" نے جو بات پیدا کی ہے ہزاروں تمہید سے نہیں پیدا ہو سکتی تھی، رستم افراسیاب کو ایک خط لکھا ہے اور تہدید کے وسیع مضمون کو ایک مصرع میں ادا کرتا ہے،

دگر نہ بکام من آمد جواب — من و گرز و میدان و افراسیاب

نظامی نے اپنے فخریہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں، لیکن فردوسی کے دو مصرع سب پر بھاری ہیں،

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم دریں پارسی

رستم کی مار دھاڑ، ہنگامہ آرائی اور قتال و جدال کا سماں صرف چار مصرعوں میں دکھایا ہے،

بروز نبرد آں یل ارجمند — بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند

درید و برید و شکست و بہ بست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اسی میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھا پی کر، اٹھ کھڑے ہوئے، اسکو اس طرح ادا کرتا ہے،

پے مشورہ مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

آٹھوین خصوصیت

۸۔ صنائع بدائع، شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں، اسلئے فردوسی کے کلام میں اس کو ڈھونڈھنا نہیں چاہئے، لیکن جو محاسنِ شاعری ضمناً کسی صنعت میں آجاتے ہیں، اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں، مثلاً

لف و نشر مرتب

به روزِ نبرد آن یلِ ارجمند | به شمشیر و خنجر بگرز و کمند
درید و برید و شکست و بہ بست | یلاں را سر و سینہ و پا و دست

لف و نشر مع طباق و مقابلہ،

فرو شد به ماهی و بر شد به ماه | بنِ نیزهٔ و قبهٔ بارگاه

مبالغہ | ز بس گردِ میداں کہ بر شد به دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت،

رزمیہ شاعری | رزمیہ شاعری جس کو انگریزی میں ایپک پوئم کہتے ہیں، شاعری کے انواع میں سے بہترین انواع ہے، یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے، اس کا کارنامۂ فخر یہی رزمیہ شاعری ہے، مہابھارت جس کو ہندو آسمانی کتاب سمجھتے ہیں وہ بھی ایک رزمیہ نظم ہے، اور اگر ان دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دیجا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہے،

رزمیہ شاعری کے کمال کے چند شرائط ہیں، واقعہ ایسا مہتم بالشان ہو جس نے دنیا کی تاریخ میں کوئی انقلاب پیدا کر دیا ہو، لڑائی کے ہنگامہ کا بیان اس زور

شور اور پر رعب طریقہ سے کیا جائے کہ دل دہل جائیں معرکۂ جنگ کے تمام ساز و سامان اور آلات و اسلحۂ جنگ تفصیل سے بیان کئے جائیں، سالار فوج اور مشہور بہادروں کی لڑائی کے بیان میں لڑائی کے تمام داؤں پیچ ایک ایک کر کے دکھائے جائیں، شاہنامہ میں یہ تمام باتیں اعلیٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں،

ہنگامۂ جنگ اور مجلس،

زلشکر برآمد سراسر خروش — زمیں پُرخروش و ہوا پر خروش

جہاں لرز لرزاں شد و دشت و کوہ — زمیں شد زنعل ستوراں ستوہ

درفش از درفش گروہ از گروہ — گسستہ نشد شب برآمد زکوہ

درخشیدن تیغہائے بنفش — ازاں سایۂ کاویانی درفش

تو گفتی کہ اندر شب تیرچہر — ستارہ ہمے برفشاند سپہر

زمیں گشت جنباں چو ابر سیاہ — تو گفتی ہمے برنتابد سپاہ،

بلند آسماں چوں زمیں شد زخاک — زہر سو ہمی شدہ چاک چاک

دل کوہ گفتی بدرد ہمے — زمیں با سواراں بپرد ہمے

زبس نعرہ نالہ کرنائے — ہمے آسماں اندر آمد زجائے

چناں تیرہ شد روئے گیتی زگرد — تو گفتی کہ خورشید شد لاجورد،

بزد مہرہ بر کوہ ژندہ پیل — زمیں جنب جنباں چو دریائے نیل

زگرد سواراں ہوا بست میغ — چو برق درخشندہ پولاد تیغ

زجوش سواران و آواز کوس — ہوا قیرگوں شد زمیں آبنوس

تو گفتی زمیں موج خواہد زدن | وزاں موج بر اوج خواہد زدن
زبس گرد میداں کہ برشد بدشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
زبس نیزہ و گرز و گوپال و تیغ | تو گفتی ہوا ژالہ بارد ز میغ
زکشتہ ہمہ دشت آوردگاہ | تن و دست و سر بود و ترگ و کلاہ
بپوشید دشت و بتوفید کوہ | زجوشِ سوارانِ ہر دو گروہ
تو گفتی کہ روی زمیں آہن است | زنیزہ ہوا نیز در جوشن است

شاہنامہ میں لڑائی کے سامان اور اسلحۂ جنگ کی اس قدر تفصیل پائی جاتی ہے، کہ ہم بہ تفصیل بتا سکتے ہیں، کہ آج سے دو ہزار برس پہلے آلاتِ جنگ کیا کیا تھے، پہلوان اور بہادر کیا کیا ہتھیار لگاتے تھے، لباسِ جنگ کیا کیا تھے، مثلاً لڑائی کے وقت جو باجے استعمال ہوتے تھے، اُن کے یہ نام ہیں، بتیرہ، گاؤدم، خرمہرہ، کوس، طبل، نقارہ، کرنا ے، سرغن،

اسلحۂ جنگ یہ تھے،۔ زرہ، جوشن، خود، مغفر، چار آئینہ، خفتان، ترگ، ببر بیان، برگستوان،

آلات اور سامانِ جنگ یہ تھے، گوپال، گرز، تیغ، سپر، درقہ، خنجر، ژوپین، ناوک، خشت، تیر، خدنگ، کمند، سناں، نیزہ، ژوپن، پرتاب، تبرزین، دبوس، قارورہ، شراع، عرّادہ، رایت، علم، درفش، اختر، سراپردہ،

اقسام فوج، قلب، میمنہ، میسرہ، طلایہ، ساقہ - دمدار،

اُس زمانہ میں مجموعی فوج کے لڑانے کا فن نہ تھا، اس لئے یہ پتہ نہیں لگتا کہ سپہ سالار کس طریقہ سے فوج کو لڑاتے تھے، رستم اگرچہ سپہ سالار تھا اور شاہنامہ سرتاپا گویا اسی کی داستان ہے تاہم کہیں یہ پتہ نہیں لگتا، کہ اُس نے فوج کو کیونکر لڑایا، طریقۂ جنگ یہ تھا کہ ایک ایک پہلوان میدان میں آتا تھا، اور معرکہ آرا ہوتا تھا، ان معرکہ آرائیوں کو فردوسی اس تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے،

لڑائی کے جتنے طریقے تھے یعنی کشتی لڑنا، تلوار چلانا، تیر مارنا، کمند پھینکنا برچھی چلانا وغیرہ وغیرہ شاہنامہ میں سب بہ تفصیل پائے جاتے ہیں، اور جس چیز کو جہاں لکھا ہے، اس طرح لکھا ہے کہ اس کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،

کمند اندازی

تہمتن زالوای شد ودمند — زفتراک بکشاد پیچاں کمند
چو آہنگ رزم یلاں داشتے — کمندے دگر نیزے گراں داشتے
بیامد بغرید چوں پیل مست — کمندے بہ بازو دگر نیزے بدست
بدو گفت کاموس چندیں مم — بہ نیروئے ایں رشتہ شصتِ خم
برانگیخت کاموس جنگی نبرد — ہم آورد را دید باز در وبرد
بینداخت تیغ پرندآورش — ہمی خواست از تن گسستن سرش
سرتیغ بر گردن رخش خورد — ببرید برگستوان نبرد،
نیامد تن رخش را زاں گزند — گو پیلتن، حلقہ کرد آں کمند

پہلوان

ببند اخت و افگندش اندر میان | برانگیخت از جای رخشِ دمان
به ران اندر آورد و کردش دوال | عقابی شده رخش با پر و بال
به رای و دلیری تفنیر وران | گران شد رکیب و سبک شد عنان
همی خواست آن خام خم کمند | به نیروی تن بگسلاند ز بند
شد از هوش کاموس نگسست خام | گو پیلتن رخش را کرد رام
عنان را بپیچید و اوز از زین | نگون اندر آورد و زد بر زمین
دو دست از پسِ پشت بستش چو سنگ | به خم کمند اندر آورد چنگ،
تیراندازی — تهمتن به بند کمر برد چنگ | گزین کرد یک چوبه تیر خدنگ
خدنگی بر آورد پیکان چو آب | نهاده برو چار پر عقاب
بمالید چاچی کمان را بدست | به چرم گوزن اندر آمد شکست
ستون کرد چپ را و خم کرد راست | خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو سوفارش آمد به پهنای گوش | ز چرم گوزنان بر آمد خروش
چو پیکان ببوسید انگشتِ او | گزر کرد از مهرهٔ پشت او،
چو زد تیر بر سینهٔ اشکبوس | سپهر آن زمان دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت ده | فلک گفت احسن، ملک گفت زه
تیره بازی — برآشفت سهراب و شد چون پلنگ | چو بدخواه او چاره جو شد به جنگ
عنان برگرائید و برداشت اسب | بیامد به کردار آذر گشسب

چو آشفتہ شد شیر، تندی نمود	سر نیزہ را سوی او کرد زود
بدست اندروں نیزۂ جانستاں	پس پشت خود گردش آنگہ سناں
بزد بر کمر بند گرد آفرید	زرہ بر تنش یک بیک بر درید
ز زیں بر گرفتش بہ کردار گوی	کہ چوگاں ز باد اندر آید بروی
کشتی گیری — گرفتند ازاں پس دوال کمر	دو اسپ تگاور بر آوردہ بر
یکے بُد بدست یل اسفندیار	بدست دگر رستم نامدار
بیرو کشیدند زی خویشتن	دو گردِ سرافراز و دو پیلتن
ہمی زور کرد ایں ازاں آں بریں	نہ جنبید یک مرد بر پشت زیں
کف اندر دہاں شاں شدہ خون و خاک	ہمہ گبر و برگستواں چاک چاک
چو رستم درا دید بفشرد راں	بگردن بر آورد گرز گراں
چو تنگ اندر آورد با او زمیں	فرو کرد گرز گراں را بہ زیں

شاہنامہ کا اثر — شاہ نامہ کے مقبولِ عام ہونے کے مخالف بہت سے اسباب جمع تھے، سب سے مقدم یہ کہ وہ سرتاپا غیر قوموں کا کارنامہ تھا اور مسلمانوں کا جہاں جہاں ذکر آگیا تھا نہایت حقارت سے انکو یاد کیا تھا،

ز شیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

قادسیہ کے معرکہ میں مسلمانوں نے بے نظیر شجاعت کے جوہر دکھائے

تھے فردوسی نے اس کو بھی مدہم کرکے دکھایا تھا، اس بات پر مذہبی گروہ میں عام ناراضی پھیلی، چنانچہ اسی زمانہ میں عمرنامہ ایک کتاب لکھی گئی، جس کے دیباچہ میں سبب تالیف یہ بیان کیا ہے کہ چونکہ فردوسی نے ایرانیوں کے جھوٹ سچ قصے لکھ کر ملک میں مشہور کردیئے، اسلئے یہ کتاب حضرت عمر فاروقؓ کے حالات میں لکھی گئی، کہ لوگوں کی توجہ ادھر سے ہٹ جائے،

چونکہ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو لکھ کر شاہنامہ میں اس کو منضم کردیا تھا اس لئے لوگ شاہنامہ کو ہاتھ لگاتے ڈرتے تھے، فردوسی چونکہ معتوبِ شاہی تھا، اس لئے بھی اسکی تصنیف مقبولِ عام نہ ہوسکی ہوگی،

یہ سب تھا، لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ خراسان سے لیکر بغداد تک در و دیوار سے شاہنامہ کی صدا آنے لگی، تقریر و تحریر، تصنیف و تالیف، خلوت و جلوت، کوچہ و بازار، اس کی آواز بازگشت سے گونج اٹھے، لوگ جب کام سے فارغ ہوکر بیٹھتے تو کوئی خوش لہجہ شخص حفظ شاہنامہ کے اشعار پڑھتا، اور شجاعت و جانبازی، دلیری، حبِ وطن کا اثر تمام مجلس پر چھا جاتا،

سیکڑوں برس تک، سلاطین و امرار کی باہمی خط و کتابت میں شاہنامہ کے اشعار جا بجا درج ہوتے تھے اور دلیری اور بہادری کے موقعوں پر بیساختہ

۱؎ یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے،

اس کے اشعار زبان سے نکل جاتے تھے، میدانِ جنگ میں رجز کے بجائے شاہنامہ کے اشعار پڑھے جاتے تھے، سلجوقیوں کے آخیر فرماں روا طغرل ارسلان نے میدان جنگ میں لڑکر جان دی تو شاہنامہ کے یہ اشعار زبان پر تھے،

من آں گرزیک زخم برداشتم　　　سپہ را ہماں جاے بگذاشتم

جہاں بر خروشیدم از پشت زیں　　　کہ چوں آسیا شد، پر یشاں زمیں

شاہنامہ ہی کے اثر نے سیکڑوں برس تک، ایران کی شاعری کو غزل سے پاک رکھا، امتدادِ زمانہ سے جب اس کا اثر گھٹا اور عشق و عاشقی کے خیالات قوم میں پھیلنے لگے، تو دفعۃً تاتاریوں کے طوفان نے مسلمانوں کی خاک تک اڑادی؛

شاہنامہ کی زبان

شاہنامہ کی زبان، آج کی زبان سے اس قدر مختلف ہے کہ گویا دو زبانیں الگ الگ ہیں، اور یہ شاہنامہ کی تخصیص نہیں، اُس زمانہ کے شعراء کی عام زبان یہی تھی، لیکن چونکہ اور کسی شاعر نے اس قدر الفاظ استعمال نہیں کیے اسلئے فردوسی کی زبان بہ نسبت اور شعراء کے زیادہ بیگانہ اور غیر مانوس معلوم ہوتی ہے۔

شاہنامہ کی زبان کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں،

۱۔ ضمیروں کی ترکیب، مثلاً،

ع　　زشادی رخاں شاں چو گل بردمید،

اب یوں کہیں گے رخ ہاے ایشاں،

۲۔ غیر جاندار چیزوں کی جمع الف و نون سے، مثلاً

اگر عمر باشد مرا سالیاں، یعنی سالہا،

۳- اسم اور فعل کے آخر میں الف زائد مثلاً

ع سیامک برآمد برہنہ تنا، یعنی تن،

ع بہ سی روز گیتی بہ پیمایدا،

۴- فارسی الفاظ پر تشدید مثلاً خوشّی، زرّہ، پرّ- ہمّ، مژّہ، زرّ بفت، کرّشی،

۵- بعض زائد حرف، مثلاً چناں کے بجائے چوناں، اشیا کے بجائے اشیوار، چنیں کے بجائے چونیں، فرشتہ کے بجائے فریشتہ،

۶- در کے بجائے اندرون، مثلاً

بہ جنگ اندروں گرزہ گاؤ رنگ،

۷- متحرک بجائے ساکن، اور ساکن بجائے متحرک، مثلاً،

ع بگویم زمادرش وہم از پدرش ع بیامدت از شیروز دیوباک،

ع بہ شادی ہمہ جاں برافشاندند،

۸- بے کے پہلے الف زائد،

ع ایے او بناشیم درجنگ شاد،

۹- دیا بجائے دیا،

دیا بارۂ رستم جنگجوے ‏ ‏ بہ آخر نہدبے خداوند وے،

۱۰۔ کجا بمعنی کہ

ع درفشش کجا پیل پیکر بود،

۱۱۔ ازبر بمعنی بر

ع نشست ازبر کوہہٗ ژندہ پیل، یعنی بر کوہ،

۱۲۔ ایچ ۔ معنی ہیچ،

ع زپیکاں نبود ایچ پیدا سرش،

۱۳۔ تاے خطاب کا استعمال، مثلاً

ع ہزارانت کودک وہم نوش لب، یعنی ہزاراں ترا،

چو آئی خیالت مراد و ہوا است، یعنی کہ ترا

۱۴۔ ورا بمعنی اورا،

چو رستم ورا دید خیرہ بماند، یعنی چو رستم اورا دید،

۱۵۔ ازوے کے بجاے ازوی،

برمادر آمد بہ پرسید ازوے بدو گفت گستاخ بامن بگوی

۱۶۔ ازیرا بجاے ازیں رو،

ع ازیرا سرت ز آسماں بر تراست، یعنی ازیں رو،

۱۷۔ آزمایش کے بجاے آزموں،

نہادی بروودست آزموں شکم برزمیں برنہادی ہیوں،

۱۸۔ میم متکلم کا حذف،

اگر من نہ رفتے بہ ماژندراں　　یعنی اگر من نہ رفتمے،

ان تصرفات کے علاوہ سیکڑوں الفاظ ہیں جو بالکل متروک ہیں، یا ان کی صورتیں بدل گئیں، یا ان کے بجائے اور اور الفاظ استعمال میں ہیں، مختصراً چند الفاظ ذیل میں درج ہیں،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
ویژہ	خاص	تال و مال	ریزہ ریزہ
مر	شمار	تخش	تیر
ایدوں	حالا	ترک	کلاہ آہنی
ایدر	اینجا	ترنگ	صدائے کماں
آخُر	اصطبل	تلاش	پراگندہ
آذین	زینت و آرایش	تنگ آمدن	نزدیک آمدن
آذرگشسپ	برق	جوال	ظرفیست کہ از پشم بافند
آستی	آستیں	چاک	سفیدۂ صبح
برسان	بساں	چاک چاک	صدائے زدن شمشیر
آغاز	ارادہ	چرنگیدن	آواز گرز
افسوس	ظلم و ستم	چک	قبالہ اور دستاویز

لفظ	معنی	لفظ	معنی
اند	چند، یا اندک	سه دیگر	سیوم
اندرخور	لائق	شارسان	شهر و شهرستان
انوشه	آفرین	شبگیر	صبح
بادسر	مغرور	شخودن	خراشیدن
بارگی و باره	اسپ	شکردن	پاره کردن
باژ	خراج	غرم	میش کوهی
بخش	حصه	غرچه	مخنث و نامرد
برتر	بلندی	غو	خروش
بسنده	کافی	گو	پهلوان
بسیج	قصد و کارسازی	فرو ریختن از اسپ	فرود آمدن
بگماز	شراب	فزونی	فضیلت و بزرگی
پاژهر	تریاک	فسیله	گله اسپ
پذیره	استقبال کردن	فش	دم و یال اسپ
پدرام	آراسته	قاروره	آله ایست از آلاتِ جنگ
پهلوانی	زبان پهلوی	خشت	نیزه کوچک
در	دره کوه و مرتبه	وبوس	گرز،

لفظ	معنی	لفظ	معنی
	ع بگفتش به از این سخن در بدر	درع	پیراهن زنان
درخت	دارایساسته	سبز در سبز	نام سکے ست
درقه	سپر چرمین	ستاده	خیمه
دستار	دستر خوان	ستاره	مسهری
دست بند	زنان رقاص	ستودان	دخمه
دست حابه	جامه سروپا	ستیخ	راست و بلند
دست راست	وزیر اعظم	سرسری	فرومایه
دستوار	عصا	سرون	شاخ گاؤ
دفتر شکستن	دفتر ساختن	سفت	دوش
دمدار	ساقه لشکر	شیب	دنباله تازیانه
دواج	لحاف	ماروچ	پیچ
دیدار	چشم و رخ و پدیدار گشتن	صلاب	اصطرلاب
دوه	صف	طبرخون	بید سرخ
رزمه	بقچه	طغرل	نوعی از مرغ شکاری
رسته	صف زده	قرطه	کرته
رفت آوری	آمد و رفت کردن	کاتوزی	زاهد

لفظ	معنی	لفظ	معنی
رنج	رنگ	کالوشہ	دیگچہ
روزبان	دربان	کشکین	نان جویں
روسپی	فاحشہ	کفچ	آبِ دہن
ریدک	غلام وامرد	کلک	کمان
ریمن	مکار	کنارنگ	بزرگ قوم
زحیر	پیچ وتاب	کندآور	پہلوان
زخم	عمارت	کوہسر	کوہسار
زمزم	کلمات مغاں کہ وقت پرستش گویند	گردگاہ	تہی گاہ وکمر
		گردگاں	مرہون
زمی	زمیں	گریغ	گریز
زنہار خوردن	عہد شکستن	گشن	بسیار
زوار	خادم زندان خانہ	ماہار	مہار شتر
ژکیدن	آہستہ زیر لب گفتن	مزیح	طعنہ وظرافت
سان	عرض لشکر	منجوق	ماہچہ علم
سہت	سنگین وگراں	دیلہ	نعرہ
ناباک	بے باک	ہرکارہ	دیگ سنگی

لفظ	معنی	لفظ	معنی
نخ	صف لشکر	ہرزماں	ہرزماں
نوز	ہنوز	ہمانند	مانند
نیو	پہلوان	ہوش	جان
وان	نگہبان	یشک	چہار دنداں پیشیں
دیر	بادوفہم		جانور درندہ

اسدی طوسی

اقلیم سخن (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے، صاحبِ آتشکدہ نے اسکو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہے،

اسدی کا نام علی بن احمد اور کنیت ابو نصر ہے، سلسلۂ نسب شاہانِ عجم سے ملتا ہے، تحصیل علوم کے بعد عراق کا سفر کیا، اور دیلمیوں کے دربار میں رسائی حاصل کی، عراق سے آذربایجان آیا، یہاں کا رئیس ابو دلف کرکری تھا، اس کا وزیر نہایت قدردان علم و فن تھا، اُس نے اسدی سے کہا کہ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کیا، تم اسی کے ہموطن اور ہم فن ہو تم بھی کچھ یادگار چھوڑ جاؤ، اسدی نے گرشاسپ نامہ لکھکر ہم فنی کا حق ادا کیا، چنانچہ ان تمام واقعات کو خود دیباچہ میں لکھا ہے،

یکے بود سردار دنیا و دیں — گراں مایہ دستور شاہ زمین

بہ من گفت فردوسی پاک مغز — بداد ست داد سخنہائے نغز

بہ شہنامہ گیتی بیار است است — وزاں نامہ نام نکو خواست است

تو ہم شہری او را و ہم پیشۂ — چو او در سخن چابک اندیشۂ

ازاں ہمرہاں نامۂ باستاں　　　　به نظم آرخرم یکے داستاں

دولت شاہ نے لکھا ہے، اور اور تذکرہ نویسوں نے بھی اسکی تقلید کی ہے کہ فردوسی جب غزنین سے بھاگ کر مختلف شہروں سے گذرتا ہوا، وطن میں آیا، اور زندگی کے دن قریب آگئے تو اسدی کو بلاکر کہا کہ شاہنامہ کا کچھ حصہ ناتمام رہ گیا ہے میرے بعد کون اسکو پورا کر سکے گا، اسدی نے کہا، جان استاد! کچھ اندیشہ کی بات نہیں میں اس خدمت کو انجام دونگا، چنانچہ ایک رات دن میں چار ہزار شعر لکھکر فردوسی کو سنائے، فردوسی نہایت خوش ہوا اور وہ اشعار شاہنامہ میں داخل کرلئے، یہ وہ اشعار ہیں جہاں عربوں کے حملے اور ایران کی شکست کا ذکر ہے،

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے، نہ شاہنامہ ناتمام رہا تھا نہ اسدی فردوسی کا استاد تھا[1]، نہ فردوسی، اسدی سے ایسی فرمایش کرسکتا تھا، نہ ایک رات دن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جاسکتے تھے، ان سب پر مستزاد یہ کہ اسدی کے انداز سے، ان اشعار کو مطلقاً مناسبت نہیں،

شاعری پر اسدی کا ایک احسان یہ ہے کہ قصائد میں جدت کا راستہ نکالا اکثر قصائد میں مناظرات لکھے ہیں، اور یہ اس کی خاص ایجاد ہے وہ دو چیزوں کو لیکر

---

[1] اسدی نے گرشاسپ نامہ میں فردوسی کا نام جسطرح لیا ہے، اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ فردوسی اس کا شاگرد نہ تھا، یہ شعر ملاحظہ ہو،

به شہنامہ فردوسی نغز گوے　　　　چو از پیش گویندگان برد گوے،

باہم مناظرہ کرتا ہے، ہر ایک کی طرف سے ترجیح کے دلائل پیش کرتا ہے، اور بالآخر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز کرتا ہے، چنانچہ رات دن، زمین آسمان، گبر و مسلم، قوس ورمح، شب و روز کا مناظرہ، مجمع الفصحا میں نقل کیا ہے،

اسدی سب سے پہلا شخص ہے جس نے مصطلحات فارسی پر کتاب لکھی، چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ویانا کے کتب خانہ میں موجود ہے، سلگمین نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع بھی کیا ہے[1]،

کلام پر رائے

اسدی اگرچہ فردوسی وغیرہ کا ہمعصر ہے، لیکن تشبیہات اور مضمون بندی کے لحاظ سے، نظامی سے دوش بدوش ہے، ایک جنگل کی تعریف میں لکھتا ہے،

چناں تنگ درہم یکے بیشہ بود	کہ رفتن دراں کار اندیشہ بود
اس طرح کا گھنا جنگل تھا	کہ اس میں صرف خیال چل سکتا تھا
درختانش سر در کشیدہ بسر	چو خط دبیراں یک اندر دگر
اس کے درخت اس طرح پاس پاس تھے	جس طرح خوشنویسوں کی سطریں ہوتی ہیں
ہمہ شاخہا تا بہ چرخ کبود	بہم در شدہ تنگ چوں تار و پود
تمام شاخیں آسمان تک	اسطرح لپٹی ہوئی تھیں جسطرح کپڑے میں تانا بانا ہوتا ہے
تو گفتی سپاہی است در جنگ سخت	وزو ہست گرد و گر ہر درخت
معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فوج لڑائی میں مصروف ہے	ہر درخت پہلوان ہے،

[1] مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم تذکرہ اسدی،

کماں شاخہا شاں، ہمہ گرز بار | سپر بر گہا و سناں نوک خار
شاخیں کمان تھیں، گرز پھل تھے | پتے سپر، اور کانٹے برچھیاں تھیں

نتابیدہ اندر وے از چرخ ہور | ز تنگی رہش پوست برفتے زمور
آفتاب کبھی اس میں چمکا نہیں تھا، | اسقدر گھنا تھا کہ چیونٹی اسمیں چلتی تو اسکی کھال اتر جاتی

اس قسم کی تشبیہات اور اس قسم کا مبالغہ متوسطین بلکہ متاخرین کا انداز ہے، باایں ہمہ واقعہ نگاری اور صورتِ حال کے منظر دکھانے میں اسدی کو فردوسی سے کم مایہ نہیں کہہ سکتے، گرشاسپ نے جہاں اژدہا کو مارا ہے، اس موقع پر اژدہا کی تصویر دیکھو کس طرح کھینچی ہی، اگلے زمانہ میں اژدہا کی تصویر جو لوگوں کے ذہن میں تھی یہ تھی کہ بیس تیس گز کا لمبا ہوتا ہے، آگے دو بڑے بڑے دانت ہاتھی کی طرح نکلے ہوتے ہیں، سانس لیتا ہے تو منہ سے شعلے نکلتے ہیں، سر پر کانٹے کی طرح بال ہوتے ہیں، جسم پر ہاتھی کے کان کے برابر چتے ہوتے ہیں، جن کو کبھی سمیٹ لیتا ہے اور کبھی پھیلا دیتا ہے، آنکھیں ستارہ کی طرح دور سے چمکتی ہیں،

شد اندر درہ ہر سوے بنگرید | بناگاہ آں اژدر آمد پدید
براں پشتہ او، سینہ سایان بکیں | ز پیچیدنش جنبش اندر زمیں
چو تاریک غارے دہن کردہ باز | دو نیشکش چو شاخ گوزنان دراز (دانت)
دہان و نفس دود و آتش بہم | دہاں کورۂ آہن و شعلہ دم
ز تف دہانش دلِ خارہ موم (گرمی، پتھر) | ز زہر و منش بادِ گیتی سموم، (بھٹی)

به دود نفس هر دو جنبش ز نور
درخشاں چو در شب ستاره ز دو

گره در گره خم و دم تا به پشت
همه سرش چوں خار و موہا درشت

پشیزه پشیزه تن از رنگ نیل
ازاں هر پشیزه، مه از گوش فیل

گہے چوں سپر بر فگندیش باز
گہے ہمچو جوشن کشیدی دراز

چو بر کوه سودے، تن سنگ رنگ
بفر سنگ رفتے چکاکاک سنگ

غرض شاہنامہ اور سکندر نامہ کی بیچ کی کڑی گرشاسپ نامہ ہے، نظامی نے غالباً گرشاسپ نامہ کو سامنے رکھکر سکندر نامہ لکھا ہی۔

منوچہری

دامغان وطن، ابوالنجم کنیت، احمد نام، شصت کلہ لقب اور منوچہری تخلص تھا، دولت شاہ نے اسکو بلخی لکھا ہی، چونکہ نہایت دولت مند تھا، اسلئے شصت کلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، امیر منوچہری بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر جو مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور ۳۸۶ھ میں تخت نشین تھا، یہ اس کے دربار میں ملازم تھا، اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا، ۴۲۱ھ میں منوچہری نے انتقال کیا تو یہ غزنیں میں آیا، اور عنصری کی مدح میں قصیدہ لکھا، جو اس کے دیوان میں موجود ہے، مدح کے چند شعر یہ ہیں،

اوستاد اوستادان زمانہ عنصری	عنصرش بے عیب و دل بےغش و دینش بےفتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع	طبع او چوں شعر او ہم باملاحت ہم حسن
کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید	روبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند	تا غریزی روضہ بینند و طبیعی نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او	ہرچہ در فردوس ما را وعدہ کردہ ذوالمنن
کوثر است الفاظ عذب او و معنی سلسبیل	لفظ او انہار خمر و ونشس انہار لبن

تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی، لیکن یہ بھی

خوشامد کا ایک پہلو تھا، جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے، بہرحال عنصری نے اسکو دربار شاہی میں پہنچایا، اور سلطان محمد بن محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا، یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا، کچھ روک ٹوک نہ تھی، محمد[1] چند روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہوکر قید ہوا، اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا، منوچہری کے اکثر قصائد مسعود ہی کی مدح میں ہیں، مسعود بھی اس کا نہایت قدردان تھا، یہاں تک کہ دربار کے شعرا، اس پر رشک کرتے تھے، ایک قصیدہ میں منوچہری نے فخر کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے، تقی کاشی نے خلاصۃ الافکار میں لکھا ہے کہ منوچہری، عنصری و عسجدی کا ہمعصر تھا، اور دربار میں عنصری کے سوا اور تمام شعرا، یہاں تک کہ فردوسی اور فرخی تک اس سے نیچے بیٹھتے تھے لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا ہے، اور اسلئے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہوسکتا تھا،

منوچہری فطرۃً شاعر تھا، نہایت کمسنی میں لوگ مشکل مشکل طرحیں دیتے تھے، اور وہ برجستہ ان طرحوں میں قصیدے اور غزل کہتا تھا،[2]

دیوان جو آج موجود ہے، اس میں تین ہزار شعر ہیں، علی قلی خاں ہدایت

---

[1] مجمع الفصحاء   [2] ایضاً بحوالہ لب لباب عوفی یزدی،

نے بڑی تلاش سے بہم پہنچایا اور شائع کیا، فرانس میں اس کا دیوان نہایت اہتمام اور تکلف سے چھپا ہے، فرہنگ بھی ہے اور تمام مشکل اشعار کو حل کیا ہے، یہ نسخہ میری نظر سے گذرا ہے، اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے، منوچہری نے ۴۳۲ھ میں انتقال کیا،

کلام کی خصوصیات منوچہری کے کلام میں اکثر ایسے خصوصیات ہیں جن سے اسکے معاصروں کا کلام بالکل خالی ہے، بلکہ مابعد کے شعرا میں بھی ان کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں،

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے، اس نے متعدد قصیدے عربی قصائد کے بحر اور قافیہ میں لکھے ہیں، ابو الشیص کا ایک قصیدہ ہے،

سالقاک واللیل ملقی الجران　　　غراب ینوح علی غصن بان

منوچہری اس کے جواب میں لکھتا ہے.

جہانا چہ بدمہر و بدخو جہانی　　　چو آشفتہ بازار بازارگانی

مزہ وہاں آتا ہے، جہاں چند شعرائے عرب کے نام لیکر کہتا ہے کہ فلاں شاعر نے خلیفہ اور امیر کی مدح میں زور کے قصیدے لکھے اور ایسے بڑے بڑے صلے حاصل کئے، میں بھی اسی طرح تیرے دربار میں آیا ہوں،

شنیدم کہ اعشی بہ شہر یمن شد　　　سوے سودۃ بن علی الیمانی

بروخواند شعرے بالفاظ تازی | بہ شیریں معانی و شیریں زبانی
یکے کارواں اشتر کشن داوش | ہراشتر بساں کوہ کیے از کلانی
سوے تاج عمرانیاں ہم بدینیاں | بیامد منوچہری دامغانی

دیکھو تخلص کس لطف سے کھپایا ہی،

آخر میں تصریح کی ہی کہ یہ قصیدہ میں نے ابوالشیص کے جواب میں لکھا ہی، ساتھ ہی قصیدہ کا مطلع بھی تضمین کیا ہی،

بداں وزن ایں شعر گفتم کہ گفتہ است | ابوالشیص اعرابی باستانی
سالقاک واللیل ملقی الجران | غراب ینوح علی غصن بان

ابن المعتز کا ایک قصیدہ سادات علوی کے معارضہ میں ہی،

ونحن بنوا العم اولی بھا،

اس قصیدہ پر منوچہری نے قصیدہ لکھا ہے، اور لطف یہ کیا ہے کہ عربی ضمیر کی جو ھا تھی اس سے فارسی میں جمع کا کام لیا ہی،

چو از زلف شب باز شد تابہا | فرو مرد قندیل محرابہا،
سپیدہ دم از بیم سرمائے سخت | بپوشید بر کوہ سنجاب ہا،
میخوارگاں ساقی آواز داد | فگندہ بزلف اندروں تابہا
بہ بانگِ نخستین ازیں خوابِ خوش | بجستیم ماہچو طبطاب ہا
منجم ببام آمد از نورے | گرفت ارتفاع سطرلاب ہا

فارسی کے اور شعراء کے برخلاف منوچہری کو شعرائے عرب کے اکثر دیوان حفظ یاد تھے، اور اس پر فخر کرتا تھا، ایک قصیدہ میں حاسد کو خطاب کرکے لکھتا ہے،

من بسے دیوان شعر تازیاں دارم زبر تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحین

یعنی مجکو عرب کے بیسیوں دیوان ازبر ہیں اور سبعہ معلقہ کا یہ قصیدہ بھی نہیں پڑھ سکتا

الا ھبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

عربی پر اسکو یہ قدرت حاصل تھی کہ اپنے کلام میں عربی قصائد کی طرف اشارے کرتا ہی اور ان کے وہ ٹکڑے جن کے نام سے وہ قصیدے مشہور ہیں، بے تکلف تضمین کرتا جاتا ہے، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

امرء القیس ولبید واخطل واعشٰی وقیس بر طلل ہا نوحہ کردندے و بر رسم تلی،

شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد جعفر و سعد و سعید و سید ام القری

آنگہ گفتست اذ نتنا آنکہ گفت الا ھبی آنکہ گفت السیف اصدق آنکہ گفت ابلی الھوی

اس شعر میں چار قصیدوں کے مطلعوں کی طرف اشارہ ہی، یعنی

اذ نتنا ببینھا اسماء (سبعہ معلقہ کا قصیدہ ہی)

الا ھبی بصحنک فاصبحینا سبعہ معلقہ

السیف اصدق انباء من الکتب ابوتمام کا مشہور قصیدہ ہی جو معتصم کی مدح میں عموریہ کی فتح کی تقریب میں لکھا تھا

ابلی الھوی، (متنبی کا قصیدہ ہی)

اس کے کلام میں اکثر عربی تلمیحات ہیں یہانتک کہ محض فارسی داں اس کے کلام

سے پورا لطف نہیں اُٹھا سکتے، ایک قصیدہ کا مطلع ہی،

نوروز بزنگاشت بصحراو مشک دمے | تمثال ہاے غزہ وتصویر ہاے مے

عرب میں لیلیٰ وشیریں کے بجاے جن معشوقوں کا نام آتا ہے، لیلیٰ، سلمیٰ، رباب، غزۃ، میہ، شبینہ وغیرہ ہیں، غزۃ، کثیر کی معشوق تھی، جو بنی امیہ کے زمانہ کا مشہور شاعر تھا، میہ ذوالرمہ کی معشوق تھی، اسی میّہ کو منوچہری نے قافیہ کی ضرورت سے مے کہدیا ہی،

ایک اور قصیدہ میں لکھتا ہے،

بادبزین صناعتِ مانی کند ہمے | مرغِ حزیں روایتِ معبد کند ہمے

معبد بنوامیّہ کے زمانہ کا مشہور مغنی تھا،

روایت کردن کے معنی گانے کے ہیں، مرغ حزیں سے بلبل مراد ہے، یعنی بلبل معبد کے راگ گاتی ہے،

زمیں محراب داؤدست از بس سبزہ پنداری | کشادہ مرغکاں بر شاخ چوں داؤد حنجرہا

بانظم ابن رومی و با نثر اصمعی، | باشرع ابن جنی و با نحو سیبوے،

آں جائگاہ کا نجمن سرکشاں بود، | تو بوفلانی آں دگراں ابنہ دبنی

(۲) اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی، روانی اور شستگی ہے، یہ جوہر اگرچہ اس کا عام خاصہ ہے، لیکن اس کے ساتھ اور مختلف باتیں جمع ہوگئی ہیں، جن سے اور زیادہ شیرینی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اکثر شگفتہ ردیفیں پیدا کرتا ہی،

کہیں کہیں ممدوح کے نام کو ردیف کرتا ہی، اور وہاں گریز کے موقع پر ممدوح کے نام سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، بعض جگہ کئی کئی شعر تنسیق الصفات[۱] کی صنعت میں لکھتا جاتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم پر موتی ڈھلکتے چلے آتے ہیں،

ماہ رمضاں رفت و مراز فتن آں بہ — عید رمضاں آمد و المنۃ اللہ
برآمدن عید و بروں رفتن روزہ — ساقی بدہم بادہ بر باغ و بہ سبزہ
برنہ بکف دستم آں جام چو کوثر — جام دگر آور بکف دست دگر نہ
من می نخورم تا بنود بر دو کفم جام — یا ساتگنی بر سر خوانم نہ نہی سہ
چوں می بدہی نوش ہمی گوئی ہمی باش — چوں می نخورم جام ہمی گیرد ہمی چہ

دلم اے دوست تو دانی کہ ہوائے تو کند — لب من خدمت خاک کف پائے تو کند
رائگاں مشک فروشی نکند ہیچ کسے — در کند ہیچ کسے لف دوتائے تو کند،
چہ دعا کردی جاناں کہ چنیں خوب شدی — تا چو تو چاکر تو نیز دعائے تو کند
از لطیفی کہ توئی اے بت و از شیرینی — ملک مشرق بیم است کہ رائے تو کند
(یعنی تیری رائے میں آجائے)
این جہان کرد برائے تو خداوند جہان — وان جہان نیز برانم کہ برائے تو کند

صنما! از تو دلم ہیچ شکیبا نہ شود — اگر امروز نشود بیتک فردا نہ شود
تجربت کردم و دانا شدم از کار تو من — تا مجرب نہ شود، مردم دانا نہ شود
نہ کشم ناز ترا و نہ دہم دل بہ تو ہم — تا مرا آشتی و مہر تو پیدا نہ شود

---

[۱] تنسیق الصفات کی مثال گھوڑے کی تعریف میں آئیگی،

گوئی از دو لب من بوسہ تقاضا چہ کنی ۔۔۔ دام خواہی نہ بود کو بتقاضا نہ شود

بہ مدارا دل تو نرم کنم، و آخر کار ۔۔۔ بہ درم نرم کنم گر بہ مدارا نہ شود

دگر این عاشق نومید شود از در تو ۔۔۔ از در خسرو شاہنشہ دنیا نہ شود

صنما گرد سرم چند ہمے گردانی ۔۔۔ زشتی از روے نکو زشت بود گردانی

یا مکن آنکہ شب و روز ہمی وعدہ دہی ۔۔۔ یا مکن وعدہ ہر آن چیز کہ می نتوانی

دلِ من بردی و از خویشتنم دور کنی ۔۔۔ بہ نباید صنما! کار بدین آسانی

مہربانی نہ کنی بر من و مہرم طلبی ۔۔۔ نہ دہی داد من و داد ز من بستانی

بیوفائی کنی و نادان سازی تن خویش ۔۔۔ نیستی اے بت یکبارہ بدین نادانی

از تو ما را نہ کنار و نہ پیام و نہ سلام ۔۔۔ مکن اے دوست کہ کیفر بری و درمانی

مکن اے دوست کہ بیداد نشانی نگذاشت

عدل باز آمدہ با بو الحسن عمرانی

نوروز روزگار و نشاط است و ایمنی ۔۔۔ پوشیدہ ابر دشت بہ دیبائے ارمنی،

خیل بہار خیمہ بصحرا برون زند، ۔۔۔ واجب کند کہ خیمہ بصحرا برون زنی

بر گل ہمی نشینی و بر گل ہمیخوری ۔۔۔ بر خم ہمی خرامی و بر دن[1] ہمی دنی

دراست تا خریدہ و شکست آرائگان ۔۔۔ ہر چند بر فشانی و ہر چند بر چنی

شاخ بنفشہ بر سر زانو نہادہ سر ۔۔۔ مانندہ مخالفِ بو سہل زوزنی

---

[1] دن یعنی خم شراب دنی، دیندن سے مشتق ہی جس کے معنی اکڑ کر چلنے کے ہیں،

باد نوروزی ہمی در بوستاں ساحر شود تا بہ سحرش دیدۂ ہر گلبنے ناظر شود

باد ہمچوں دزد گرد د ہر سوئے دیبا رہے بوستاں آراستہ چوں کلبۂ تاجر شود

نو بہار ایں جامہ صد رنگ پوشد تا مگر دوستار دوستاں خواجہ بوطاہر شود

منوچہری مناظرِ قدرت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچتا ہی صحرا، سبزہ، بادل، سیلاب، ہوا، وغیرہ وغیرہ کے اوصاف اکثر قصائد کی تمہید میں لکھے ہیں اور اس خوبی سے لکھے ہیں کہ اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیئے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک عمدہ مجموعہ تیار ہو جائیگا، ایک قصیدہ میں سفر کا حال لکھتے لکھتے آب و ہوا کے طوفان کا حال لکھا ہی اس موقع پر ہوا کے جھونکے، بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج، پانی کے سیلاب کا نقشہ دیکھو کس طرح کھینچتا ہے،

برآمد بادے از اقصائے بابل ہبوبش خارہ درو بارہ افگن

تو گفتی کز ستیغ کوہ سیلی فرو بارد ہمے احجار صد من (قلعہ)

ز روے بادیہ برخاست گردے (چوڑا) کہ گیتی کرد ہمچوں خز ادکن (سیاہ)

چناں کز روے دریا بامداداں بخار آب خیزد ماہ بہمن

برآمد زاغ رنگ و مار پیکر یکے میغ از ستیغ کوہ قارن

چناں چوں صد ہزاراں خرمن تر کہ عمداً در زنی آتش بہ خرمن (بادل)

بجستے ہر زماں از تیغ برقی کہ کردے گیتی تاریک روشن

خروشی برکشیدے تند تندر کہ موے مرد ماں کردے چو سوزن

تو گفتی نائے رومی ہر زمانے (کڑک) بگوش اندر دمیدے یک دمیدن

بلرزیدے زمیں از زلزلہ سخت — کہ کوہ اندر فتادے زو بگردن
توگفتی ہرزمانے ژندہ پیلے — بلرزاند زرنج پشتگان تن
فروباریدبارانے زگردوں — چناں چوں برگ گل بارد زگلشن
ویا اندر تموزی مہ ببارد — جراد منتشر بربام و برزن
زصحرا سیلہابرخاست ہرسو — دراز آہنگ پیچاں وزمیں کن
چوہنگام عزائم زی معزم — بتک خیزند ثعبانان ریمن
نمازشامگاہاں گشت صافی — زروے آسماں ابر معکن

بہار کی تعریف شعراے ایران کا ایک عام موضوع ہے جس پر ابتدا سے آجتک سب طبع آزمائیاں کرتے آئے ہیں، لیکن قدما اور متاخرین میں سے کسی نے منوچہری کی طرح نیچر کی تصویر نہیں کھینچی، اس نے سیکڑوں جگہ بہار کا نقشہ دکھایا ہے، اور ہر جگہ گویا فطرت کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے، وہ اور شعرا کی طرح صرف گل و بلبل پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ایک ایک پتے، پھول پھل شاخ، درخت، اور ان سب سے بڑھکر جانوروں اور پرندوں کی صورت اور حالت دکھاتا ہے،

پرندوں کی حالت،

کبکان بے آزار کہ برکوہ بلند اند — بے قہقہہ یکبار ندیدم کہ بخندند
جز خار بناں[1] جایگہ خود نہ پسندند — بر پہلو ازیں تیمہ بداں نیمہ بدندند[2]

[1] خاربناں، خارزار، [2] دیدند، میخرامند،

هر ساعتگی سینه بمنقار برزنند،
چون جزع[1] بر و سینه و چون بسد[2] منقار

شبگیر ز گل فاختگان بانگ برآرند — گوئی که سحرگاه همی خواب گزارند
(وقت صبح)
ماه سه شبه از بر گردن بنگارند — از غالیه بے آنکه همی غالیه دارند
(یعنی ہلال)

صد بار بروزی در پرها بشمارند
چون نیم دبیری که غلط کرده باشمار[3]

هر ساعتگی بط سخنے چند بگوید — در آب جهد جامه دگر بار بشوید
در آب کند گردن و در آب برو[4] — گوئی که مگر چیزے در آب بجوید

چون سینه بجنباند و یک لخت بپوید
از هر سر پرش بجهد صد در شهوار

آمد نوروز دهم از بامداد — آمدنش فرخ و فرخنده باد
باز جهان خورم و خوب ایستاد — مرد زمستان و بهاران بزاد

ز ابر سیه روے سمن بوے دار
گیتی گردید چو دار القرار

روے گل سرخ بیارا ستند — زلفک شمشاد به پیرا ستند

---

[1] جزع مهره سلیمانی که سفید و سیاه باشد [2] بسد، یاقوت، [3] کہتا ہے کہ قمریاں اسطرح بار بار اپنے پرونکو گنتی ہیں (کھولتی ہیں) جس طرح کہ نوآموز حساب داں بار بار حساب بھولجاتا ہے اور ہر کاغذ کو اُلٹتا ہے [4] اشمار، شمار،

کبکاں برکوہ تبک خواستند　　　فاختگاں ہمبر بنشاستند

بلبلکاں زیر ستا خواستند،

(زیر و بم)

ناے زناں بر سر شاخ چنار،

طوطیکاں بر گلکاں تاختند　　　آہوکاں گوش بر افراختند

گورخراں میمنہا ساختند　　　زاغان گلزار بہ پرداختند

بے دلکاں در پے دل تاختند

(عاشق)

باترکاں چنگل و قند ھار

مرغ نہ بینی کہ چہ خواند ہمے　　　مغ نہ بینی چہ ستاند ہمے

دشت نہ بینی بچہ ماند ہمے　　　دوست نہ بینی چہ ستاند ہمے

باغ بتاں زنبتاند ہمے

بر سمن و نسترن و لالہ زار

کردہ گلو پر زباد قمری سنجاب پوش　　　کبک فرو ریختہ مشک بسوراخ گوش

بلبلکاں با نشاط قمریکاں با خروش　　　در دہن لالہ مشک در دہن نحل نوش

سوسن کافور بوی گلبن گوہر فروش

از مہ اردی بہشت دہر بہشت بریں

چوک ز شاخ درخت خویشتن آویختہ　　　زاغ سیہ پر و بال غالیہ آمیختہ

(نام مرغ است)

ابر بہاری ز دور اسپ بر انگیختہ   وز سم اسپ سیاہ لولوتر ریختہ

در دہن لالہ باد ریختہ و بیختہ

ریختہ مشک سیاہ بیختہ در ثمیں

سرو سماطی کشید بر دو لب جویبار   چوں دو رده چتر سبز در دو صف کارزار

مرغ نہاد آشیاں بر سر شاخ چنار   چوں سپر خیزراں بر سر مرد سوار

گشت نگارین تذرو پنہاں در کشت زار

ہمچو عروسی غزلق در بن دریاے چیں

گوئی بط سفید جامہ بصابون زدہ است   کبک دری ساق پاے در قدح خوں زدہ است

برگل تر عندلیب گنج فریدوں زدہ است   لشکر چین در بہار در کہ و ہاموں زدہ است

لالہ سوے جویبار خرگہ بیروں زدہ است

خرگہ او سبز گوں خیمۂ او آتشیں

بادل جب برستے ہیں تو کبھی قطرہ افشانی ہوتی ہی، کبھی ننھی ننھی پھوہار پڑتی ہی، کبھی جھڑی لگ جاتی ہے، سبزہ پر، مختلف قسم کے پھولوں پر، تالاب کی سطح پر بوندوں کے پڑنے سے طرح طرح کی صورتیں پیدا ہو کر ہر ایک کا الگ الگ سماں نظر آتا ہی، منوچہری نے ایک موقع پر تشبیہات کے پیرایہ میں اسکی تصویر کھینچی ہی،

آں قطرۂ باراں بیں از ابر چکیدہ   گشتہ سر ہر برگ ازاں قطرہ بہ آثار

آویختہ چوں ریشہ و دستارچہ سبز   سیمیں گرہے بر سر ہر ریشہ و دستار

یا ہمچو زبرجد گوں یک دستہ سوسن ‏ ‏ اندر سر ہر سوزن یک لولوِ شہوار

واں قطرۂ باراں کہ فرو بارد شبگیر ‏ ‏ بر طرف چمن بر دو رخ سرخ گلنار

گوئی بہ مثل بیضۂ کافور ریاحی (صبح) ‏ ‏ بر بیرم حمرا بہ پراگندش عطار

واں قطرۂ باراں کہ فرود آید از شاخ ‏ ‏ بر تازہ بنفشہ نہ بہ تعجیل بہ ادرار

گوئی کہ مشاطہ ز بر فرق عروساں ‏ ‏ یا ورد ہمے ریزد باریک بمقدار (آہستہ آہستہ) (گلاب)

واں قطرۂ باراں کہ چکد از بر لالہ ‏ ‏ گردد طرف لالہ از آں باراں بنگار (بارا)

پنداری بتجالہ خردک بدمیدا ست ‏ ‏ بر گرد عقیقین دو لب دلبر عیار

واں قطرۂ باراں کہ برافتد بہ سر خوید (آبلہ) ‏ ‏ چوں قطرۂ سیماب برافتادہ بہ زنگار

واں دائرہ ہا بنگر اندر شمر آب ‏ ‏ ہر گہ کہ دراں آب چکد قطرۂ امطار

چوں مرکز پرکار ست آں قطرۂ باراں (تالاب) ‏ ‏ واں دائرہ آب بسان خط پرکار

ہر گہ کہ ازاں دائرہ انگیزد باراں ‏ ‏ وز باد درو چین و شکن خیزد ہر بار

گوئی علمی از سقلاطوں سپید است ‏ ‏ وز باد جہندہ متحرک شدہ بسیار

وانگہ کہ فرو بارد باراں بہ توت (اطلس) ‏ ‏ گیرد شکن آب دگر صورت و آثار

گردد شمر ایدوں چو یکے دام کبوتر ‏ ‏ دیدار ز ہر حلقہ بسے سیمیں منقار (یعنی نقرآ تا ہے)

سراپا نگاری

حلیہ نگاری یعنی کسی خاص چیز کا سراپا لکھنا اور اس کے تمام اوصاف کا بیان کرنا منوچہری اس کا گویا موجد ہے، قصائد میں شعرار بادشاہ کی مدح کے ساتھ تلوار گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی کرتے ہیں، عبدالواسع جبلی اور عرفی شیرازی

اس میدان میں سب سے آگے ہیں، لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں، بخلاف اس کے منوچہری نے تصویر کھینچ کر رکھدی ہے، اس کے ساتھ اکثر صنعت تنسیق الصفات کا التزام کیا ہے، اور وہاں اس کی قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے، کہ بے تکلف موزوں اور متناسب الفاظ کا انبار لگاتا چلا جاتا ہے،

گھوڑا

حبذا اسپے محجل مرکبے تازی نژاد ۔۔۔ نعل او پروین نشان و سم او خارا شکن
رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام ۔۔۔ شخ نورد و وارہ جوی و سیل بر و کوہکن
پشت او چون دوست اوی گوش اوی گردنش ۔۔۔ چون کمان و چون ماح و چون سنان و چون مجن
گاہش اندر شیب تازم گاہ تازم بر فراز ۔۔۔ چون کسی کو گاہ بازی برنشیند بر رسن

دیر خواب و زود خیز و تیز سیر و دوربین ۔۔۔ خوش عنان و کش خرام و پاک زاد و نیکخوی
سخت پاے و ضخم ران و راست دست و گرد سم ۔۔۔ تیز گوش و پہن پشت و نرم چرم و خوز موی
ابر سیر و باد گرد و رعد بانگ و برق جہ ۔۔۔ کوہ کوب و سیل بر و شخ نورد و وارہ جوی
گور ساق و شیر زہرہ یوز تاز و عزم تگ ۔۔۔ پیل گام و گرگ سینہ رنگ تاز و گرگ پوی
تیز چشم آہن جگر فولاد دل کینخت لب ۔۔۔ سیم دندان چاہ بینی ناوہ کام ولوح روی
نیزہ و گرز و کمند و ناچخ و تیر و کمان ۔۔۔ گردن و گوش و دم و سم و دہان و ساق اوی

بیرچہ، باد گزر، یوز دو، و کوہ قرار ۔۔۔ شیر تگ، پیل قدم، گور دو آہو پرواز
گوش و پہلو و میان و کتف و جبہہ و ساق ۔۔۔ تیز فربی و نزار و قوی و پہن و دراز

رہ بر و شخ شکن و شیر دل و ببر عناں　　　　خوش رَو و سخت سم و پاک تن و جنگ آغاز

منوچہری نے اگرچہ کوئی مثنوی نہیں لکھی جس سے واقعہ نگاری کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا، لیکن اکثر قصائد کی تمہید میں وہ واقعہ نگاری کا پیرایہ ڈھونڈھ لیتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلسل داستان لکھ رہا ہے، ان موقعوں پر اس کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے، کہ وہ محض مداحی کے لئے قصیدہ نہیں کہتا، بلکہ زبان کی ترقی دینے کو پیشِ نظر رکھتا ہے، ایک قصیدہ میں عرب کے انداز پر قافلہ کی روانگی، محبوب کی رخصت اور سفر کے حالات لکھے ہیں،

الایا خیمگی خیمہ فرو ہل　　　　کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل

تبیرہ زن بزد طبلِ نخستیں　　　　شتر باناں ہمے بندند محمل

نماز شام نزدیک است امشب　　　　مہ و خورشید را بینم مقابل

ولیکن ماہ دارد قصد بالا　　　　فرو شد آفتاب از کوہ بابل

چناں دو کفۂ زرّیں ترازو　　　　کہ ایں کفہ شود زاں کفہ مائل

نگارِ من چو حالِ من چناں دید　　　　ببارید از مژہ بارانِ وابل

بیامد و فتاں خیزاں برِ من،　　　　چو آں مرغے کہ باشد نیم بسمل

دو ساعد را حمائل کرد بر من　　　　فرو آویخت از من چوں حمائل

چو برگشت از من آں معشوق ممشوق　　　　نہادم صابری را سنگ بر دل

نگہ کردم بہ گرد کارواں گاہ　　　　بہ جائے خیمہ و جائے رواحل

کجاوہ

نہ وحشی دیدم آنجا نہ انسے	نہ راکب دیدم آنجا نہ راجل
بخیب خویش را دیدم بہ یکسو	چو دیوے دست و پا اندر سلاسل
کشادم ہر دو زانو بندش از بند	چو مرغے کش کشاید از حبایل
بر آوردم زبانش از بنا گوش	فرو ہشتم ہویدش تا بہ کاہل
چو مسّاحی کہ پیماید زمیں را	بہ پیمودم بپائے او مراحل
ہمی رفتم شتابان زیر بیاباں	ہمے کردم بیک منزل دو منزل
ہمی بگداخت برف اندر بیاباں	تو گوئی دارد ش بیماری سل
چو پاسے از شب دیرندہ بگذشت	بر آمد شعریاں از کوہ موصل
رسیدم من فرا کارواں تنگ	چو کشتی کو رسد نزدیک ساحل
جرس دستان گوناگوں ہمی زد	بسانِ عندلیبے از عنادل
ز لوک نیزہ ہائے نیزہ داراں	شدہ وادی چو اطراف سنابل
بخیب خویش را گفتم سبکتر	الایا دستگیر مرد فاضل
بچرکت عنبریں باد اچرا گاہ	بچم کت آہنیں باد امفاصل
بیاباں در نورد و کوہ بگذار	منازل را بکوب و راہ بگسل
فرود آور بدرگاہ وزیرم	فرود آور دن اعشی بہ باہل

اقسامِ سخن میں سے منوچہری کے مسمطات[1] مشہور ہیں، وہ درحقیقت اس طرز کا موجد ہے

[1] مسمط میں چھ مصرعے ہوتے ہیں جنمیں سے پانچ مصرعوں کے قافیے متحد ہوتے ہیں،

اور خود بھی اس کو اس پر ناز ہے، چنانچہ کہتا ہے،

طاؤس مدیح عنصری خواند   دراج مسمطِ منوچہری

ان مسمطات میں اکثر جگہ واقعہ نگاری کے نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں، ایک مسمط میں انگوروں کے پھلنے اور ان سے شراب کھینچنے کو ایک حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنی انگور ایک عورت ہے اس نے لڑکیاں جنی ہیں، انگور والا خوش ہے کہ یہ میری لڑکیاں ہیں، اکثر آ آکر دیکھتا ہے، اور خوش ہوتا ہے، اتفاق سے اسے باہر جانا پڑا آکر دیکھا تو بچوں کے سُرخ سفید، چہرے سیاہ ہو گئے ہیں، اور اُنکے پیٹ نکل آئے ہیں، اسکو سخت رنج ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں، لڑکیوں نے عذر خواہی کی لیکن اُس نے نہ مانا اور اُن کے گلے کاٹ ڈالے، اسی طرح شراب پینے کی اخیر حالت تک حکایت کے پیرایہ میں بیان کی ہے،

شاخ انگور کہن دخترکان زاد بسے   کہ نہ از درد بنالید و نہ برزد نفسے

ہمہ از دیک دفعہ نہ پیش و نہ پسے   نہ ورا قابلہ بود نہ فریاد رسے

ایں چنیں آسان فرزند ندیدست کسے

کہ نہ درد بگر فتش متواتر نہ پتے

چوں نگہ کرد بر اں دخترکاں مادر پیر   سر بود ندیکایک چہ صغیر و چہ کبیر

کرد شاں مادر بستر ہمہ از سبز حریر   نہ خورش دادمراں بچگاں را ہیچ و نہ شیر

نہ شغب (شور) کردند آں بچگاں نہ ہیچ نفیر

بچۂ گرسنہ دیدی کہ ندارد شبعے

بچگانش بنہادند تنِ خویش برآب
نہ جہیدند و نہ جنبند ازاں بستر خواب

گرد کردند سرین محکم کردند رقاب
رویہا یکسرہ کردند بہ نگار خضاب

داد شاں رَ زباں پیوستہ شراب چو گلاب
نشد از جانب شاں غائب روز و نہ شبے

گفت پندارم کیں دخترکاں آن من اند
چون دل و چون جگر و چون تن و چون جان من اند

تا بباشند دریں رز در مہمان من اند
رز فردوس من ست ایشاں رضوان من اند

تا دریں باغ و دریں خانہ دریں مان من اند
دارم اندر سر شاں سبز کشیدہ شطبے،

در چو بگشاد بداں دخترکاں کرد نگاہ
دید چوں زنگی ہر یک را دو روے سیاہ

جای جای بچۂ بابان چوں ہرہ تباہ
بچۂ سرخ چو خون و بچۂ زرد چو کاہ

سرنگونسار ز شرم و روے تیرہ ز گناہ
ہر یکے با شکم حاملہ و با ناز بسے،

رزبان را بہ دو ابروی در افتادہ گرہ
گفت لاحول و لا قوت الا باللہ

ایں بلاے بچگاں در حق من آمدہ زہ
ہمہ آبستن گشتند بیک شب کہ و مہ

نیست یک تن بمیان ہمگاں ایدر بہ
ایں چنیں زاینہ باشد بچہ ہر عنبے،

دختراں رز گویند کہ ما بے گنہیم ‌ ‌ ‌ ‌ ما تن خویش بدست بنی آدم نہ دہیم

ما ہمہ سر بسر آبستنِ خورشید وہیم ‌ ‌ ‌ ‌ ما توانیم کہ از خلق جہان و رہیم

نتوانیم کہ از ماہ دستارہ برہیم

زآفتاب و مہ ماں سود ندار دہربے

روز ہر روزی خورشید بتابد بر ما ‌ ‌ ‌ ‌ خویشتن در فگند بر تن ما و سر ما

چوں شب آید برود خورشید از محضرِ ما ‌ ‌ ‌ ‌ ماہتاب آید و برچید در پیکر ما

ویں دو تن دور نہ گردند زبام و درِ ما

نکند ہیچ کس ایں بے ادباں را ادبے

منوچہری کی خصوصیات میں ایک بڑی چیز تشبیہ کی صنعت ہے، جہاں کسی منظر یا حالت کا بیان کرتا ہے، سیکڑوں نئی تشبیہیں پیدا کرتا جاتا ہے، اور یہ اُس کا خاص انداز ہے، اس بہتات کے ساتھ کوئی تشبیہ جدت سے خالی نہیں ہوتی، اس زمانہ تک خیالی اور فرضی تشبیہیں پیدا نہیں ہوئی تھیں، اس لئے عموماً تمام شعرا محسوسات اور مادیات سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن وہی چند مفرد تشبیہیں تھیں جو بار بار ادا ہو کر مبتذل ہو گئی تھیں، منوچہری کی اکثر تشبیہیں مرکب ہیں اور اس کے ساتھ خاص جدت ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں،

آفتاب کا صبح کے وقت بتدریج طلوع ہونا،

بکردارِ چراغ نیم مردہ ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ہر ساعت فزوں گردش روغن

یعنی آفتاب کی روشنی اس طرح آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے، کہ جسطرح ایک چراغ جو

بجھ چلا تھا، اس میں کوئی شخص بتدریج تیل ڈالتا جاتا ہے،

زمین کا بھونچال سے لرزنا،

تو گفتی ہر زمانے ژندہ پیلے　　　بلرزاند ز رنج پشہ گان تن

یعنی زمین بھونچال سے اس طرح جنبش میں ہے جس طرح ہاتھی مچھروں کے اذیت دینے سے جھرجھریاں لیتا ہے،

ہلال

چناں چوں دو سر از ہم باز کردہ　　　ز زر سرخ یک دست آور سجن

یعنی پہلی رات کا چاند اس طرح نظر آتا ہے کہ گویا کسی نے طلائی کڑے کے دونوں سرے کھول دیئے ہیں،

بید کے پتے

واں برگہاے بید تو گوئی کسی بہ قصد　　　پیکانہاے پہن ز برجد کند ہمے

بید کے پتے ایسے معلوم ہوتے ہیں، کہ گویا کسی نے دانستہ زمرد کے پیکان چوڑے بنائے ہیں،

ہدہد اور اسکی کلغی

بو بویک پیکے نامۂ وہ اندر سر خویش　　　نامہ گہ باز کند گہ شکند بر شکنا

ہدہد گویا نامہ بر ہے جس نے خط کو اپنی پگڑی میں کھونس لیا ہی، کبھی اسکو کھولتا ہی کبھی تہ کرکے لپیٹ لیتا ہے،

ہدہد اکثر اپنی کلغی کو پھیلا دیتا ہے، اور پھر سمیٹ لیتا ہے،

مناظر قدرت کے اشعار جو اوپر گذرے ہیں، ان میں بھی اکثر تشبیہات ہیں، ان کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے،

پانچویں اور چھٹی صدی

پانچویں صدی کے آغاز میں اگرچہ شاعری کی ترقی کی رفتار گھٹ گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ اس صدی کے وسط میں غزنوی حکومت کا زوال شروع ہو چلا تھا، اور نئی طاقتیں ابھی شباب تک نہیں پہنچی تھیں، لیکن صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ غزنوی سلطنت کا زور سلجوقیہ کی طرف منتقل ہو گیا، دفعۃً بحرِ سخن میں طوفان آگیا، سلجوقیہ کا پہلا فرماں روا رکن الدین طغرل بک تھا جو محرم ۴۲۹ھ میں بمقام نیشاپور مسند نشین ہوا، اس سلسلہ نے اگرچہ صرف ۱۶۳ برس کی عمر پائی، لیکن اتنی ہی تھوڑی مدت میں جو باتیں اس نے حاصل کیں، تاریخ اسلام کو اس سے گوناگوں اور وسیع تعلقات ہیں، اول تو اس سلطنت نے جو وسعت پیدا کی، ابتدائے اسلام سے آج تک کبھی کسی عہد میں نہیں ہوئی تھی، اسی کے ساتھ عدل و انصاف اور امن و امان کا یہ حال تھا کہ خراسان سے شام تک ایک ہر و تن تنہا سونا اچھالتا جاتا تھا، اور کوئی خبر نہیں ہوتا تھا، ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایران، عراق روم میں جو بڑی بڑی پر زور سلطنتیں قائم ہوئیں، سب کی سب اسی سلسلہ کی شاخیں تھیں، ترکوں سے پہلے جو سلاطین شاہانِ روم کہلاتے تھے، اسی خاندان کی ایک شاخ تھے، سلاطینِ خوارزم شاہیہ جنکی شوکت و شان محتاجِ بیان نہیں، انکا مورث اول یعنی

توشتگین اسی خاندان کا غلام در غلام تھا، اتابکوں کے متعدد خاندان جنمیں سے نور الدین زنگی سلطان صلاح الدین کا آقا، قزل ارسلان ظہیر فاریابی کا ممدوح اور اتابک ابوبکر ابن سعد زنگی شیخ سعدی کا مربی اور سرپرست تھا، سب اسی خاندان کے غلام یا خدمتگزار تھے۔

سلجوقیہ کے اوج شباب کا زمانہ ملک شاہ اور سنجر کا زمانہ ہے، اور یہی دور فارسی شاعری کا معراج شباب ہے، سلجوقی شعرا کی فہرست نہایت وسیع ہے جنمیں سے چند نام یہ ہیں،

امیر معزی، ازرقی، لامعی، فخر الدین اسعد، شہابی خراسانی، عبد الواسع جبلی، انوری، حسن غزنوی، رضی الدین نیشاپوری، ادیب صابر، علی باخرزی، فتوحی مروزی، فرقدی، کافی ہمدانی، نظامی عروضی، نظامی گنجوی، شمس الدین خراسانی سوزنی، ابو المعالی، (مجمع الفصحا کے دیباچہ میں اور بہت سے نام لکھے ہیں)

اس دور کی چند خصوصیات لحاظ کے قابل ہیں،

اس عہد تک شاعری نے اگرچہ بے انتہا ترقی کر لی تھی، لیکن یہ ترقی صرف مضمون اور فن کی حیثیت سے تھی، شاعری کی زبان ابتک ٹکسالی نہ تھی، شاعری کی بنیاد سامانی حکومت میں قائم ہوئی، اور غزنویہ کے عہد میں اوج ترقی تک پہنچی، ان خاندانوں کے پایہ تخت بخارا اور غزنیں تھے، جہاں کی مادری زبان ترکی یا افغانی تھی، شعرا جس قدر تھے من حیث الاغلب سب کے سب انہی مقامات کے رہنے والے تھے جو ایران

۱؎ ملک شاہ ۴۶۵ھ میں تخت نشین ہوا ۴۸۵ھ میں وفات پائی، اسکے بعد سنجر نے اپنے بھائیوں کی طرف سے نیابت بیس برس تک اور پھر مستقل حکومت کی اور ۵۵۲ھ میں انتقال کیا،

اصلی مرکز یعنی شیراز اصفہان و نیشاپور سے دور رہتے تھے، فرخی، سیستانی تھا، عنصری بلخ کا رہنے والا تھا، منوچہری دامغان سے تعلق رکھتا تھا، عسجدی اور دقیقی مرو کے رہنے والے تھے،

سلجوقیہ نے نیشاپور کو پائے تخت قرار دیا، اس تعلق سے ان لوگوں میں شاعری پھیلی جو ایران کی زبان کے اصلی مالک تھے، اسی کا اثر ہے کہ اس عہد کے شعرا کی زبان زیادہ لطیف، شیریں اور محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے،

اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سلطان محمود اپنے ملکی اور قومی خصوصیات کا بہت لدادہ تھا تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی ہی رہی، فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اُس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دیجائے، چنانچہ دولت شاہ سلجوقی نے طبقہ اول کے شعرا کا جہاں ذکر شروع کیا ہے تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان جس کے عنصر میں ترقی کا مادہ موجود تھا سلطنت کی زبان بنکر کس قدر ترقی کر گئی ہوگی،

سلطان سنجر کی قدردانی اور حاتمانہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا، امیر معزی کو ملک الشعراء کا خطاب ملا اور بڑے بڑے شعرا پائے تخت کے شاعر قرار پائے، دولت شاہ لکھتا ہے،

اما از شعرائے بزرگ کہ در دور سلطان سنجر بودہ اند، و مدح سلطان گفتہ اند د

صلہ و تربیت یافتہ ادیب صابر است و رشید و طواط و عبد الواسع جبلی و فرید کاتب و انوری خاوٗرانی و ملک عمادی و سوزنی و سید حسن غزنوی و مہستی دبیرہ کہ محبوب سلطان و ظریفہ روزگار بودؔ"

سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں، اُن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اسکے دربار میں کیا تھی،

ایک دفعہ ارکانِ دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارے سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے، معزی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا، موقع پاکر اس نے برجستہ کہا،

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی	یا ہمچو کمان شہریاری گوئی،
نعلے زدہ از زر عیاری، گوئی	در گوش سپہر گوشواری گوئی،

یعنی اے چاند تو ابروے معشوق ہی، یا بادشاہ کی کمان، یا سونے کا نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ،"

سنجر نے اسپ خاصہ اور ہزار درہم عطا کئے، معزی نے پھر برجستہ کہا،

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید؟	از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید	چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

ؔ دولت شاہ ذکر عمق بخاری،

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے،

چونکہ سنجر کا لقب معز الدین تھا، اسلئے معزی لقب پڑا جو آج تخلص ہوکر مشہور ہے[1]

ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا، اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی، اور سنجر گھوڑے سے گر گیا، معزی نے برجستہ یہ رباعی پڑھی،

شاہا ادبے کن، فلک بدخو را ۔۔۔ کو چشم رسانید رُخِ نیکو را

گر گوے خطا کرد بہ چوگانش زن ۔۔۔ ور اسپ خطا کرد بہ من بخش اورا

یعنی اے بادشاہ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجئے، اُس نے آپ کو نظر لگادی، اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اُسکو ماریئے، اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالہ فرمائیے، اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے، سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا، معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی،

رفتم بر اسپ تا بہ جرمش بکشم ۔۔۔ گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر خوشم

نے گاؤ زمینم کہ جہاں بر گیرم ۔۔۔ نے چرخ چہارمیں کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی، اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سن لیجئے میں کچھ گاؤ زمیں تو نہیں کہ عالم کا بار اٹھالوں، نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لئے پھروں، مطلب یہ کہ سلطان سنجر کا بار اُٹھانا گاؤ زمیں اور آفتاب کا کام ہی،

[1] مجمع الفصحا، اور خزانہ عامرہ وغیرہ،

مہستی ایک مشہور شاعرہ تھی، جس کی حاضر جوابیاں اور ظریفانہ فقرے مشہور عالم ہیں، سنجر کی شاعرانہ صحبتوں میں وہ بھی شریک ہوا کرتی تھی، ایک دفعہ مجلس عیش قائم تھی، مہستی بھی موجود تھی، کسی کام سے باہر نکلی تو دیکھا برف پڑ رہی ہے، واپس آئی، سنجر نے پوچھا ہوا کا کیا رنگ ہے، مہستی نے فی البدیہہ رباعی پڑھی،

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد — وز جملہ خسرواں ترا تحسیں کرد

تا در حرکت، سمند زریں نعلت — بر گل نہ نہند پاے زمیں سیمیں کرد

یعنی آسمان نے اس غرض سے کہ آپ کے گھوڑے کے پاؤں خاک پر پڑنے نہ پائیں زمین پر چاندی بچھادی، سنجر نہایت محظوظ ہوا، اور اسی دن سے مہستی سنجر کے مقربین میں داخل ہوگئی،

غزنوی خاندان نے بھی اس عہد میں سبنھالا لیا، بہرام شاہ جو سلطان محمود کی چوتھی پشت میں تھا، اور ۵۱۲ھ میں تخت نشین ہوا تھا، نہایت شان و شوکت کا بادشاہ اور نہایت علم دوست اور مربی فن تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کا تذکرہ ان لفظوں سے شروع کیا گیا ہے،

"او بادشاہے بود ذی شوکت و صاحب حشمت، با علما و فضلا بسیار نشستے و صحبت ایشاں دوست داشتے، و ہر کسے را بقدر علمش رعایت کردے، لہذا افضلاے آں روزگار باسم شریفش کتب ساختہ اند و تصنیفات پرداختہ اند،"

کلیلہ ومنہ جس کا ترجمہ پہلوی زبان سے عبد اللہ بن المقفع نے عربی میں کیا تھا بہرام شاہ کے حکم سے فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی، اور یہ پہلا دن تھا کہ ایران اور ہندوستان میں اس کا عام رواج ہوا، بہرام شاہ ہی کو یہ فخر نصیب ہوا کہ حکیم سنائی نے جو تعلقاتِ دنیوی سے آزاد ہو چکے تھے، اپنی کتاب حدیقہ اس کے نام پر لکھی، (بہرام شاہ نے ۵۴۷ھ میں وفات پائی)

ان سلاطین کے علاوہ اور بڑے بڑے دربار تھے، جہاں شاعری کی تربیت کیجاتی تھی، ان میں سب سے زیادہ علم دوست طغان شاہ سلجوقی تھا، چہار مقالہ میں لکھا ہے

آلِ سلجوق ہمہ شعر دوست بودند، اما ہیچکس شعر دوست تر از طغان شاہ الپ سلان نبود، محاورت ومعاشرت او ہمہ باشعرا بود وندیمان او ہمہ شعرا بودند، چون امیر عبد اللہ قریشی وابوبکر ازرقی، وابو منصور یوسف وشجاعی قوی واحمد بدیہی وحقیقی ونسیمی اینہا مرتب خدمت بودند وآیند وروند بسیار بودند"

اسی طرح شروان شاہ کے دربار کا ملک الشعرا خاقانی اور خوارزم شاہ کا رشید الدین وطواط تھا

صوفیانہ شاعری

بہرام شاہ کے عہد کا یہ کارنامہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہی کہ تصوف اور اخلاقی شاعری کا سنگِ بنیاد اسی عہد میں رکھا گیا، اور صدی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے، یہ عمارت گویا انجام کو پہنچ گئی، چنانچہ اسکی تفصیل حکیم سنائی، اوحدی اور خواجہ فریدالدین عطار کے حالات میں آئیگی،

فلسفیانہ شاعری

فلسفیانہ شاعری بھی اسی دور کی یادگار ہے فلسفہ کے خیالات سب سے پہلے حکیم ناصر خسرو نے اشعار میں ادا کئے لیکن وہ محض فلسفہ ہی فلسفہ تھا، شاعری نہ تھی، برخلاف اس کے اس عہد میں عمر خیام نے فلسفیانہ مسائل اور خیالات کو اس انداز سے ادا کیا کہ ظاہر میں آدمی کو اس میں صرف شاعری نظر آتی ہے، حالانکہ وہ فلسفیانہ نازک مسائل ہیں جو دلکش اور دلفریب پیرایہ میں ادا کر دیئے گئے ہیں،

اس عہد تک شاعری میں عشق و عاشقی کی روح نہ تھی، مثنوی رزم پر محدود تھی قصائد کا مقصود مداحی تھا تشبیب میں معشوق کا جو ذکر کرتے تھے، وہ صرف عرب کے قصائد کا اتباع تھا، ساقی اور حسین بچوں کا ذکر کرتے تھے تو اس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی، جس طرح امرا کے ہاں تازگی نظر کے لئے پیش خدمت اور غلام حسین اور خوشرو رکھے جاتے تھے، اس عہد میں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جداگانہ صنف قائم

عشقیہ شاعری

کر دی، عرب و عجم میں عاشقی میں جو نامور تھے یعنی مجنون و فرہاد، ان کے حالات میں مثنویاں لکھیں، صرف عاشقانہ جذبات اور خیالات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بزم اور عاشقانہ خیالات کے اظہار کے لئے مستقل لٹریچر پیدا کر دیا جس پر آگے چل کر متاخرین نے بڑی بڑی عمارتیں قائم کیں، غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنمکدہ کے آذر نظامی ہی ہیں،

قصائد کی صنف کو چنداں ترقی نہیں ہوئی، مضامین میں تو کسی قسم کی جدت پیدا نہیں ہوئی، مداحی، خوشامد، مبالغہ پہلے سے بھی بڑھ گیا، البتہ لفظی صناعیاں کمال کے

درجہ کو پہنچ گئیں، عبدالواسع جبلی اور رشید الدین وطواط نے الفاظ پر اس قدر قابو پیدا کر لیا، کہ جس نوع، جس ترکیب، جس انداز کے الفاظ چاہتے ہیں، انکا انبار لگا دیتے ہیں، قصیدے کے قصیدے ہیں، جن میں، تمام الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں جسکو اصطلاح میں صنعت طباق کہتے ہیں، بعض قصیدوں میں التزام کر لیا ہے کہ الف کا حرف جو سب سے عام حرف ہے، نہ آنے پائے، باوجود اس کے یہ قصائد ایسے برجستہ اور رواں ہیں کہ جب تک بتا نہ دیا جائے کہ اسمیں اس صنعت کا التزام کیا گیا ہے اس طرف خیال بھی منتقل نہیں ہو سکتا، اکثر قصیدوں میں یہ التزام ہے کہ ہر مصرع میں پانچ پانچ چھ چھ الفاظ ہیں، اور پہلے مصرع میں جس قدر الفاظ آئے ہیں دوسرے مصرع کے تمام الفاظ بھی انہی الفاظ کے ہموزن، بلکہ ہم قافیہ ہیں، باوجود اس کے کسی قسم کا تکلف نہیں معلوم ہوتا،

عبدالواسع جبلی نے مسجع کو قافیوں تک پہنچایا، جس سے وہ صورت پیدا ہو گئی جس کو عوام بحر طویل کہتے ہیں مثلاً

یا صاحِی ایش الخبر، زاں سرو قدِ سیمبر، کز عشقِ او گشتم سمر، تشنہ لب و خستہ جگر، بر کندہ جان، افگندہ سر، با کامِ خشک و چشمِ تر، کردہ زغم زیر و زبر، دنیا و دین و جان و تن،

یہ ایک مصرع ہے،

یہ قاعدہ ہے کہ جب بارش اچھی ہوتی ہے، تو جو اور گیہوں کے ساتھ مختلف قسم کی زہریلی گھانس اور خار دار درخت اور بوٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ شاعری

کے چمن میں ہجو کا خارزار اسی عہد کی یادگار ہے، جس کے چمن آرا انوری اور سوزنی ہیں۔
ہم اس دور کے چند مشہور شعراء کا تذکرہ لکھتے ہیں،

حکیم سنائی

محدود نام، ابوالمجد کنیت، سنائی تخلص، غزنین وطن تھا، ابتدا میں شاعری کا پیشہ کرتے تھے، چنانچہ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے جو دیوان میں موجود ہیں، لیکن پھر خدا نے توفیق دی اور توبہ کی، توبہ کا سبب ایک دلچسپ قصہ ہے، بہرام شاہ ہندوستان کی مہم پر جارہا تھا، حکیم سنائی نے چاہا کہ اس تقریب سے قصیدۂ مدحیہ لکھکر پیش کریں قصیدہ تیار کرکے، دربار کے قصد سے چلے، راہ میں ایک حمام تھا، یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا، اس کا معمول تھا کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا، اسی لئے اسکو لاے خوار کہتے تھے، حکیم سنائی حمام کے برابر سے نکلے، تو غنغنانے کی آواز سنی، ٹھہر گئے، دیکھا تو لای خوار ساقی سے کہہ رہا ہے کہ ابراہیم شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ دینا، ساقی نے کہا کیا لغو بکتے ہو، ابراہیم شاہ نہایت عادل بادشاہ ہے، پاگل نے کہا، ابھی غزنین کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہوا، دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے، اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی،

یہ کہکر پیالہ اٹھایا اور پی گیا، پھر ساقی سے کہا کہ سنائی کے اندھے پن کے

صدقہ میں ایک پیالہ اور لانا، ساقی نے کہا، سنائی نہایت خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہے اُسکی بُرائی کیوں کرتے ہو، ؟ پاگل نے کہا اس سے بڑھکر کیا حماقت ہوگی کہ دو چار جھوٹ سچ باتیں جوڑکر، کسی بیوقوف رئیس کے پاس جاتا ہی، ادب سے دست بستہ کھڑا ہوتا ہی اور اسکو سناتا ہے، قیامت میں اگر سوال ہوا کہ دربار میں کیا لایا ہے، تو کیا جواب دیگا، [۱]

حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اُسی وقت سب چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹئی کرتے تھے، یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو انکے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا

من نہ مرد زن و زر و جاہم   بخدا گر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم   بہ سر تو کہ تاج نستانم

ید بیضا میں لکھا ہی کہ سروپا برہنہ حج کو گئے، وہاں سے واپس آکر غزنین میں گوشہ نشینی اختیار کی، ننگے پاؤں غزنین کے گلی کوچہ میں پھرا کرتے تھے، انکے عزیزوں کو رحم آتا، ان کو اس حالت میں دیکھتے تو بے اختیار رو دیتے، یہ انکو سمجھاتے کہ میری حالت پر رونا نہیں، بلکہ خوشی کرنی چاہئے، ایک دن لوگوں نے جوتی لاکر پیش کی، اُنکی خاطر سے پہن لی، لیکن اتنا تعلق بھی انکی حالت میں خلل انداز ہوا، چنانچہ دوسرے دن جوتی اُتار کر پھینک دی اور کہا کہ جو بات مجھ میں کل تھی آج نہیں، امیر خسرو نے اسی

[۱] نفحات الانس میں بہرام شاہ کے بجاے سلطان محمود کا نام لکھا ہی، اسی بنا پر تاریخ فرشتہ میں اس واقعہ سے انکار کیا ہے

واقعہ کی طرف ایک قصیدہ میں اشارہ کیا ہی[1]،

نیست بر آں ترک از خود بدار کفش از آنک — ہر سگاف از پاشنایش دین و دولت را درست

ایک رئیس نے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا، انکو خبر ہوئی اسی وقت رئیس کو خط لکھا کہ

ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا، گوشۂ دل ایں گوشہ گرفتہ را بہ تفقد ستایش خود خراب نہ کند جسم حقر ایں بندہ نہ سزائے خشم خداوندی است[1]"

اس زمانہ میں شیخ ابو یوسف ہمدانی مشہور مشایخ میں سے تھے، حکیم سنائی نے اُن سے بیعت کی، شیخ ابو یوسف، ابو علی فارمدی کے مرید تھے جو امام غزالی کے پیر ہیں اس رشتہ سے حکیم سنائی، امام غزالی کے برادر زادہ ہیں،

حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کی، تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں، اسلئے علمائے سخت مخالفت کی، یہانتک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی، بہرام شاہ نے دار الخلافہ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علمار نے لکھا کہ یہ مسائل قابلِ اعتراض نہیں، حکیم سنائی نے اپنی برارت کے متعلق ایک خط بھی بہرام شاہ کے نام لکھا، عبدالقادر بدایونی نے اس خط کو پورا نقل کیا ہی، اس خط سے معلوم ہوتا ہو کہ لوگ اس بات پر ناراض تھے کہ حکیم سنائی نے حدیقہ میں بنی امیّہ کی نہایت

---

[1] یہ تمام تفصیل دولت شاہ میں ہی [2] نفحات،

برائی لکھی تھی، اور اہل بیت کی مدح میں مبالغہ کیا تھا، حکیم سنائی نے ان دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور لکھا کہ آلِ مروان کی بُرائی خود احادیث میں آئی ہو، لیکن حکیم صاحب محدث نہ تھے ورنہ اُن کو معلوم ہوتا کہ گو آلِ مروان کی برائی میں شک نہیں، لیکن حدیثیں جو اُن کی شان میں مذکور ہیں، سب وضعی اور جعلی ہیں،

حکیم سنائی کی وفات میں سخت اختلاف ہو، تاریخ فرشتہ میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے لکھاہے کہ بہرام شاہ کے زمانہ میں وفات پائی، اسی تاریخ میں بعض فضلا کا قول نقل کیا ہو کہ ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا، اور اسی سنہ میں حدیقہ بھی تمام ہوئی تھی دولت شاہ نے ۵۷۶ھ میں لکھا ہو، ریاض العارفین میں ۵۴۶ھ ہو،

نفحات میں لکھا ہو کہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر تھا،

بازگشتم زانچہ گفتم زاں کہ نیست | در سخن معنے و در معنی سخن

تصنیفات

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلیات ہو جبیں تیس ہزار شعر ہیں، سات مثنویاں ہیں، حدیقہ، سیر العباد، کارنامہ بلخ، طریق التحقیق، عشق نامہ، عقل نامہ، بہروز، بہرام، حدیقہ چھپ گئی ہے، اور ہر جگہ ملتی ہو، باقی مثنویاں ناپید ہیں، البتہ سیر العباد کے بہت سے اشعار مجمع الفصحا میں نقل کئے ہیں، حدیقہ کی بحر اور وہی انداز ہو،

کلیات میں قصائد، قطعے، غزلیں، رباعیاں سب کچھ ہے، اور افسوس یہ ہو کہ ان پھولوں میں، ہجو کے کانٹے بھی ہیں،

حکیم سنائی کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ تشبیب اور قصائد میں اُنھوں نے گو اپنے اور تمام معاصرین کی طرح کوئی جدت نہیں پیدا کی، لیکن پختگی، برجستگی، اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہی، اور قدما میں بھی، فرخی کے سوا، اس خصوصیت میں کوئی ان کا ہمسر نہیں، فرخی کے قصیدہ کا جو جواب لکھا ہی، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

دوش سرمست نگارینِ من آں طرفہ پسر ‏ ‏ یا یکے پیرہنے با کلہے طرفہ بہ سر،
از سر کوچہ فرو و آمد متواری دار ‏ ‏ کردہ از غایت دلتنگی صد گونہ حذر،
نرم نرمک ہمی آں نرگس پُرخواب کشاد ‏ ‏ ژالہ ژالہ عرق از عارض او کردہ اثر
بوسہ بر دو لب من وا دہمی از پے عذر ‏ ‏ اینت شوریدہ نگار اینت شکر بوسہ بسر
شادماں گشتم ازیں کار و گرفتمش کنار ‏ ‏ ہمچو تنگِ شکر و خرمنِ گل تنگ بہ بر
او شدہ خواب و من از بوسہ دن و دو رخش ‏ ‏ با دو چشم و دو رخش تا بہ سحر جفت سہر
خود کہ داند؟ کہ دراں نیم شب از مستی او ‏ ‏ تا چہ بر داشتم از بوسہ و ہر چیزے بر

یہی مضمون ہی جسکو قاآنی نے زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہی،

مست در بستر من خفتہ و رندان دانند ‏ ‏ حالتِ مست کہ در بسترِ ہشیار افتد

خیالات اور طرز ادا میں کہیں کہیں جدّت بھی پائی جاتی ہی، مثلاً کمر بر و شجر بر کی طرح میں جو قصیدہ کہا ہی اسمیں ایک قطعہ بند ہے،

در زینت و در رنگ کلاہ و کمر خویش ‏ ‏ زحمت چہ کشی در طلب گوہر و زر بر
ایں اشک من و رنگ رُخ من ببر اے شوخ ‏ ق ‏ ایں را بہ کلہ برزن و آں را بہ کمر بر

یعنی اے معشوق اپنے کمر بند، اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے، میرا آنسو اور میرے چہرہ کا رنگ لیکر کلاہ اور کمر پر لگالے کہ زر و گوہر کا کام دیں گے آنسو گوہر اور چہرہ کا رنگ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے،

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا، اس سے پہلے حضرت ابو سعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن اُن میں صرف جوشِ عشق کو پرزور طریقہ سے ادا کیا ہی، تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف نہیں، بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں، خود حکیم صاحب کو بھی اس کا دعوی ہے، چنانچہ حدیقہ میں کہتے ہیں،

کس نہ گفت این چنین سخن بجہاں	در کسی گفت، گو بیار و بخواں
زیں نمط ہرچہ در جہاں سخن است	گر یکے در ہزار، آنِ من است
چوں ز قرآں گذشتی وز اخبار	نیست کس را ازیں نمط گفتار

اس دعوی کو اکابر صوفیہ بھی تسلیم کرتے ہیں، مولانا روم فرماتے ہیں،

ترک جوشے کردہ ام نیم خام	از حکیم غزنوی بشنو تمام
عطار روح بود و سنائی دو چشم او	ما از پس سنائی و عطار آمدیم

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہی، اور نہایت خوبی سے ادا کیا ہی، اس کتاب کے چوتھے حصہ میں جہاں صوفیانہ شاعری کا ریویو ہوگا حدیقہ کے انتخابات درج کئے جائیں گے،

۳۔ قدما کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی، لیکن طرزِ ادا شاعرانہ نہ تھا، جس بات کو کہنا چاہتے تھے، صاف، بے تکلف، سیدھے سادھے طور پر کہدیتے تھے، معمولی بات کو انوکھے پیرایہ میں ادا کرنا، یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا، متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہی، لیکن اسکے موجد حکیم سنائی ہیں، اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہی،

۴۔ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی، اور آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی، لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دیئے تھے،

اخلاقی شاعری کی سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ جو بات کہی جائے اس کے لئے پیرایۂ بیان ایسا ڈھونڈھا جائے کہ سننے والے کو معلوم ہو کہ اس سے پہلے کسی نے اسکی اصلی حقیقت نہیں ظاہر کی تھی، اور یہ کہ وہ جس کام کو معمولی بات سمجھتا تھا، وہ نہایت نفرت انگیز اور بدترین افعال ہے، اسکے لئے شاعر کو ضرور ہی کہ وہ سامنے کی باتوں سے ایسے نتائج پیدا کرے جو بظاہر بالکل اچھوتے معلوم ہوں، اور جس کی طرف خیال نہ گیا ہو،

مثلاً یہ بات عام ہے کہ طبیب جس چیز کو منع کر دیتا ہے، لوگ اس سے پرہیز کرتے ہیں، لیکن شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کرتے، اب دیکھو حکیم سنائی اس واقعہ سے نصیحت کا کیا پہلو پیدا کرتے ہیں، اُنھوں نے دیکھا کہ طبیب اکثر پارسی، عیسائی، یہودی ہوتے ہیں، یہ بھی دیکھا کہ جن چیزوں کو طبیب منع کر دیتا ہی، اکثر حلال ہوتی ہیں، مثلاً حلوا مٹھائی وغیرہ، اور شریعت جن چیزوں کو منع کرتی ہی وہ مضر اور ناجائز ہوتی ہیں، ان باتوں سے اُنھوں نے اس طرح کام لیا،

ترا یزداں ہمے گوید کہ در دنیا مخور بادہ | ترا ترسا ہمے گوید کہ در صفرا مخور حلوا
زبہر دین تو نگذاری حرام از حرمت یزداں | ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتہ ترسا

یعنی خدا نے حکم دیا کہ شراب نہ پیو، اور عیسائی (طبیب) کہتا ہی کہ حلوا نہ کھاؤ، حلوا حلال چیز تھی، اسکو تو تم نے ایک عیسائی کے کہنے سے چھوڑ دیا، اور شراب جس کو تم خود بھی ناجائز سمجھتے ہو، خدا کے کہنے سے بھی نہیں چھوڑتے، جس سے ثابت ہوتا ہی کہ تم خدا کے حکم کو ایک عیسائی کی بات کے برابر بھی نہیں سمجھتے،

اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ انسان مرکر تمام جھگڑوں سے چھوٹ جاتا ہی، اسی سے حکیم سنائی نے نصیحت کا یہ پیرایہ پیدا کیا ہے،

با ہمہ خلق جہاں گرچہ ازاں | بیشتر گمرہ و کمتر برہ اند،
آں چناں زی کہ چو میری برہی | نہ چناں زی کہ چو میری برہند

یعنی لوگوں کے ساتھ اس طرح پیش آؤ کہ جب مرو تو تم جھگڑوں سے چھوٹ جاؤ، نہ یہ کہ جب تم مرو تو لوگ جھگڑے سے چھوٹیں، یعنی تمھارے افعال سے ہر شخص تنگ آرہا تھا، اس لئے جب تم مروگے تو لوگوں کو نجات ہوگی،

شراب کی برائی کا یہ پہلو ہر شخص جانتا ہے کہ نشہ میں انسان بیہودہ بکتا ہی، گالیاں دیتا ہے، لڑتا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ انسان نشہ کی حالت میں فیاض اور کرم گستر بن جاتا ہے اور یہ تعریف کا پہلو ہے، اب دیکھو شاعر اس تعریفی پہلو سے کیونکر شراب کی برائی کا یقین دلاتا ہی،

نکند عاقل مستی، نخورد دانا مے	نہ نہدم دم ہشیار سوی مستی پے
گر کنی بخشش گویند کہ مے کرد نہ او	ور نہ کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

یعنی شراب ایسی چیز ہے کہ انسان اگر سخاوت بھی کرتا ہے تو لوگ اسکی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ شراب کا فیض ہو،

ازپے رد و قبول عامہ خود را خر مکن	زاں کہ نبود کار عامہ، خر خری یا فرزی
گاؤ را دارند باور در خدائی عامیاں	نوح را باور ندارند از پے پیغمبری

اس قدر سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی قوم نے گوسالہ کی پرستش کی تھی، اور آج بھی ہندوؤں کے نزدیک گاے نہایت مقدس چیز ہے، یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت نوحؑ کو ان کی امت نے پیغمبر تسلیم نہیں کیا، ان دونوں باتوں سے شاعر نے یہ نتیجہ نکالا کہ عوام کا رد و قبول کس قدر ناقابلِ اعتبار ہے، ماننے پر آئے تو گاے کے بچھڑے کو خدا بنا دیا، اور انکار کی طرف جھکے تو حضرت نوحؑ کو پیغمبر بھی تسلیم نہیں کرتے،

اختلاط اور صحبت میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی، اسلئے ارباب حال دونوں طرف گئے ہیں، لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ خوبی کا جو پہلو ہے وہ بھی زحمت سے خالی نہیں،

کسے کش خرد رہنمون است ہرگز	بہ گیتی رہ و رسمِ اُلفت نورزد
کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی	دل مرد دانا ازیں ہر دو لرزد

اگر خود نفاقی است جاں رابکاہد — وگر اتفاقی است ہجراں بیرزد

یعنی اگر صحبت منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہانِ روح ہے، اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے، تب بھی اسلئے بُری ہو کہ اس حالت میں جدائی کا صدمہ جاں گزا ہوگا،

بہ حرص[1] ار شربتے خوردم مگیر از من کہ بد کردم — بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا

چوں[2] تو شدی پیر بلندی مجو، — کاں کہ ز تو زاد، بلند آں شود

روز نہ بینی کہ بہ پایاں رسد — سایۂ ہر چیز دو چنداں شود

زشت[3] باشد روئے نازیبا و ناز — سخت باشد چشم نابینا و درد

با[4] دو قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست — یا رضای دوست باید، یا رضای خویشتن

سوئے[5] آں حضرت نپوید ہیچ دل با آرزو — با چنیں گلرخ نخسپد ہیچ کس با پیرہن

ایں[6] جہاں بر مثال مرداریست — کرگساں گردِ او ہزار ہزار

ایں مر آں را ہمی کشد مخلب — آں مر آں را ہمے زند منقار

(چنگل)

آخر الامر بر پرند ہمہ — وز ہمہ باز ماند ایں مردار

۵ جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے، ایشیا کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے، فارسی شعرا میں مولانا روم پر یہ نشہ چھایا ہوا ہے، خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست

---

[1] گناہ کی معذرت [2] بوڑھے جوان کا مقابلہ نہیں کر سکتے [3] بدلیاقت آدمی کو غرور اور زیادہ بدنما ہے [4] یکسوئی [5] مقام وصال میں ترکِ آرزو [6] دنیا اور طالبانِ دنیا،

ہو جاتے ہیں، لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں، اشعارِ ذیل کو پڑھو، اور ان کے الفاظ، ترکیب، اندازِ بیان، مضمون، ایک ایک چیز کو دیکھو کس طرح جوش سے لبریز ہیں:

یا برو ہمچون زنان رنگی و بوی پیش گیر یا چو مردان اندر آی و گوی در میدان فگن

چون دو عالم زیر پایت قطع شد پائے بکوب چون دو کون اندر دو دستت جمع شد دستی بزن

سر برآر از گلشنِ توحید تا در کوی دین کشتگانِ زندہ بینی انجمن در انجمن

دی ز دل تنگی زمانے طوف کردم در چمن یک جہان جان دیدم آنجا جستہ از زندانِ تن،

بے طرب خوشدل طیور و بے طلب جنبان صبا بے دہان خندان درخت و بے زبان گویا چمن

طلب اے عاشقانِ خوش رفتار طرب اے شاہدانِ شیریں کار

تا کے از خانہ ہان رہِ صحرا تا کے از کعبہ ہین درِ خمار

در جہان شاہدے و ما فارغ! در قدح جرعہ و ما ہشیار

بسکہ شنیدی صفتِ روم و چین خیز و بیا ملکِ سنائی ببین

تا ہمہ دل بینی بے حرص و بخل تا ہمہ جاں بینی بے کبر و کین

پای نہ و چرخ بزیر قدم دست نہ و ملک بزیر نگین

رستہ ز ترکیبِ زمان و مکان جستہ ز ترتیبِ شہور و سنین

روح ایں دادہ بدینش ہمانکہ دادہ بہ مریم زرہ آستیں

۶- شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جز تمثیل اور تشبیہ ہے، شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعویٰ کرتا ہے تو دلیل میں اسکو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے، کبھی کسی چیز کی اچھائی

یا برائی ثابت کرنا، یا کسی چیز کی تصویر اور ہیئت کھینچنا چاہتا ہے تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا، اسی بنا پر اکثر بڑے بڑے شاعر مثلاً سعدی، صائب، کلیم وغیرہ تمثیل میں کمال رکھتے تھے، شاعری کی اس صنف کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں، ذیل کی مثالوں سے معلوم ہوگا کہ انکی تمثیلیں کس قدر نادر اور موثر ہوتی ہیں،

حصول مقصد کے لئے دیر اور انتظار شرط ہے،

اور جو مقصد جسقدر اہم ہوگا اسیقدر زیادہ دیر ہوگی،

ہر خسے از رنگ و رقائے بدین رہ کے رسد
درد باید صبر سوز و مرد باید گام زن

ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن

ماہہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
صوفئے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ساعت بسیار می باید کشیدن انتظار
تا کہ در جوف صدف باراں شود در عدن

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع
عالمے گویا شود یا فاضلے صاحب سخن

صدق و اخلاص و درستی باید عمر دراز
تا قرین حق شود صاحبقرانے در قرن

تو علم[1] آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب
چو دزدے با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا

چو تن[2] جاں را مزین کن بہ علم و دین کہ زشت آید
درون سو شاہ عریاں بروں سو کوشک دیبا

اب ہم حکیم سنائی کے بعض قطعات و قصائد کے اشعار یکجا لکھتے ہیں، جس سے انکی عام شاعری کا اندازہ ہو سکے گا۔

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں والا
قدم زیں ہر دو بیروں نہ اینجا باش و نہ آں جا

[1] علم زیادہ پر خطر گناہوں کا سبب ہو سکتا ہے [2] صفائی ظاہری کے ساتھ صفائی باطن بھی مشروط ہے،

بہر چہ از راہ باز افتی چہ کفر آں حرف چہ ایماں — بہر چہ از دوست وامانی چہ زشت آں نقش چہ زیبا

چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید — گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

مرا بارے بحمد اللہ نہ راہِ حکمت و ہمت — بسوے خط وحدت برد عقل از خطہ اشیا

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت — ہمے گویم بہر ساعت چہ در ضرا چہ در سرا

کہ یارب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت — چناں کزوی بہ رشک آید روانِ بوعلی سینا

مگرداں عمر من چوں گل کہ در طفلی شوم کشتہ — مگرداں حرص من چوں مل کہ در پیری شوم برنا

بہر چہ از اولیا گفتند ارزقنی و وفقنی — بہر چہ از انبیا گفتند آمنّا و صدقنا

پردہ دار عشق داں رسمِ ملامت بر فقیر — پاسبان در شناس ایں آب تلخ اندر بحار

اے بسا عنا کہ اندر حشر خواہد بد ازاں کہ — ہست ناقد بس بصیر و نقد ہا بس کم عیار

عقل جزوی کے تواند گشت بر کیہاں محیط — عنکبوتے کے تواند کرد سیمرغے شکار

کے شود ملک دو عالم تا تو باشی ملکِ آں — کے بود اہل نثار آں کس کہ بر چیند نثار

باش تا کل یابی آنہا را کہ امروزند جزو — باش تا گل یابی آنہا را کہ امروزند خار

گوئی کہ بعد ما چہ کنند و کجا روند — فرزندگان و دخترگان یتیم ما

خود یاد ناوری کہ چو کردند و چوں شدند — آں مادران و آں پدران قدیم ما

آدمی را دو بلا کرد رہے، — داند از ہر دو بلا، روز بہی،

یا کند پرشکم خویش زناں — یا کند پشت خود از آب تہی،
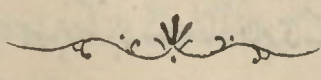
عمروخیام بن ابراہیم نیشاپوری

عمرو نام، خیام لقب نیشاپور وطن، غالباً آبائی پیشہ خیمہ دوزی تھا، جس کی وجہ سے خیام کا لقب ملا، عمرو نے جب تحصیل شروع کی تو دو شخص اس کے ہم سبق تھے اُن میں رابطۂ محبت اس قدر بڑھا کہ سب نے عہد کیا کہ ہم میں سے جب کوئی شخص بڑے منصب پر پہنچے گا تو اپنے ساتھیوں کو بھی اپنا ہمسر بنائے گا، اس وقت دنیا کو کیا معلوم تھا کہ یہ مکتب کے لونڈے جو اس وقت ایک خیالی منصوبہ باندھتے ہیں، آگے چل کر دنیا کی تاریخ بدل دیں گے، ان میں سے ایک کا نام حسن ابن علی اور دوسرے کا حسن تھا، حسن بن علی نے رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کی کہ الپ ارسلان سلجوقی کا وزیر ہوگیا اور ۴۶۵ھ میں جب الپ ارسلان نے وفات پائی، اور ملک شاہ سلجوقی مسند آرا ہوا تو وہ کل سیاہ وسفید کا مالک تھا، یہی حسن ہے، جو آج نظام الملک (بانی نظامیہ بغداد) کے نام سے مشہور ہے، عمرو خیام کو جب معلوم ہوا کہ میرا ہم سبق تاج و تخت کا مالک ہے تو اصفہان میں نظام الملک کے پاس آیا، نظام الملک نے بڑے احترام سے خیر مقدم کیا، نظام الملک کو اپنا عہد یاد تھا، خود پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، خیام جو کچھ چاہتا، اس کو

مل سکتا تھا، لیکن ملکِ قناعت کے شہنشاہ نے صرف معمولی وجہ معاش کی درخواست کی، نظام الملک نے خیام کے وطن نیشاپور میں کم وبیش بارہ سو روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر کردی[1]، خیام نے اگرچہ صرف معمولی جاگیر پر قناعت کی، لیکن سلاطین وامرار اس سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے، شمس الملوک خاقان بخاری اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا، ملک شاہ سلجوقی جو دنیائے اسلام کا شہنشاہ اعظم تھا، اس سے ندیمانہ تعلقات رکھتا تھا[2]، دولت شاہ سلجوقی نے لکھا ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے برابر تخت پر بٹھاتا تھا لیکن شہرزوری کی تاریخ الحکما سے معلوم ہوتا ہے کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے، شہرزوری نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس زمانہ میں سنجر شاہزادہ تھا، اس کو چیچک نکلی خیام معالجہ کے لئے طلب ہوا، وزیر نے خیام سے پوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے، خیام نے کہا آثار اچھے نہیں، یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی، اس کو نہایت رنج ہوا، اور یہ رنج ہمیشہ قائم رہا،

۴۶۷ھ میں ملک شاہ نے ایک عظیم الشان رصدخانہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، دور دور سے بڑے بڑے ہیئت دان اور منجم بلوائے، ان میں ابوالمظفر اسفزاری میمون بن نجیب واسطی، اور ہمارا نامور خیام بھی تھا، ابن الاثیر نے جہاں

---

[1] دولت شاہ، لیکن جاگیر کی آمدنی کی تعیین اور کتابوں سے ماخوذ ہے،

[2] تاریخ الحکمار شہرزوری،

اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ اس رصد خانہ پر بیشمار دولت صرف ہوئی، اس رصد سے جو زیج تیار ہوئی وہ خاص خیام کی تیار کردہ تھی، چنانچہ کشف الظنون زیج ملک شاہی کے ذکر میں صاف تصریح ہے،

خیام زیادہ تر فلسفۂ یونان کا درس دیتا تھا، اور اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا، یہ خیالات جب زیادہ پھیلے تو عوام میں سخت برہمی پیدا ہوئی یہانتک کہ لوگوں نے اسکو بے دین قرار دیکر قتل کر دینا چاہا، مجبوراً اس نے حج کا ارادہ کیا کہ حرم میں کوئی کسی کو ستا نہیں سکتا، حج سے فارغ ہو کر بغداد میں آیا، یہاں لوگوں نے نام سنا تو ہر طرف سے ٹوٹ پڑے کہ علومِ فلسفیہ سیکھیں، لیکن اس نے انکار کیا، اور بغداد سے چل کر وطن میں آیا[۱]،

وفات | اس کی وفات کا دلچسپ حصہ ہے، ایک دن بوعلی سینا کی کتاب الشفاء مطالعہ کر رہا تھا، جب وحدت و کثرت کی بحث آئی تو اٹھ کھڑا ہوا، عادت تھی کہ ہر وقت خلال پاس رکھتا تھا، اس کو ورق میں رکھ کر اٹھا، نماز پڑھی، وصیت کی شام تک کچھ نہ کھایا، نمازِ عشا پڑھ کر سجدہ کیا اور کہا اے خدا جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے تجھکو پہچانا، اسلئے مجھ کو بخش دے، یہی کہتے کہتے جان نکل گئی، مجمع الفصحا میں ہے کہ ۵۱۷ھ میں وفات پائی،

دفن کا قصہ اس سے بھی عجیب تر ہے، نظامی عروضی اس زمانہ کا مشہور شاعر

---

[۱] تاریخ الحکما رجمال الدین قفطی،

ہے جس کی کتاب چار مقالہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس کا بیان ہے کہ ۵۰۶ھ میں
میں بلخ گیا، معلوم ہوا کہ خیام آجکل یہیں امیر ابو سعید کے مکان پر مقیم ہے، میں
خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں خیام نے کہا کہ میری قبر ایسے مقام میں بنیگی
کہ ہر سال دو دفعہ درخت اس پر پھول برسائیں گے، مجھکو تعجب ہوا، ساتھ ہی خیال
آیا کہ ایسا بڑا شخص لغو گو نہیں ہوسکتا، ۵۳۰ھ میں میں جب نیشاپور پہنچا تو حکیم موصوف
کا چند برس پہلے انتقال ہو چکا تھا، چونکہ مجھ پر شاگردی کا حق تھا، ایک آدمی کو ساتھ
لیا کہ قبر کا پتہ بتائے، وہ قبرستان حیرہ میں لوا گیا، دیکھا تو باغ کی دیوار کے نیچے قبر
ہے، سرھانے امرود اور زرد آلو کے درخت ہیں، شگوفہ جھڑ کر اس قدر ڈھیر ہو گئے
ہیں، کہ قبر ڈھک گئی ہے، مجھکو حکیم موصوف کا قول یاد آگیا، اور بے اختیار آنسو نکل پڑے[1]

فضل و کمال | خیام کو آج زمانہ شاعری کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن وہ فلسفہ میں
بو علی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب تاریخ میں امام فن تھا، جمال الدین
قفطی نے تاریخ الحکما میں اس کا نام ان القاب سے شروع کیا ہے" امام خراسان و
علامۃ الزمان، شہرزوری تاریخ الحکما میں لکھتے ہیں، کان تلو ابی علی فی اجزاء علوم الحکمۃ
وکان عالما باللغۃ والفقہ والتواریخ، حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ اصفہان میں
ایک کتاب نظر سے گذری، سات دفعہ اس کا مطالعہ کیا، نیشاپور میں واپس آیا تو ساری
کتاب زبانی لکھوا دی، اصل سے مقابلہ کیا گیا تو خفیف فرق نکلا[2]،

---

[1] چہار مقالہ ذکر منجم ماہر [2] شہرزوری،

ایک دفعہ وزیر عبد الرزاق کے ہاں علمی صحبت تھی، ابو الحسن غزالی جو اس زمانہ میں فن قرأت کے امام تھے وہ بھی موجود تھے، اتفاق سے خیام بھی آنکلا، عبد الرزاق نے خیام کو آتا دیکھکر کہا علی الخبیر سقطنا، یعنی واقف کار آگیا، مسئلۂ زیر بحث کو خیام کے آگے پیش کیا، اس نے ساتوں قرأتیں، شاذ روایتیں، اور ان کے دلائل اور وجوہ بیان کرکے ایک قرأت کو ترجیح دی، غزالی بے اختیار بول اٹھے کہ حکما کا کیا ذکر خود قرأ میں سے کسی کی یہ معلومات نہیں ہوسکتیں[1]

قاضی عبد الرشید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ خیام سے میں مرو کے حمام میں ملا، اور سورۂ معوذتین کے معنی دریافت کئے، یہ بھی پوچھا کہ ان سورتوں میں بعض الفاظ بار بار کیوں آئے ہیں، خیام نے برجستہ جواب دینا شروع کیا، مفسرین کے اقوال، اُنکے دلائل اور شواہد اس تفصیل اور وسعت سے بیان کئے کہ اگر ساری تقریر قلمبند کرلیجاتی تو اچھی خاصی کتاب بنجاتی[2]

فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے مذہبی علما اس سے مخالفت رکھتے تھے، اس زمانہ میں مذہبی گروہ کے پیشرو امام غزالی تھے، جنھوں نے تہافۃ الفلاسفہ لکھکر فلسفہ کا ابطال کیا تھا، وہ مناظرہ کے لئے خیام کے پاس گئے، اور پوچھا کہ آسمان کے تمام اجزا باہم متشابہ اور متحد الحقیقۃ ہیں، پھر بعض اجزا میں کیا خصوصیت تھی کہ قطبین قرار پائے، خیام مسائلِ فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا، اس نے پہلے تو یہ کہکر ٹالا کہ میں

---

[1] شہرزوری، [2] ایضاً،

اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں تفصیل لکھ چکا ہوں، پھر جواب یا تو اس طرح
کہ پہلے ابتدائی مراتب بیان کئے، چنانچہ اس مسئلہ سے ابتدا کی کہ حرکت کس مقولہ سے
ہے، پھر اس کو اس قدر پھیلایا کہ یہ مسئلہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ظہر کی اذان کی آواز آئی
امام غزالی یہ کہہ کر اُٹھ گئے، جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً

نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے، لیکن یونانی حکما عموماً اس کے قائل تھے، وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوے، خیام اس فن میں کمال رکھتا تھا، اور اس لئے منجم کہلاتا تھا، ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن المظفر کے پاس آدمی بھیجا کہ میں شکار کو جانا چاہتا ہوں، خیام سے کہدو کہ اعمال نجوم کے ذریعہ سے ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو، خیام نے دو دن کے غور و فکر کے بعد ایک دن معین کیا، بادشاہ اسی دن سوار ہوا، کوس دو کوس گیا ہوگا کہ بڑے زور کا بادل اُٹھا اور چاروں طرف برف بچھ گئی، لوگوں نے خیام کی ہنسی اُڑائی، بادشاہ نے چاہا کہ وہیں سے پلٹ جائے. خیام نے کہا ابھی بادل پھٹے جاتے ہیں، اور پانچ دن تک زمین نم بھی نہ ہوگی، اتفاق یہ کہ خیام کی پیشین گوئی پوری اُتری[۲]"

تصنیفات تصنیفات بہت کم ہیں، زیچ جو تیار کی تھی، اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتہ نہیں لیکن یورپ نے چھاپکر شائع کی ہی، باقی چند رسالے ذیل میں درج ہیں جن کا ذکر شہرزوری نے کیا ہے،

---

[۱] شہرزوری [۲] تاریخ الحکما،

طبعیات میں ایک مختصر رسالہ،

وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ،

کون اور مسئلہ تکلیف پر ایک رسالہ، (یہ رسالہ آج کل مصر میں چھاپا گیا ہی)

عربی میں بہت سے شعر لکھے ہیں، چند ذیل میں درج ہیں (از شہرزوری)

یدبر لی الدنیا بل السبعة العلی   بل الافق الاعلی اذا جاش خاطری
اصوم علی الفحشاء جهرا وخفیة   عفافا وافطاری بتقدیس خاطری
وکم عصبة ضلت عن الحق فاهتدت   لطرف الهدی من فیضی المتقاطر
فان صراط المستقیم بصائر   نصبن علی وادی العمی کالقناطر

اذا قنعت نفسی بمیسور بلغة   یحصلها بالکد کفی وساعدی
امنت تصاریف الحوادث کلها   فکن یا زمانی موعدی او مساعدی
وهبنی اتخذت الشعری بین منازلی   وفوق مناط الفرقدین مصاعدی
الیس قضی الرحمن فی حاکمه بان   یعبد الی نحس جمیع المساعد
متی باعدت دنیاک کان مصیبة   فوا عجبا من ذا القریب لمباعد
اذا کان محصول الحیاة منیة   فسیان حالا کل ساع وقاعد

رضیت دهرا طویلا فی التماس اخ   یرعی ادی اذا ذو خلة خانا
فکم الفت وکم اخیت غیر اخ   وکم تبدلت بالاخوان اخوانا
وقلت للنفس لما غر مطلبها   بالله ما تالفی ما عشت انسانا

عجیب بات ہے، خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں، تاریخ میں کمال رکھتا تھا، لیکن اتنے ستاروں کے ساتھ اسکا افقِ شہرت بالکل تاریک ہے، جس چیز نے آٹھ سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا، وہ چند فارسی رباعیاں ہیں، اور یہی اسکی شہرت کے بال پرواز ہیں، ان رباعیوں کیساتھ مسلمانوں نے جسقدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجہ بڑھکر یورپ نے کیا،

ہماری کتاب کا اصل موضوع شاعری ہے، اسلئے سب سے پہلے ان رُباعیوں کی تنقید میں ہمکو شاعری کا پہلو پیش نظر رکھنا چاہیئے، اگر ان رباعیوں میں کوئی فلسفہ نہیں ہے، کوئی اخلاقی تعلیم نہیں ہے، کوئی دقیق نکتہ نہیں ہے تو نہ ہو، بحث صرف یہ ہے کہ شاعری اور شاعری کیساتھ زبان کی خوبی اور صفائی ہے یا نہیں؟ یعنی خیام اگر حکیم نہ ہوتا تو کم از کم شاعر ہو سکتا تھا یا نہیں؟

شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے، شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے اور ایسے دلکش اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں، اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طریقہ کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے، کبھی شاعرانہ طرز استدلال سے، کبھی شوخی و ظرافت سے، کبھی استعارہ و تشبیہ کی ندرت سے، اور سچ یہ ہے کہ اسکی تمام ادائیں متعین اور مشخص نہیں ہو سکتیں، سننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی،

کیوں ہی، یہ کچھ نہیں معلوم،

خوبی ہمیں کرشمۂ و نازخرام نیست   بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

خیام کی رُباعیاں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں، دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلۂ جبر، توبہ استغفار، ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سوسو دفعہ کہتا ہے، لیکن ہر دفعہ اسطرح بدل کر کہتا ہو کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے،

دنیا کی بے ثباتی اور اس سے عبرت کا مضمون نہایت پامال مضمون ہے، لیکن خیام ہر بار ایک ایسا نیا اسلوب ڈھونڈھ لاتا ہے کہ نیا اثر پیدا ہوتا ہے،

توبہ و استغفار بھی ایک فرسودہ مضمون ہے لیکن جس طرح خیام اسکو ادا کرتا ہو سننے والے کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں، بعض جگہ رقت انگیز طریقہ کو چھوڑ کر استدلال کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور وہ بظاہر ایسا قوی ہوتا ہے کہ گویا اس کا جواب نہیں ہو سکتا، امثلۂ ذیل کو دیکھو،

جدت اسلوب

رباعی

بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن   بر جان و دلِ اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات و من بخشائے   بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

مغفرت کی دعا مانگتا ہے، لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے (گو وہ اسی کے ہاتھ پاؤں ہیں) اس طریقہ سے دعا کا اثر بڑھتا ہو، کیونکہ اپنے

لئے دعا مانگنا پھر بھی ایک قسم کی ذاتی غرض ہی، اسکے ساتھ نکتہ یہ ہے کہ اعضا کی براءت آسانی سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ان کا کیا قصور ہے، وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کر سکتے،

ہاتھ اور پاؤں کے مقابلہ میں صنعتِ طباق ہی، اور اس سے بھی ایک لطف پیدا ہوگیا ہے،

در ملکِ تو از طاعت ما ہیچ فزود؟ | وز معصیتے کہ ہست نقصانے بود؟
بگذار و مگیر از اں کہ معلوم شد | گیرندۂ دیری و گذارندۂ زود؟

خدا سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہو گئی، ؟ اور اگر گناہ کیا تو کیا کچھ تیرا نقصان ہوگیا، اے خدا مجھکو چھوڑ دے، اور گرفت نہ کر مجھکو معلوم ہوگیا ہی کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہی اور جلد چھوڑ دیتا ہی،

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست | تاریک دلم نور صفائی تو کجا است
مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی، | آں بیع بود لطف عطای تو کجاست

کس شاعرانہ انداز سے مغفرت کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ اے خدا اگر تو بہشت طاعت کے معاوضہ میں دیگا تو یہ تو خرید و فروخت ٹھہری (جو سوداگروں کا کام ہے نہ شاہوں اور شہنشاہوں کا) وہ لطف وہ عطا جس کے قصے سنا کرتے تھے، وہ کہاں ہی، یہی مضمون ہی جس کو شیخ سعدی نے گلستاں میں ادا کیا ہی، اور وہ گلستاں کے خاص محاسن میں شمار کیا جاتا ہی، "بدریوزہ گری آمدہ ام نہ بہ تجارت۔"

آنم کہ پدید گشتم از قدرت تو صد سالہ شدم بناز و در نعمت تو

صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد تا جرم من است بیش یا رحمت تو

دیکھو کس ادا سے مغفرت چاہتا ہے، کہتا ہے کہ میں سینکڑوں برس دانستہ گناہ کرونگا، مجھکو یہ امتحان کرنا ہے کہ میرا جرم زیادہ ہے، یا تیری رحمت، یعنی دیکھوں ان دونوں میں کون غالب آتا ہے،

فریاد کہ عمر رفت بر بیہودہ ہم لقمہ حرام ہم نفس آلودہ

فرمودۂ ناکردہ سیہ رُویم کرد فریاد ز کردہائے نافرمودہ

فرائض کو فرمودۂ ناکردہ، اور گناہوں کو کردہائے نافرمودہ سے تعبیر کیا ہی،

مشہور ہے کہ ایک دفعہ خیام کی صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی اس پر اس نے رباعی لکھی،

ابریق می مرا شکستی ربّا بر من در عیش را ببستی ربّا

بر خاک بریختی مے لعل مرا خاکم بدہن کہ سخت مستی ربّا

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خدا نے اسکو سزا دی اور اس کی گردن کج ہو گئی، اس پر اس نے برجستہ کہا،

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو

من بد کنم و تو بد مکافات دہی پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

یعنی میں نے بُرائی کی، اب تو اسکی سزا بھی ویسی ہی بُری دیتا ہے، تو مجھ میں اور

تجھ میں کیا فرق رہ گیا،

طلب مغفرت کا مضمون اکثر شعرا نے باندھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

گناہ من ار نامدے در شمار | ترا نام کے بودے آمرزگار

اردو کا ایک شاعر کہتا ہے،

عوض نہ لے مرے جرم و گناہ بیحد کا | الٰہی تجھکو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھکر مجھے محتاج | یہ اون کے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

لیکن خیام کا طرز ادا اور استدلال سب سے اچھوتا ہے، وہ شاعرانہ استدلال سے سزا پانے کی حالت میں مجرم اور آقا کی مساوات ثابت کرتا ہے، اور پھر اسکو جملۂ خبریہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ استفہام کے طریقہ سے ادا کرتا ہے، جو نہایت موثر اور لاجواب کر دینے والا ہوتا ہے،

شوخی و ظرافت خیام باوجود حکیم ہونے کے نہایت شوخ اور ظریف الطبع تھا، اسلئے اکثر مضامین کو ظرافت اور شوخی کے پیرایہ میں ادا کرتا ہے مثلاً

اے چرخ ز گردش تو خرسند نیم | آزادکنم کہ لائق بند نیم
گر میل تو با بے خرد و نااہل است | من نیز چناں اہل و خردمند نیم

ایشیا کا عام خیال ہے کہ آسمان ارباب خرد کو آرام اور چین نہیں دیتا، خیام آسمان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تیری چالوں سے بہت تنگ آگیا ہوں، اگر تو احمقوں اور نااہلوں ہی سے محبت رکھتا ہے تو میں بھی کچھ بہت اہل اور عاقل نہیں ہوں

در مسجد اگر بہر نیاز آمدہ ام | باللہ کہ نہ از بہر نماز آمدہ ام
یک روز اینجا سجادہ دزدیدم | آں کم شدہ است از آں باز آمدہ ام

گویند کہ مے مخور کہ شعبان نہ رواست | نہ نیز رجب کہ آں مہ خاص خداست
شعبان و رجب مہ خدا اند و رسولؐ | ما مے رمضاں خوریم کاں خاصۂ ماست

ایران میں اکثر مہینوں کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً شعبان کو رسول کا مہینہ اور رجب کو خدا کا مہینہ کہتے ہیں، خیام کہتا ہے کہ لوگ ان مہینوں میں شراب پینے سے منع کرتے ہیں کہ یہ خدا اور رسولؐ کے مہینے ہیں اور واقعی ان کی یہ ہدایت بجا ہے، اس بنا پر میں رمضان میں شراب پیتا ہوں، کہ یہ خاص ہم لوگوں کا مہینہ ہے،

گویند کہ آں کساں کہ با پرہیز اند | زاں ساں کہ میرند بداں ساں خیزند
ما با مے و معشوق از انیم مقیم | تا بو کہ بحشر آں چناں انگیزد

مشہور ہے کہ انسان جس حالت میں مرتا ہے، اسی حالت میں قیامت میں اُٹھیگا، خیام کہتا ہے، اسی لئے تو میں رات دن شراب اور معشوق کے ساتھ بسر کرتا ہوں کہ قیامت میں بھی اسی حالت میں اٹھوں،

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید | من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخر شعبان بخورم چنداں مے | کاندر رمضاں مست بخسپم تا عید

ایران میں جتنے شراب خوار ہیں رمضان میں شراب خواری چھوڑ دیتے ہیں خیام کہتا ہے کہ میں شعبان کے اخیر میں اتنی پیکر سوؤنگا، کہ عید کے بعد نشہ اُترے قاآنی نے

اسی مضمون کو نیچرل بنا دیا ہے،

مے خوردن ایں ماہ روا نیست ولیکن | مستانہ تواں خورد بہ شب یکدو سہ ساغر
یا خوردبداں گونہ بباید کہ زمستی | تا شام دگر بر نتواں خاست زبستر

لیکن ایک اور شاعر نے سب سے لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے، ایک غزل میں جسکی ردیف "نمی دانستم" ہے، کہتا ہے،

قرب یک ماہ بہ میخانہ اقامت کردم | اتفاقاً رمضاں بود نمی دانستم
ہر گہ کہ طلوع صبح ازرق باشد | باید کہ بکف جام مروق باشد
گویند بہ افواہ کہ مے تلخ بود | شاید کہ بہر حال کہ مے حق باشد

عربی کا فقرہ ہے "الحق مُرٌّ" یعنی حق بات تلخ ہوتی ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب کا مزا تلخ ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب حق ہے، مرزا غالب نے اسی سے ایک اور مضمون پیدا کیا ہے

نگفتۂ کہ بہ تلخی بساز و پند پذیر | برو کہ بادۂ ما تلخ تر از یں پند است

یعنی تم یہی ہدایت کرتے ہو نہ کہ انسان کو تلخی گوارا کرنی چاہیئے اور نصیحت سننی چاہیئے تو ہماری شراب تمھاری نصیحت سے زیادہ تلخ ہے، ہمکو دوسری تلخی کی کیا ضرورت ہے،

دستِ چو منے کہ جام و ساغر گیرد | حیف است کہ آں دفتر و منبر گیرد
تو زاہد خشکی و منم فاسق تر | آتش نشنیدۂ کہ در تر گیرد
من در رمضاں روزہ اگر میخوردم | تا ظن نبری کہ بے خبر میخوردم

از محنت روزہ روز من چوں شب شد — پنداشتہ بودم کہ سحر میخوردم

طبعم بہ نماز و روزہ چوں مائل شد — گفتم کہ مراد کلیم حاصل شد

افسوس کہ ایں وضو بیادے بشکست — واں روزہ بہ نیم جرعہ باطل شد

اس میں ظرافت کیسا تھ اس بات کا بھی اشارہ ہے، کہ جو لوگ ظاہری نماز روزہ ادا کرتے ہیں، انکی عبادت کی ہستی بس اسی قدر ہے،

گویند کہ فردوس بریں خواہد بود — آں جا مے ناب و حور خواہد بود

گر ما مے و معشوق گزیدیم چہ باک — چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ بہشت میں بھی جسمانی آرام و عیش ہوگا اور شراب اور حوریں ملیں گی، ظریفانہ پیرایہ میں انکار رد کرتا ہے کہ اگر وہاں بھی یہی سب ہوگا تو اگر ہم نے دنیا ہی میں ان چیزوں کو ہمیشگی اختیار کر لیا تو کیا برا کیا،

زاہد گوید بہشت با حور خوش است — من میگویم شراب انگور خوش است

ایں نقد بگیر و دست ازاں نسیہ بدار (ادہار) — آواز دہل شنیدن از دور خوش است

ما را گویند دوزخی باشد مست — قولی است خلاف دل در و نتواں بست

گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود — فردا بینی بہشت را چوں کف دست

یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ عاشق اور مست بہشت میں نہ جانے پائیں گے تو دیکھ لینا بہشت چٹیل میدان کی طرح خالی پڑی ہوگی یعنی عشق اور مستی لازمۂ انسانی ہے، اس سے کون شخص خالی ہو سکتا ہے،

گویند بہشت حور و کوثر باشد | جوے مے و شہد و شیر و شکر باشد
یک جام بدہ ز بادہ ام اے ساقی | نقدے ز ہزار نسیہ بہتر باشد

از ہرچہ خورد مرا شراب اولیٰ تر | با سبز خطاں بادۂ ناب اولیٰ تر
عالم ہمہ سر بسر رباطی ست خراب | در جاے خراب ہم خراب اولیٰ تر

ما ئیم خریدار مے کہنہ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

آں بادۂ خوشگوار بر دستم نہ | آں ساغر چوں نگار بر دستم نہ
آں مے کہ چو زنجیر بہ پیچد برخود | دیوانہ شدم بیار بر دستم نہ

نہ لائق مسجدم نہ درخور کنشت | ایزد داند گل مرا از چہ سرشت
نہ دین و دنیا و نہ امید بہشت | چوں کافر درویشم و چوں قحبہ زشت

دین دنیا دونوں سے محروم ہونے کی اس سے اچھی کوئی تمثیل نہیں مل سکتی، کافر فقیر اور بدصورت قحبہ، یہ دونوں دین و دنیا کسی سے بہرہ یاب نہیں،

دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی دنیا کی بے ثباتی اور عبرت زا ہونا بزرگ پایہ شعرا کا سب سے بڑا موضوع ہے سعدی، حافظ ابن یمین، ناصر خسرو، سحابی نجفی کی تمام کائنات یہی ہے، اس مضمون کی ابتدا درحقیقت خیام نے کی اور اس درجہ تک اسکو پہنچا دیا کہ سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اُسی کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں، نصیحت سے قطع نظر خیام کے زور شاعری کا بھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، اس نے

سو سو دفعہ اس مضمون کو باندھا ہے. لیکن قوتِ تخیّل سے ہر دفعہ ایک نیا پیرایہ پیدا کر دیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور خنجر ہے جو دل پر چرکے لگا رہا ہے،

خاکے کہ بزیر پاے ہر حیوانے ست — زلفِ صنمی و عارضِ جانانے ست

ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانے ست — انگشت وزیرے و سر سلطانی ست

شیخ سعدی نے اس مضمون کے لئے فرضی حکایتیں لکھی ہیں، مثلاً کہتے ہیں،

شنیدم کہ یک بار در دجلہ — سخن گفت با عابدے کلۂ

کہ من فر فرماندہی داشتم — بہ سر بر کلاہِ مہی داشتم الخ

ایک اور شعر میں نہایت دردانگیز طریقہ سے اسکو ادا کیا ہے،

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک — بگوشِ آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردے آہستہ تر — کہ چشم و بنا گوش و روی است و سر

یعنی میں نے ایک دن مٹی کے ایک تودے پر پھاوڑا مارا، میرے کان میں یہ دردناک آواز آئی کہ میاں ذرا آہستہ، یہاں آنکھیں ہیں، کان ہیں، چہرہ ہے، سر ہے (انکو چوٹ نہ لگ جائے) لیکن سعدی کی یہ تمام نقش آرائیاں، خیام ہی کے مرقع کا عکس ہیں، ملاحظہ ہو،

دی کوزہ گرے بدیدم اندر بازار — بر تازہ گلے لکد ہمی زد بسیار

واں گل بزبانِ حال با او می گفت — من ہمچو تو بودہ ام مرا نیکو دار

سعدی کے شعر میں اگرچہ "آہستہ تر" اور اعضا کے مفرد ناموں نے ایک خاص اثر پیدا کیا ہے، لیکن طلبِ رحم کی علت خیام کے ہاں زیادہ قوی ہے، یعنی یہ کہ میں بھی تمہاری

ہی طرح تھا، اس لئے مجھ سے یہ سلوک نہ کرو اس سے بھی زیادہ موثر طریقہ میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

پیش از من و تو لیل و نہارے بودہ است | گردندۂ فلک بکارے بودہ است
زنہار قدم بخاک آہستہ بنہ | کیں مردمک چشم نگارے بودہ است

اسی مضمون کے اور پیرایے دیکھو،

ایں کہنہ رباط را کہ عالم نام است | آرامگہ ابلق صبح و شام است
بزمے است کہ وا ماندۂ صد جمشید است | قصرے است کہ تکیہ گاہ صد بہرام است

خوش باش کہ غصہ بیکراں خواہد بود | بر چرخ قران اختراں خواہد بود
خشتے کہ ز قالب تو خواہند زدن | ایوان و سرائے دیگراں خواہد بود

اے کوزہ گر آب نوش اگر ہشیاری | تا چند کنی بر گل آدم خواری
انگشت فریدون و کف کیخسرو | بر چرخ نہادۂ چہ می پنداری

یعنی اے کمہار کچھ جانتا ہے تونے چاک پر کیا چڑھا رکھا ہے، فریدوں کی انگلی اور کیخسرو کی ہتھیلی،

جامے است کہ عقل آفریں میزندش | صد بوسۂ مہر بر زمیں میزندش
ویں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف | می سازد و باز بر زمیں میزندش

بر سنگ زدم دوش سبوی کاشی[1] | سر خوش بودم کہ کردم ایں و باشی
با من بزبانِ حال می گفت سبو | من چوں تو بدم تو نیز چوں من باشی

---

[1] یعنی شہر کاشی کا بنا ہوا گھڑا،

این کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است | واندر طلب روئے نگارے بودہ است
این دست کہ بر گردنِ او می بینی | دستے است کہ در گردن یارے بودہ است

خمریات | جس طرح عربی زبان میں ابو نواس شراب کا جاندادہ ہے، فارسی میں خیام دورِ جام کا ستم زدہ ہے، وہ جس شغف، جس شوق، جس بیخودی، جس بے اختیاری جوش سے شراب کا نام لیتا ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے، کہ وہ درحقیقت شراب پیتا تھا، اور یہی ظاہری شراب پیتا تھا، افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا صوفی نہ تھا ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب شرابِ معرفت بنجاتی،

خیام کا آدھا کلام شراب ہی کے ذکر میں ہے، اکثر مضامین اور خیالات جو اُس نے شراب کے متعلق ظاہر کئے ہیں، خواجہ حافظ نے اُن ہی کو لیکر زیادہ شوخ کردیا ہے، تاہم کہیں کہیں جو بدمستی اور بیخودی اس کے کلام میں پائی جاتی ہے، خواجہ حافظ اب بھی اس حد تک نہیں پہنچے،

من بے مے ناب زیستن نتوانم | بے جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دمم کہ ساقی گوید | یک جام دگر بگیر و من نتوانم
مائیم خریدارِ مے کہنہ و نو | وانگاہ فروشندۂ عالم بدو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت | مے پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

اس سرمستی اور بے اعتنائی کو دیکھو، ایک شخص مذہبی خیالات میں ڈوبا ہوا قیامت کے حالات کا متجسس ہے، خیام کے پاس آتا ہے، اور نہایت تردد اور تفحص کے لہجہ میں

پوچھتا ہی کہ مرنے کے بعد کہاں جانا ہوگا؟ وہ کس بے تکلفی سے جواب دیتا ہے کہ میاں شراب لاکر میرے سامنے رکھدو اور جہاں جی چاہے جاؤ (مجھکو کیا غرض)

بایں ہمہ زیادہ تحقیق وتلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام اگر شراب پیتا بھی تھا، تو رندانہ نہیں بلکہ حکیمانہ پیتا تھا، اگرچہ شرعًا یہ بھی ممنوع اور حرام ہے، خیام کہتا ہے کہ شراب پینے میں ان باتوں کا لحاظ شرط ہے، کس کو پینی چاہیے؟ کتنی پینی چاہیے؟ کن لوگوں کی صحبت میں پینی چاہیے؟ ان شرطوں کا لحاظ رکھا جائے، تو ثابت ہوگا کہ عقلمند کے سوا اور کوئی شراب پی نہیں سکتا، اس لئے کہ عقلمند ہی ان شرائط کا لحاظ رکھ سکتا ہے،

مے گرچہ حرام است ولے تاکہ خورد — آنگاہ چہ مقدار؟ ودگر باکہ خورد؟
ہرگاہ کہ ایں چہار شرط آید جمع — پس مے نخورد مردم داناکہ خورد

پھر صاف صاف بتاتا ہی کہ کس طرح پینی چاہیے،

کم کم خورد وگہ گہ خورد وتنہا مے خورد

چوں ہشیارم، طرب زمن پنہان است — ورمست شوم، درخردم نقصان است
حالے است میانِ مستی وہشیاری — من بندۂ آنکہ زندگانی آں است

یعنی شراب کی نہ وہ حالت پسندیدہ ہے، جب انسان مست ہوجائے نہ یہ کہ مطلق اثر نہ پڑے مستی اور ہشیاری کے بیچ میں ایک حالت ہی، اور میں اسی کا غلام ہوں

چوں بادہ خوری زعقل بیگانہ مشو — مدہوش مباش، وجہل را خانہ مشو
خواہی کہ مے لعل حلالت باشد — آزار کسے مجوے ودیوانہ مشو

گر بادہ نمی خورم نشان خامی است	ور نیز مدام میخورم بدنامی است
مے شاہ و حکیم و رند باید کہ خورد	ور زیں سہ نہ، مخور کہ دشمن کامی است

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ شراب پینی گو اعتدال ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، ہر حال میں حرام ہے، اور جو شخص جواز کا فتویٰ دیتا ہے سخت اخلاقی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے؛ لیکن اگر تمھارے سامنے دو شخص آئیں، ایک نیک طینت، بے ریا، سچا، دیانت دار ہے لیکن شراب پیتا ہے، دوسرا شراب نہیں پیتا، نماز و روزہ بھی ادا کرتا ہے، لیکن رات دن تکفیر، بدگوئی اور غیبت میں مصروف رہتا ہے، وقف کے مال پر شرعی حیلوں سے تصرف کرتا ہے، احکامِ شرعیہ کو اپنی خواہش کے موافق ڈھالتا رہتا ہے تو تم ان دونوں میں سے کس کو پسند کروگے؟ غور کرو جو لوگ شراب نہیں پیتے وہ شراب سے زیادہ گناہ کس بیباکی سے کرتے ہیں، خیام ان لوگوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے،

تو فخر ہمی کنی کہ مے می نہ خوری	صد کار کنی کہ مے غلام است اورا

خواجہ حافظ نے اسی نکتہ کو نہایت بلیغ پیرایہ میں ادا کیا ہے،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد	کہ مے حرام ولے بہ ز مال اوقاف است

فلسفہ فلسفہ کیا چیز ہے؟ "حقائقِ اشیاء کا ادراک"، ہمارے گرد و پیش جو کچھ نظر آتا ہے اُن پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ چیزیں ہیں؟ کیونکر وجود میں آئیں، کس چیز سے حاصل ہوئیں؟ مفرد ہیں یا مرکب، ان کے ذاتیات کیا ہیں؟ خواص کیا ہیں؟ لوازم کیا ہیں؟ پھر ہم چند چیزوں کو ساتھ ساتھ یا آگے

پیچھے وجود میں آتا دیکھتے ہیں اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان میں کوئی باہم خاص تعلق ہے؟
یا اتفاقیہ ان کا ساتھ ہوگیا ہے؟ تعلق ہے تو کس قسم کا ہے؟ کیا نوعیت ہے؟ کیوں ہے؟
غرض یہ اور اس قسم کے جتنے سوالات ہیں فلسفہ کا مایہ خمیر ہیں، اور ان کا جواب دینا فلسفہ
کا فرض ہے لیکن ان سب سوالوں سے مقدم یہ سوال ہے کہ کیا ہم اشیار کی حقیقت
کو جان سکتے ہیں، ؟ عموماً تمام حکما اس کا جواب اثبات کی صورت میں دیتے ہیں لیکن
ہر زمانہ میں ایسے حکما بھی ہوتے آئے ہیں، اور اب بھی ہیں، جن کی رائے ہے کہ کسی
چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی، ہربرٹ اسپنسر نے تمام اشیار کی دو قسمیں کی ہیں،
وہ چیزیں جو فوق الادراک ہیں، اور انسان کے دائرۂ علم میں نہیں آسکتیں،
وہ چیزیں جو تحت ادراک ہیں پہلی قسم پر اُس نے ایک خاص رسالہ لکھا ہے، اور بتادیا ہے
کہ ان کے متعلق کسی قسم کی تحقیقات کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، شاپن ہور جرمن کا
فلسفی، سرے سے انکار کرتا ہے، یعنی کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی، خیام کا
بھی یہی مذہب ہے، غور کرو، اور خوب غور کرو، جن چیزوں کی نسبت ہمکو یقین ہے کہ ہم
جانتے ہیں، ان کو بھی ہم کیا جانتے ہیں، سب سے زیادہ محسوس، بدیہی، اور نمایاں مادہ یا
جسم ہے لیکن غور سے دیکھو، مادہ کو ہم کس حد تک جانتے ہیں، ہم مادہ کے چند خواص
جانتے ہیں ہم جانتے ہیں، کہ مادہ تحلیل ہوتے ہوتے، ایسے چھوٹے چھوٹے اجزا تک
منتہی ہوتا ہے، جو پھر تحلیل نہیں ہوسکتے، اور ان کو اجزاے دیمقراطیسی کہتے ہیں ان
اجزا میں حرکت، وزن، کشش اتصالی، کشش ثقل اور چند خواص پائے جاتے

ہیں لیکن یہ اجزا کے خواص اور اعراض ہیں انکی اصلی حقیقت کیا ہے؟ کیونکر وجود میں آئے
کہاں سے آئے؟ یہ چیزیں بالکل غیر معلوم ہیں، اس سے بھی زیادہ صاف مثال ہیں
سمجھو، ہم نے ایک سیب ہاتھ میں لیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اسکو جانتے ہیں، اور بداہتہً
جانتے ہیں، لیکن غور کرو، ہم کیا جانتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص مقدار رکھتا
ہے، اس میں خوشبو ہے، رنگ ہے، مزہ ہے، لیکن ساخت، خوشبو، رنگ، مزہ یہ سب
تو اوصاف ہیں جن کو قدیم فلسفہ کی زبان میں عرض کہتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز جوہر
قائم بالذات نہیں، حالانکہ سیب قائم بالذات چیز ہے، اسلئے ہمکو سیب کی اصلی
حقیقت کچھ بھی نہیں معلوم ہوئی،

علت و معلول کا سلسلہ جو ہم کسی چیز میں قائم کرتے ہیں، جس قدر تحقیقات بڑھتی
جاتی ہے، یہ سلسلہ ناقابلِ اعتبار ثابت ہوتا جاتا ہے، اور پھر اصلی علۃ کا پتہ نہیں لگتا، اوپر
سے جو چیز گرتی ہے، زمین پر آتی ہے، یونانی حکمار کی حقیقت کے مطابق اسکی وجہ
یہ تھی کہ ان چیزوں کا مرکز زمین ہے، اور ہر چیز مرکز کی طرف کھنچتی ہے لیکن نیوٹن
نے اسکی غلطی ثابت کی، اور بتایا کہ تمام اجسام میں جذب کی خاصیت ہے، اور چونکہ
زمین بڑا جسم ہے، اسلئے وہ اپنے سے چھوٹے تمام اجسام کو اپنی طرف جذب کرتا ہے
لیکن اس سے اصل مسئلہ کیا حل ہوا، اس قدر بے شبہہ معلوم ہوا کہ اوپر سے گرنے
کی علت تجاذب اجسام ہے، لیکن تجاذبِ اجسام کی کیا علت ہے، یعنی اجسام میں
جذب کی خاصیت کیوں ہے؟ یہ مسئلہ اب بھی اسی طرح لاینحل ہے، غرض اسی طرح دنیا کی

باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اوپر چل کر، پھر وہی لاعلمی پیش آتی ہے، ایک راز کھلتا ہے تو دوسرا راز پیدا ہوتا ہے، ایک گرہ کھلتی ہی، تو دوسری گرہیں پڑجاتی ہیں،

فلسفی سرِ حقیقت نتوانست کشود — گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا میکرد

اسی بنا پر دقیق النظر حکما کا یہی مذہب ہے، کہ ہمکو کچھ معلوم نہیں، سقراط نے تمام عمر کی تحقیقات کے بعد یہی کہا، "معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" خیام کا بھی یہی مذہب ہی، خیام نے اس رائے کو نہایت صراحت اور نہایت کثرت سے بیان کیا ہی،

کس مشکل اسرار فلک را نکشاد — کس یک قدم از نہاد بیروں ننہاد
چوں بنگرم از مبتدی تا استاد — عجز است بدست ہرکہ از مادر زاد

آنہا کہ محیط فضل و آداب شدند — در کشفِ دقیقہ شمعِ اصحاب شدند
رہ زیں شب تاریک نبردند بروں — گفتند فسانۂ و در خواب شدند

آنہاکہ جہاں زیر قدم فرسودند — واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند
آگاہ نمی شوم کہ ایشاں ہرگز — زیں حال چناں کہ ہست آگہ بودند

جمعے متفکر اند در مذہب و دیں — جمعے متحیر اند در شک و یقین
ناگاہ منادیے برآید زکمیں — کاے بیخبراں راہ نہ آنست و نہ ایں

افسوس کہ سرمایہ زکف بیروں شد — در دستِ اجل بسے جگرہا خوں شد
کس نامد ازاں جہاں کہ تا پرسم ازو — کاحوال مسافران عالم چوں شد

ہرچند کہ رنگ و بوی زیباست مرا — چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا

معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک | نقاش من از بہر چہ آراست مرا

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد | وز سرّ خدا ہیچ کس آگاہ نہ شد

ہر کس ز قیاس خویش چیزے گفتند | معلوم نہ گشت وقصہ کوتاہ نہ شد

دل سرّ حیات را کماہی دانست | در موت ہم اسرار الٰہی دانست

امروز کہ با خودی ندانستی ہیچ | فردا کہ ز خود روی چہ خواہی دانست

تمکو خیال ہوگا کہ اگر لاعلمی ہی خیام کا فلسفہ ہے، تو جتنے جاہل ہیں، سب فلسفی ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، سقراط سے لوگوں نے کہا کہ جب تم بھی کچھ نہیں جانتے اور ہم بھی نہیں جانتے تو ہم میں تم میں کیا فرق ہے، اس نے کہا صرف یہ کہ میں یہ جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا اور تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم نہیں جانتے،

علم عموماً دو قسم کا ہوتا ہے، عالمانہ اور جاہلانہ، زمین، آفتاب، ماہتاب، ان سب چیزوں کو ایک گنوار بھی جانتا ہے، لیکن جاہلانہ جانتا ہے، ایک کسان بھی جانتا ہے، کہ ایک زمین میں ایک وقت دو اناج پیدا نہیں ہو سکتے، اسی کو علم نباتات کا ایک عالم بھی جانتا ہے، لیکن دونوں کے جاننے میں کس قدر فرق ہے، لاعلمی کا بھی یہی حال ہے، ایک فلسفی بھی جانتا ہے، کہ وہ خدا کی حقیقت کو نہیں جان سکتا، ایک جاہل بھی اس کا اقرار کرتا ہے، لیکن دونوں میں کس قدر فرق ہے،

خیام کو اس لاعلمی پر ناز ہے، اور کہتا ہے کہ ہر شخص اس لاعلمی کے رتبہ تک نہیں پہنچ سکتا،

تو بے خبری بے خبری کار تو نیست | ہر بے خبرے را نہ رسد بے خبری

اسی کو ایک اور شاعر نے شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے،

تا بجاے رسیدہ دانش من | کہ بدانم ہمے کہ نادانم،

یعنی میرا علم اب اس درجہ پہنچ گیا ہی، کہ یہ جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا،

ایک اور موقع پر خیام کس ادعا سے کہتا ہے،

رندے دیدم نشستہ بر رنگ زمیں | نہ کفر نہ اسلام نہ دنیا و نہ دیں

نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں | اندر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

لاعلمی کا فلسفہ صحیح ہو یا نہ ہو، لیکن دیکھو اس کا اثر کیا ہی،

ہر قسم کی تحقیقات، انکشافات، جدید اطلاعات کا سرچشمہ، یہی لاعلمی کا فلسفہ ہی، اگر ہمکو یقین ہو جائے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں، یا جس چیز کو جانتے ہیں، اسکی تہ تک پہنچ گئے ہیں، تو علمی تجسس کے لئے کیا رہجاتا ہے، ؟ آیندہ ہمکو کیوں تلاش ہو گی، ہم کیوں جد و جہد میں مصروف ہونگے ؟ لاعلمی کا فلسفہ ہمارا شمع راہ ہے، وہ ہمکو قدم بقدم آگے بڑھاتا ہے، ہم جس قدر جانتے جاتے ہیں، اسکو نہ جاننا کہتے ہیں، اور آگے بڑھتے ہیں، خیام گو یہ فلسفہ سکھاتا ہے کہ تمکو کچھ معلوم نہیں، لیکن معلوم کرنے کی خواہش کی ترغیب دلاتا ہے،

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت | زمن خبرت کہ بے نوا خواہی رفت،

بنگر چہ کسی ؟ واز کجا آمدۂ ؟ | می داں کہ چہ میکنی ؟ کجا خواہی رفت

تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ کہاں جاؤگے؟ خیام ان سوالوں کی تحقیقات کرنے کی تلقین کرتا ہے، ان سے بڑھکر فلسفہ کے اور کیا مسائل ہو سکتے ہیں، ایک اور نکتہ نہایت غور کے قابل ہے، اسلامی بے شمار فرقوں کو دیکھو انکے باہمی مسائل مختلفہ کیا ہیں؟ خدا فاعل بالایجاد ہے، یا بالارادہ؟ خدا کے صفات عین ذات ہیں یا خارج؟ قدیم ہیں یا حادث؟ خدا کا کلام نفسی ہے یا لفظی؟ یہ مسائل کس قدر فوق الادراک ہیں، جب خدا کی حقیقت ہی معلوم نہیں تو یہ کیا معلوم کہ اس کے اوصاف کیا ہیں، بایں ہمہ ہر فرقہ کو قطعی یقین ہے کہ اسکو جو کچھ معلوم ہی قطعی ہے، اور اس قدر قطعی ہے، کہ جو شخص اس کے خلاف کہتا ہی وہ گمراہ ہے، جاہل ہے، کور باطن ہے، مرتد ہے، کافر ہے، ملعون ہے، معتزلہ، قدریہ، اشعریہ، حنابلہ، شیعہ، سنی، سب ایک دوسرے کو کافر اور گمراہ کہتے ہیں، یہانتک کہ جنگ وجدل تک نوبت پہنچتی ہے اور بغداد کے گلی کوچے مسلمانوں کے خون سے رنگین نظر آتے ہیں،

اگر ان بزرگوں کا خیام کے فلسفہ پر عمل ہوتا، یعنی یہ کہ یہ مسائل فوق الادراک ہیں، ہم جس قدر جانتے ہیں، نہ جاننے کے برابر ہے، مذہبی حیثیت سے ہمارا اسی قدر فرض ہے کہ اجمالی ایمان لائیں یعنی یہ کہ خدا ہے، جانتا ہی، دیکھتا ہی، سنتا ہی، بولتا ہے، باقی یہ تدقیقات کہ ان اوصاف کی حقیقت کیا ہی، اسکی ہمکو شارع نے تکلیف نہیں دی، تو آج بارہ سو برس سے مسلمانوں کے فرقوں میں جو نزاعیں

جنگ وجدل، معرکہ آرائیاں، اور خونریزیاں ہوتی رہیں کیوں ہوتیں،

ہاتف شیرازنے کیا خوب کہا ہے،

بیا کایں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم ۔۔۔ کے از کفر می لافند و گر طامات می بافند

جبر — یعنی انسان کا مجبور ہونا، جبر ایک نہایت دقیق مسئلہ ہے اور گو بظاہر غلط معلوم ہوتا ہے، لیکن اس سے کوئی مفر نہیں، قدریہ کا تمامتر زور استدلال ارادہ پر ہی یعنی یہ کہ انسان کا ارادہ اُس کے اختیار میں ہے، اس لئے انسان مختار ہے لیکن زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ارادہ بھی اسکی اختیاری چیز نہیں، ارادہ کے حبب تمام اسباب جمع ہوجائیں گے، ارادہ خواہ مخواہ پیدا ہوگا، اسکا روکنا یا نہ پیدا ہونے دینا انسان کے اختیار میں نہیں،

عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ جبر کے نام سے بھاگتے ہیں، اور جبریہ کو کافر بتاتے ہیں خود جبریہ ہیں لیکن منہ سے اقرار نہیں کرتے، اشاعرہ جبر کے قائل نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ "انسان کو اپنے افعال پر قدرت ہے" لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں، کہ "یہ قدرت مطلقاً کچھ اثر نہیں رکھتی"، تو پھر ایسی قدرت سے کیا فائدہ؟ اسی بنا پر مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ "اشاعرہ کا کسب، اور جبریہ کا جبر دونوں توام بھائی ہیں"، بہرحال ہم اس بحث کا فیصلہ نہیں کرتے جبر صحیح ہو یا غلط خیام جبر کا قائل اور معتقد تھا

ایزد چو نہ خواست آنچہ من خواستہ ام ۔۔۔ کے گردد راست آنچہ من خواستہ ایم

گر ہست صواب آنچہ او خواستہ است ۔۔۔ پس جملہ خطا است آنچہ من خواستہ ام

نقشے است کہ بر وجود ما ریختہ
صد بوالعجبی ز ما بر انگیختہ
من زاں بہ ازیں نمی توانم بودن
کز بوتہ چنیں مرا فرو ریختہ

از آب و گلم سرشتہ من چہ کنم
ویں پشم قصب تو رشتہ من چہ کنم
ہر نیک و بدی کہ از من آید بوجود
تو بر سر من نوشتہ من چہ کنم

سازندۂ کار مردہ و زندہ توئی
دارندۂ ایں چرخ پراگندہ توئی
من گرچہ بدم صاحب ایں بندہ توئی
کس را چہ گنہ چو آفرینندہ توئی

انہی خیالات کو خواجہ حافظ نے عجیب عجیب پیرایوں میں ادا کیا ہے،

برو اے زاہد و دعوت نکنم سوے بہشت
کہ خدا در ازل از بہر بہشتم نہ سرشت

فلسفۂ زندگی

خیام کا فلسفۂ زندگی بظاہر اپیکورس کی آواز بازگشت ہے، یعنی یہ کہ گزشتہ اور آیندہ سے کچھ بحث نہیں، جو کچھ ہے حال ہے، اس میں کھاؤ پیو خوش رہو، وگرنہ ہیچ مصرعہ "چنیں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند"

در وقت بہار اگر بتے حور سرشت
پر مے قدحے دہد، مرا بر لب کشت
گرچہ بر ہر کس ایں سخن باشد زشت
سگ بہ ز من ار دگر برم نام بہشت

یک شیشہ شراب و لب یار و لب کشت
ایں جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومے بہ بہشت و دوزخ اندر گروند
کہ رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

روزے کہ گذشتہ است ازو یاد مکن
فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد مکن
حالے خوش باش و عمر بر باد مکن

از درسِ علوم جملہ بگریزی بہ	واندر سرِ زلفِ دلبر آویزی بہ
زاں پیش کہ روزگار خونت ریزد	تو خونِ پیالہ در قدح ریزی بہ
زاں پیش کہ بر سرت شبیخوں آرند	فرمائی کہ تا بادۂ گلگوں آرند
تو زر نہ اے غافلِ ناداں کہ ترا	در بوتہ نہند و باز بیروں آرند
ایں عقل کہ در راہ سعادت پوید	روزے صد بار خود ترا می گوید
دریاب تو ایں یکدمہ فرصت کہ نۂ	آں ترہ کہ بدروی و آخر روید
دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت	در پردۂ اسرارِ فنا خواہی رفت
مے نوش ندانی از کجا آمدۂ	خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت
مائیم خریدارِ مے کہنہ و نو،	وانگاہ فروشندۂ عالم بدوجو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہی رفت	مے پیشِ من آر و ہر کجا خواہی رو

یہ فلسفہ کہ انسان نیکی بدی کا کچھ خیال نہ رکھے، جو جی میں آئے کرے، مزے اڑائے، بظاہر نہایت خطرناک ہے، لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہو سکتی اُس نے بہت سی رباعیوں میں معاد اور جزا و سزا کا اقرار کیا ہے، اور نکوکاری اور بُرائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے،

ایشیائی سلطنتوں میں، جاہ و مال کے حاصل کرنے میں جن ذلیل، کمینہ، ناجائز اور ناپاک ذریعوں سے کام لینا پڑتا ہے، اس کا اندازہ ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا، کم سے کم اسکے لئے کسی ہندوستانی ریاست کا سفر اختیار کرنا چاہیئے، خیام کے سامنے زندگی

کا جو نمونہ موجود تھا، وہ یہی تھا کہ ارباب دینارات دن جوڑ توڑ، سازش، حیلہ انگیزی، نفاق خوشامد تگ و دو اور ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، پھر ان سب مصیبتوں سے جو چیز حاصل کرتے تھے، وہ کس قدر ناقابلِ اعتبار اور سریع الزوال ہوتی تھی، آج ایک شخص وزیر اعظم ہے، کل دربدر مارا پھرتا ہے، کل تک ایک شخص تاج و تخت کا مالک تھا، آج مسجد کے دروازہ پر گداگری کر رہا ہے، برامکہ نے ابھی تمام عالم کو چھا لیا ہے ابھی خاندان کا خاندان برباد ہو کر نام و نشان تک مٹ گیا، ابو الفضل کل تک ندیم خاص تھا، آج دربار میں اس کا سر کٹ کر آ رہا ہے،

ان حالات کو دیکھ کر بے شبہہ ایک فلسفی گھبرا اُٹھے گا اور کہے گا کہ دنیا ناقابلِ اعتبار ہے، جاہ و منصب کوئی چیز نہیں، خود زندگی کس قدر ہیچ ہے، فریدوں کی خاک سے کمہار کے برتن بنتے ہیں، جمشید کا کالبد، خشت سازی کے کام میں آتا ہے، اسلئے تگ و دو اور تردد و فکر بیکار ہے، تھوڑی سی زندگی ہے، اسکو قناعت، خاموشی، سکون اور اطمینان کے ساتھ گذار دو، کھاؤ، پیو، خوش رہو اور خوشی خوشی دنیا سے چلے جاؤ،

خیام اس بات سے واقف ہے کہ اس قسم کے قانع شخص کو عام لوگ ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس پر تعجب کرتا ہے،

ایں جمع اکابر کہ مناصب دارند	از غصہ و غم زجانِ خود بیزارند
وانکس کہ اسیر حرص چوں ایشاں نیست	ایں طرفہ کہ آدمیش می نہ شمارند

نہایت خوبی سے وہ قناعت اور آزادی کی تعلیم کرتا ہے،

چوں رزق تو انچہ عدل قسمت فرمو | یک ذرہ نہ کم شود نہ خواہد افزود
آسودہ زہر چہ نیست می باید شد | وآزادہ زہر چہ ہست می باید بود

خواہی کہ ترا تربیت اسرار رسد | مپسند کہ کس راز تو آزار رسد
از مرگ میندیش و غم رزق مخور | کیں ہر دو بوقتِ خویش ناچار رسد

خیام جس زندگی کو قابلِ رشک سمجھتا ہے، وہ یہ ہے،

در دو مرہر آنکہ نیم نانے دارد | وز بہرِ نشست آستانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے | گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

ابن یمین نے اس زندگی کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے،

دو تاے نان اگر از گندم ست یا از جو | دو تاے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو
بہ چار گوشۂ دیوار خود، بخاطر جمع | کہ کس نگوید از ینجا بخیز و آں جا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمین | ز فر مملکتِ کیقباد و کیخسرو

اخلاقی تعلیم | خیام کا فلسفۂ اخلاق نہایت مختصر ہے، لیکن جس قدر ہے، اس مختصر سی دنیا کے لئے کافی ہے،

غیبت مکن و دل کساں را آزار | در عہدۂ آں جہاں منم، بادہ بیار

بدخواہ کساں ہیچ بہ مقصد نرسد | یک بد نہ کند تا بہ خودش صد نہ رسد
من نیک تو خواہم و تو خواہی بد من | تو نیک نہ بینی و بہ من بد نرسد

گر شادی ازاں خویشتن میدانی | کاسودہ دلے را بہ غمی بنشانی

درماتم عقل خویش بنشیں ہمہ عمر پندار مصیبت کہ عجب نادانی

اے آنکہ خلاصۂ چہار ارکانی بشنو سخنے ز عالمِ روحانی

دیوی و دَدِی و مَلَکَ انسانی باتست، ہرانچہ می نمائی آنی

یعنی تم شیطان، درندہ، فرشتہ، انسان، سب کچھ ہو سکتے ہو، اب جو چاہو، ہو جاؤ، تم کہوگے کہ یہ ایسی کیا اچھوتی تعلیم ہے، سب اہلِ مذہب، اسی کی تعلیم دیتے ہیں، ہاں یہ سچ ہے لیکن اہلِ مذہب نے اپنی فیاضی کا دائرہ محدود کر دیا ہے، اُن کے نزدیک نیکی، احسان، بھلائی، ہمدردی، غمخواری، ان تمام اوصاف کا محل صرف اپنے ہم مذہب ہیں، لیکن خیام کے نزدیک آفتاب کی روشنی دشت وچمن، دونوں پر یکساں پڑتی ہے،

خیام کی اخلاقی تعلیم میں ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے، اور اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی، سعدی اور حافظ ریاکار زاہدوں اور پیشواؤں کی دھجیاں اڑانے میں نہایت نامور ہیں اور نہایت عجیب عجیب نادر پیرایوں میں ان لوگوں کے پترے کھولتے ہیں، لیکن خیام نے ایک رباعی میں اس مضمون کا خاتمہ کر دیا ہے،

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی بنگر ز کہ بگسستی وچوں پیوستی

زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم تو نیز چنانکہ مے نمائی ہستی

یعنی ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بدمست ہے، تو خیال نہیں کرتی،

کہ تو نے کس چیز کو چھوڑا اور کس چیز کو اختیار کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ میں تو جیسا اپنے آپ کو ظاہر میں دکھلاتی ہوں ویسی ہی ہوں بھی، کیا آپ بھی اپنے آپ کو جیسا دکھلاتے ہیں ایسے ہی حقیقت میں بھی ہیں،

ظاہر و باطن کے یکساں نہونے کی برائی کا پیرایہ اس سے زیادہ اچھوتا، نادر اور موثر و عبرت خیز نہیں ہوسکتا تھا، خیام نے اس بات پر بھی خوب غور کیا تھا، کہ کن کن اسباب سے انسان کو خواہ مخواہ ہی ریا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے، اسلئے وہ ان موقعوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے،

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند   با خلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند

در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا   در پیش نہ خوانند و امامت نہ کنند

یعنی رستہ اسطرح چلو کہ کوئی تم کو سلام نہ کرے، لوگوں کے ساتھ اس طرح بسر کرو کہ لوگ تمھاری تعظیم کے لئے قیام نہ کریں، مسجد میں جاؤ تو اس طرح کہ لوگ تم سے امام بننے کی خواہش ظاہر نہ کریں، مطلب یہ کہ ایسی سادگی، بے تکلفی، خاموشی سے زندگی بسر کرو کہ لوگ تم کو مقدس نہ خیال کریں، یہ ظاہر ہے کہ انسان جب لوگوں کی نظر میں مقدس ہو جاتا ہے تو اسکو سینکڑوں باتیں ایسی کرنی پڑتی ہیں جن سے اس کا تقدس قائم رہے حالانکہ وہ باتیں بہ تکلف کرتا ہے، اگر اس منصب پر وہ نہ پہنچتا تو اس خودداری اور حفظ مراتب کی اسکو کیا ضرورت تھی،

خیام کا فلسفۂ اخلاق زہاد اور علماء کے فلسفۂ اخلاق سے نہایت بلند ہی، یہ مقدس

گروہ کسی کام کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر عذاب یا ثواب ہوگا، ان لوگوں کو اگر اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اس فعل پر عذاب نہیں ہوگا، یا خدا اوس کو بخش دیگا، تو پھر ان کو کچھ پروانہ ہوگی، خیام کسی کام کے کرنے کے وقت صرف یہ دیکھتا ہی کہ خود یہ کام کیسا ہے، اگر وہ کام برا ہے تو اس سے اسکو کچھ تسلّی نہیں ہوتی، کہ خدا اسکو بخش دے گا، اس کے نزدیک یہی بڑا عذاب ہے کہ خدا دیکھ رہا تھا، اور اس نے جرم کا ارتکاب کیا،

با نفس ہمیشہ در نبردم چہ کنم ‫ —‬ وز کردۂ خویشتن بہ دردم چہ کنم
گیرم کہ ز من درگذرانی بہ کرم ‫ —‬ زیں شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یعنی اے خدا! میں نے مان لیا کہ تو میرا گناہ معاف کر دیگا، اور عذاب نہ دیگا، لیکن کے یہ کیا کم عذاب ہی کہ تیری نظر کے سامنے میں نے ایسا فعل کیا،

فقہا کی نسبت خیام کی رائے

خیام کے فلسفہ، اخلاقی تعلیم اور آزادی خیال کا نمونہ تم نے دیکھا، ایسا شخص فقہا کی نسبت جو رائے رکھ سکتا ہے، تم خود سمجھ سکتے ہو، وہ کہتا ہی اور کس قدر سچ کہتا ہے

با ایں دو سہ ناداں کہ چناں میدانی ‫ —‬ از جہل کہ دانائے جہاں ایشانند
خوش باش کہ از خری ایشاں بہ مثل ‫ —‬ ہر کو نہ خراست کافرش می دانند

غور کرو، امام غزالی، امام رازی، محی الدین عربی، شیخ الاشراق، ان میں سے ہر شخص فقہا کی تکفیر کا زخم خوردہ ہے، کیوں؟ صرف اسلئے کہ یہ لوگ فقہا کے سے عامیانہ اور لغو عقائد اور خیالات نہیں رکھتے تھے، اسی نکتہ کو خیام اس تلخ جملہ میں ادا کرتا ہی، کہ جو شخص

ان تکفیر کرنے والوں کی طرح سے گدھا نہیں ہو اسکو یہ لوگ کافر کہتے ہیں،

خیام نے گو شاعری کے پردہ میں دل کے پھپولے توڑے، لیکن افسوس ہے، کہ فقہا کی سخت گیری کی وجہ سے وہ بھی اسرار اور حقائق کے ظاہر کرنے کی جرات نہ کر سکا، چنانچہ خود کہتا ہے،

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست — گفتن نہ تواں کہ آن وبالِ سر ماست

چوں نیست دریں مردم دنیا اہلے — نتواں گفتن ہر آنچہ در خاطر ماست

افسوس! ظاہر پرستوں کی گیر و دار نے خدا جانے کتنے عجیب و غریب اسرار اور حقائق دلوں ہی میں دفن کرا دیے، آج آزادی کا زمانہ ہو لیکن اب وہ حقائق اور اسرار کہاں، بازاری اور عامیانہ باتیں زبان پر آئیں تو اس سے کیا حاصل!!!

آنچہ در کار ست نتوانی تو گفت — آنچہ می گوئی تو خود در کار نیست

خیام اور یورپ یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدر دانی، ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی، اور کرنی چاہیے تھی، خیام کے خیالات، یورپ سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ آج اگر موجود ہوتا تو شاید یورپین بنجاتا،

عمر خیام کی نسبت ۱۸۹۶ء تک جو کچھ یورپ میں لکھا گیا وہ وصایا وغیرہ نہایت محدود ماخذوں سے تھا، مگر پروفیسر ژکوسکی (ZHUKOOSKI) کے قابلِ یادگار مضمون نے خیالات میں تغیر عظیم برپا کر دیا اور اب پروفیسر راس، ہیرن ایلن (HERONALLEN) وغیرہ نے انگریزی میں عمدہ ترجمے اور تذکرے شائع کئے، ان سے پہلے انگلستان میں

فنز جیرلڈ (Fitzgerald) کے مشہور ترجمہ کے علاوہ میکارتھی (Mecorthy) نے بڑے اہتمام کے ساتھ چھاپا تھا مگر گارنر (Gorner) کا ترجمہ عالمانہ اور مطلب خیز تھا، ون فیلڈ (Whinpield) نے ۱۸۸۳ء میں دو کتابیں ایک میں صرف ترجمۂ رباعیات اور دوسری میں رباعیاں اور ان کے مقابل میں ترجمہ شائع کیں، نکلسن فرانسیسی (Nicholasan) نے فنز جیرلڈ سے ایک سال بعد فرنچ میں ایک ترجمہ شائع کیا تھا، باڈن اسٹیڈ (Bodenstedt) نے جرمن میں ایک ترجمہ چھاپا ہی، اور چند رباعیوں کا ترجمہ ہالینڈ کی زبان میں بھی ہوگیا ہی،

پروفیسر لکھتے ہیں کہ اگر وہ تمام کتابیں اور رسالے جمع کئے جائیں، جنمیں عمر خیام کا ترجمہ یا حال شائع ہوا ہے تو درحقیقت ہماری زندگی میں یہ کام پورا نہیں ہوسکتا' آکسفورڈ میں ایک نہایت قدیم نسخہ ہے، اسکو ہیرن ایلن نے عکس میں چھاپا ہے، ایک عمدہ نسخہ پیرس میں ہے، مگر آکسفورڈ والے سے پرانا نہیں،

انوری

محمد نام، اوحد الدین لقب، انوری تخلص، ابیورد کے علاقہ میں بدہنہ ایک گاؤں ہے جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہوا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عرفی کہتا ہے ع "انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز۔ اس علاقہ کو خاوران بھی کہتے ہیں، اس مناسبت سے انوری نے پہلے اپنا تخلص خاوری رکھا تھا پھر اپنے استاد عمارہ کی فرمائش سے بدل کر انوری کر دیا،

انوری نے علوم وفنون کی تحصیل طوس کے مدرسہ منصوریہ میں کی، اور تمام درسی علوم وفنون حاصل کئے، ریاضی میں خصوصیت کے ساتھ کمال پیدا کیا، دولت شاہ کا بیان ہے کہ انوری ایک دن مدرسہ کے دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ سامنے سے ایک شخص بڑے جاہ وتجمل سے گذرا، انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ پایۂ تخت کا شاعر ہے، انوری نے اسی وقت تعلیم وتعلم کو خیرباد کہا، اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے،

گر دل بحر دوست کاں باشد — دلِ دوست خدائگاں باشد

صبح کو دربار میں جا کر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سخن شناس تھا، بہت محظوظ ہوا، کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی،

جز آستان توام در جہاں پناہے نیست　　سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر رادکان سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھکر پیش کئے جن میں سے ایک یہ ہے،

باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را　　ویں حال کہ نو گشت زمین اور زماں را

ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں، اس کو کبھی اٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدہ میں کہتا ہے،

خسروا! بندہ را چو دہ سال است　　کہ ہمی آرزوے آں باشد

کز ندیمان مجلس ار نہ شود　　از مقیمانِ آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتدائی نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے، انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اسکی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار تک رسائی حاصل نہیں ہوئی تھی جسکی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا، اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا، اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں قصیدہ یاد کر لیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا تھا، قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدہ کا قصیدہ خود پڑھکر سنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا، انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن، پاگلوں

کی صورت بناکر معزی کے پاس گیا، اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھکر لایا ہوں، آپ پیش کرا دیجئے، معزی نے کہا کیا لکھا ہے، پڑھکر سناؤ، انوری نے پڑھا،

زہے شاہ وزہے شاہ وزہے شاہ | زہے میر وزہے میر وزہے میر

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہوجاتا،

زہے شاہ وزہے شاہ وزہے شاہ | زہے ماہ وزہے ماہ وزہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے کہا کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لیکر دربار میں گیا، اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے، سناؤ، انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا،

گر دل و دست بحر وکاں باشد | دل و دست خدائیگاں باشد

شاہ سنجر کہ کمتریں خدمش | در جہاں بادشاہ نشاں باشد

دو شعر پڑھ کر رک گیا، اور معزی کی طرف خطاب کرکے کہا کہ یہ قصیدہ آپ کا ہے، تو باقی اشعار سنائیے، معزی چپ رہا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا، سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمانِ خاص میں داخل کیا[1]، رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال، دو دفعہ انوری کے مکان پر جاکر اسکی عزت افزائی کی[2]،

انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہدِ حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیارہ برج

---

[1] یہ پوری تفصیل تاریخ حبیب السیر میں ہے[2] خزانۂ عامرہ،

میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بنا پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئیگا کہ تمام مکانات برباد ہوجائیں گے، لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرد آب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر اُن میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا، سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے، فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا،

گفت انوری کہ از جہت بادہائے سخت	ویراں شود عمارت وکہ نیز بر سری
در سال حکم او نہ وزید است ہیچ باد	یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترکِ ملازمت کرکے نیشاپور چلا آیا، اب اسکی شہرت دور دور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امرا اور وسار کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجئے، ۵۲۳ھ میں سلطان احمد پیروز شاہ نے اس کو خط بھیجکر بلایا اور ساتھ لیکر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سنکر کہ دریاے جیحوں راہ میں پڑتا ہے، اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچکر سلطان احمد سے معذرت چاہی، اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا، مطلب کی بات اس طرح ادا کی،

ایں حال[1] کہ در بلخ کنوں دارم	از خوفِ پریشانی و گمراہی
زیں بیش اگر وہم وگماں بردے	آں مخلصے کو نہ منظرِ شاہی

[1] اس قصیدہ کی شرح میں ابو الحسن فراہانی نے اس قصیدہ کا شانِ نزول یہی لکھا ہے،

بر عبرهٔ جیحوں نہ بہ آموزش | چوں بط بہ طبیعت شدمی راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لیکر آئے، انوری روانہ ہوا، لیکن دریاے جیحوں کے کنارے پہنچکر اس کے اوسان جاتے رہے، رہبر جو ساتھ تھا، ڈھارس دلانے کے لئے لنگ باندھکر دریا میں اترا، تیرتا ہوا ورتک گیا اور چاروں طرف چکر لگا کر دکھلایا کہ گھبرانے کی بات نہیں، انوری بہ ہزار خرابی کشتی میں بیٹھا گھاٹ پر شاہی اہتمام تھا، اور اسپ خاصہ سواری کے لئے آیا تھا، انوری نے آداب شاہی کے لحاظ سے گھوڑے پر سوار ہونے میں تامل کیا، لیکن پیش خدمت کے اصرار سے سوار ہوا، اور دربار میں آیا، قصیدہ راہ میں لکھ رکھا تھا، دربار میں پہنچکر پڑھا، دیکھو تمام واقعات کو کس خوبی سے ادا کیا ہی

حبذا بخت مساعد کہ سوے حضرت شاہ | مرومی کرد و رہم داد پس از چندیں گاہ،

اندر آمد ز در حجرۂ من صبحدمے | روز بہمن جبنہ یعنی دوم بہمن ماہ

سال بر پانصد وسی وسہ تاریخ عجم | گفت برخیز کہ از شہر بدر شد ہمراہ

چہ روے راہ تردد وقضی الامر فقمتم | چہ کشتی نقش تخیل "بلغ السیل زباہ"،

چوں بر انگیخت مرارفت وچراغ افروخت | بے تحاشی چو فیقی کہ بود از اشباہ

تا کہ من جامہ بپوشیدم وبیروں رفتم | بہ شتابے کہ دوائم نہ رہی کرد ونہ راہ

او بروں بردبدم فرش وآورد دستور | محملے بست مرا کرد چو شاہے برگاہ،

ہمچناں جملہ راہم بسلامت می برد | نہ دراں طبع ملالت نہ دریں طوع اکراہ

تا به حدے که مرا داد ہمے مینخ وکفش
تا بجاے که ہمی داد خرم را جو وکاه

چوں به جیحوں برسیدیم زمن ہوش برفت
گفت لاحول ولا قوت الا بالله

رفت وبربست ازارے وبه جیحوں در جست
وندراں جست به یکدم بگذشت او بشناه

باز باز آمد وگفتا که بدیدی سهل است
در نشیں خیز ومکن وقت گزشتن بیگاه

کشتی آورد ونشستیم درو ہر دو بہم
چوں دو یار او ہمه یاری ذمن یارے خواه

او چو شیرے به یکے گوشه کشتی بنشست
من سر اندر زن[1] وبیروں زن ہمچو روباه

آخر الامر چو کشتی بسلامت بگذشت
جستم از کشتی وآمد به لب کشتی گاه

عرصه دیدم چوں جان وجوانے بخوشی
شادی افزاے چو جان وجوانی غم کاه

گفتم اے بخت بہشت است سواد تر
گفت راضی مشو از روضه رضواں به گیاه

باش تا شهر به بینی، و در و ملک
باش تا قلعه به بینی و در و عرض سپاه

تا دریں بودم، گردے ز در شهر بخاست
گفتم آں کیست مرا گفت جبینت کش شاه

آمد القصه وآورد جبینت پیشم
دیده من چو دراں شکل وشبه کرد نگاه

بوسه دادم بہم، وزانوے رکابش ہر سه
گفتم اے وزبراق از تو چو رنگ تو سیاه

به سعادت به سر آخر خود باز خرام
که ترا پایه بلند است ومرا پایه کوتاه

ایں ہمی گفتم واو دست ہمیکوفت که نے
ترک فرماں ہمه حال گناه ہست وگناه

---

[1] سر اندر زن، منہ اندر کر لینا، یعنی لومڑی کی طرح کبھی منہ باہر نکالتا تھا اور کبھی اندر کر لیتا تھا،

اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اسکی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا، اس کے ساتھ طبیعت میں تنک ظرفی اور کم حوصلگی تھی، ذرا کسی سے رنج ہوا اور اُس کی ہجو کا طومار باندھ دیا، اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانہ کو دشمن بنا لیا تھا، چنانچہ سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے، سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہاں کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار میں بھیجدو، ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں، فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا، اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا، اسلئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا،

حذار حذار من بطشی و فتکی ۔۔۔ فھی الدنیا تقول بملاء فیھا

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا، ملک طوطی کے دربار میں سفارشیں پہنچائیں، سلطان علاء الدین کو یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے ملک طوطی کو لکھا کہ انوری کو میرے دربار میں بھیجدو، ہزار بکریاں صلہ میں دوں گا، ملک طوطی نے انوری کو بلا کر کہا کہ تمھارے معاوضہ میں مجھ کو ہزار بکریاں ملتی ہیں، انوری نے کہا علاء الدین مجھکو ہزار بکریوں کے بدلے خرید تا ہے، اور آپ مفت

بھی نہیں لیتے، ملک طوطی کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اپنے مقربین میں داخل کیا[1]۔

انوری کے مخالف شعرا نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھ کر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا، چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا، تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمایش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کردی[2]، اس کے چند اشعار یہ ہیں،

چار شہر ست خراسان را بر چار طرف | کہ وسطشان بہ مسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد | نہ چنان ہست کہ آبستنِ دام و دد نیست
بلخ را عیب اگرچند باد باش کنند | بہ ہر بیخردے نیست کہ صد بخرد نیست
مصر جامع راچارہ نبود از بد و نیک | معدنِ زر و گہر بے سرب و نُبَد نیست
حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدائے | گر بہشت است ہمین ست وگرنہ خود نیست

اہلِ شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچی، لیکن قاضی حمید الدین جنکی تصنیف سے مقامات حمیدی ہی، اور جنکی شان میں انوری نے لکھا ہے،

بہ مدح وثنا گر کنم رائے نظمے | نہ دشوار گویم نہ آسان فرستم
ولیکن بہ مدح جناب حمیدی | اگر وحے باشد ہراسان فرستم

---

[1] لب اللباب عوفی یزدی و مجمع الفصحا تذکرۂ فخر الدین مروزی [2] مجمع الفصحا، تذکرۂ فتوحی مروزی و ریاض الصالحین تذکرۂ انوری، دولت شاہ نے لکھا ہی کہ خود انوری نے یہ ہجو لکھی تھی لیکن یہ غلط ہی۔

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اُسکی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدہ میں ذکر کیا ہے،

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین حسن محتسب، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اسلیئے قصیدہ میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اسکی ہجو کیونکر کہہ سکتا ہوں،

بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزین ہو کر بیٹھا، سلطان علاء الدین غوری جہانسوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اسنے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا

کلبۂ کاندرو بہ روز و بہ شب | جاے آرام و خورد و خواب من است
جا یکے دارم اندر کہ ازو | چرخ در عین رشک و تاب من است
ہر چہ در مجلس ملوک بود، | ہمہ در کلبۂ خراب من است
رحل اجزا و نان خشک درو | گرد خوان من و کباب من است
قلم کوتہ و صریر خوشش، | زخمہ و نغمۂ رباب من است
خرقۂ صوفیانۂ اطلس | از ہزار اطلس انتخاب من است
ہر چہ بیروں بود ازیں کم و بیش | حاش للسامعین عذاب من است
خدمت بادشہ کہ باقی باد | نہ بیازوے خاک و آب من است

زیں قدر راہ رجعتم بستہ است — آں کہ او مرجع و مآب من است

ویں طریق از نمایشں است خطا — چہ کنم ایں خطا صواب من است

نیست ایں بندہ را زبان جواب — جامۂ و جامۂ من جواب من است

مدح اور ہجو کے ساتھ غزل کہنی بھی چھوڑ دی، کسی نے پوچھا تو جواب دیا۔

دی مرا عاشقکی، گفت غزل می گوئی — گفتم از مدح و ہجا دست بیفشاندم ہم

گفت چوں؟ گفتمش آں جانب گمراہی بود — حالت رفتہ دگر باز نیاید زعدم

غزل و مدح و ہجا ہر سہ ازاں می گفتم — کہ مرا شہوت و حرص و غضبے بود بہم

اخیر شعر کا مضمون اگرچہ عربی سے ماخوذ ہے، لیکن اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری شاعری کی حقیقت سے واقف تھا، یعنی یہ کہ شاعری، جذباتِ انسانی کے اظہار کا نام ہے، شہوت، حرص، غصہ، سب جذبات ہیں، اور یہی جذبات غزل و مدح اور ہجو کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں،

انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی، اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا،

انوری بخلاف اکثر شعرا کے اکثر علومِ متداولہ میں کمال رکھتا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے

گرچہ دربستم در مدح و غزل یکبارگی — ظن مبر کز نظم الفاظ و معانی قاصرم

بلکہ بر ہر علم کز اقرانِ من داند کسے — خواہ جزوی باشد آں را خواہ کلی قادرم

منطق و موسیقی و ہیات شناسم اندکے — راستی باید بگویم با نصیب وافرم

وز الٰہی انچہ تصدیقش کند عقلِ صریح | گر تو تصدیقش کنی بر شرح و بسطش ماہرم
وز طبیعی رمز چند از چند بے تشویر ہست | کشفِ آنم کرد اگر حاشد نباشد ناظرم
نیستم ہم جاہل از اعمالِ احکامِ نجوم | ور ہمی باور نہ دانی رنجہ شو من حاضرم
ایں ہمہ بگذار با شعرِ مجرد آمدم | چوں سنائی ہستم آخر گر نہ ہمچوں صابرم
قدر من صاحب قوام الدین حسن داند از آنکہ | صدر او را یادگار ناصر الدین طاہرم

ان کمالات کی وجہ سے تمام لوگ اس کی عزت کرتے تھے، سلطان سنجر اس جاہ وجلال کا بادشاہ اس کے گھر آتا تھا، فتوحات کا یہ حال تھا کہ جلال الوزرا کے ہاں سے سالانہ پانچ سو اشرفیاں مقرر تھیں، با ایں ہمہ چونکہ طبیعت کا دنی تھا اور زبان قابو میں نہ تھی، اسلئے ذلتیں اُٹھاتا تھا، ایک وزیر کی مدح میں قطعہ لکھا اور اخیر میں یہ شعر لکھے،

تو کہ از دور ہمی بینی پوشیدہ مرا | حال بیرون و درونم نہ ہمانا دانی
طاق بو طالب نعمہ است کہ دارم بر دوش | وز درون پیرہن بو الحسن عمرانی

یعنی میرے بدن پر مدت کے پھٹے پرانے کپڑے ہیں، چادر ابو طالب کی دی ہوئی ہے اور پیراہن ابو الحسن عمرانی کا عنایت کیا ہوا ہے، وزیر نے ناراض ہو کر، فتوحی مروزی کو حکم دیا کہ جواب لکھے، چنانچہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

از پس آنکہ بہ یک مہر دو الف ملکی | داشت در تلخ ملکشاہ بتو ارزانی
وز پس آنکہ ہزار دگرت داد وزیر | قرض آں پیر سرخشی ز چہ می بتانی
از پس آنکہ ز انعام جلال الوزرا | بتو ہر سالہ رسد مہرے پانصد کانی

اے بہ دانائی معروف چرا میگوئی	درثنائے کہ فرستادہٗ از نادانی
طاق بوطالب نعمہ است کہ دارم بر دوش	وز درون پیرہن بوالحسن عمرانی
چہ بخیلی کہ بجنبذین زروسیم ونعمت	طاق و پیراہنے دوخت ہمی نتوانی
پانزدہ سال فزون باشد تا کشتہ شدہ است	بوالحسن آنکہ ز احسانش سخن میرانی
پیرہن کہنۂ او گرت بجائیست ہنوز	پس مخواں پیرہنش کو زرہ ختانی
باقی عمر بتن آں پیرہن وطاق ترا	سزوار ندہی ابرام ودگر بتانی

یعنی ابوالحسن عمرانی کو مرے ہوئے آج پندرہ برس ہو گئے، اتنی مدت تک اسکا دیا ہوا پیرہن موجود ہے، تو پیرہن کا ہے کو ہے زرہ ہے، اور اُس کے ہوتے اب کسی پیرہن کی کیا حاجت ہے،

لطیفہ، ایک دفعہ انوری راہ میں چلا جاتا تھا، ایک شخص کو دیکھا کہ اشعار پڑھ رہا ہے، انوری نے خیال کیا تو اسی کے اشعار تھے، پوچھا کہ آپ کا تخلص کیا ہے، ؟ اس نے کہا "انوری" انوری نے کہا، شعر کے چور پہلے بھی سنے تھے، شاعر چرانے والا آج دیکھا،

کلام پر رائے | انوری جس پایہ کا شاعر تھا، اس سے زیادہ بہت خوش قسمت تھا، ایران میں تین شاعر پیغمبرِ سخن تسلیم کئے گئے، اُن میں ایک انوری بھی ہے، چنانچہ مشہور ہے

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی

[1] مجمع الفصحا، تذکرہ فتوحی مروزی،

ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

ہاتفی نے مثنوی کی رعایت سے اس کو اس طرح بدل دیا ہے،

در شعر سہ تن پیمبر انند — قولے است کہ جملگی برانند

فردوسی و انوری و سعدی — ہر چند کہ لا نبی بعدی

آباقاآن خاں کے زمانہ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ انوری اور ظہیر فارابی دونوں میں کس کو ترجیح ہے، سب نے مجد[1] ہمگر کو ثالث قرار دیا اور ایک منظوم استفتا لکھا،

اے آں زمین وقار کہ بر آسمان فضل — ماہ خجستہ فضلے و خورشید انوری،

جمعے ز ناقدانِ سخن گفتہ ظہیر — ترجیح می نہند بر اشعارِ انوری

جمعے دگر بریں سخن انکار می کنند — فی الجملہ در محل نزاع اند و داوری

رجحان یک طرف تو بدلشان نماکہ ہست — زیر نگین طبع تو ملکِ سخنوری،

مجد ہمگر نے جواب لکھا،

جمعے ز اہل خطۂ کاشاں کہ بردہ اند — از ارباب فضل و دانش گوی سخنوری

کردند بحث در سخن نیشان نظم — تا خود کہ سفتہ بہ دُر در سخنوری

در انوری مناظرہ شاں رفت در ظہیر — تا مر کراست پایۂ بہتر ز شاعری

انصاف چوں نیافت گروہ از دگر گروہ — مر بندہ را گزید نظر شاں بہ داوری

در کانِ طبع آں چو گشتم گراں گراں — در قعر بحر ایں چو نمودم شناوری

[1] مجد ہمگر اس درجہ کا شاعر تھا کہ بعضوں نے اسکو شیخ سعدی کا ہم پلہ مانا ہے،

شعر کے برآمدہ چو در شاہوار	نظم دگر برآمدہ چوں مہر خاوری
شعر ظہیر اگرچہ برآمد ز جنس شعر	برتر ز انوری نہ زند لاف شاعری
بر اوج مشتری نہ رسد تیر نظم او،	خاصہ کہ در ثناگری و مدح گستری
طعم رطب اگرچہ لذیذ است و خوش مذاق	کے بہ بود ز خاصیت قند عسکری
انیست اعتقاد رہی خوش قبول کن	گر تو مقید سخن مجد ہمگری
زاد ایں نتیجہ نیم شب از آخر رجب	در خا و عین و دال ز ہجر پیمبری

امامی ہروی[1] نے بھی اس فیصلہ سے اتفاق کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

اے سالک مسالک فکرت دریں سوال	معذور نیستی بحقیقت چو بنگری
تمیز را ز بہر تناسب دریں دو طور	ہیچ احتیاج نیست بدیں شرح گستری
کیں معجز است و آں سحر آں شمع و ایں چراغ	ایں ماہ آں ستارہ و آں حور و ایں پری

انوری ظہیر سے بلکہ اپنے تمام معاصرین سے بڑھکر ہو تو ہمکو انکار نہیں، لیکن اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں اس کو جگہ دی جائے قطعہ[2] مشہور اور مجد ہمگر کے فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انوری قصیدہ گوئی میں پیغمبر تھا جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی اور غزل میں تھے، لیکن یہ اور بھی حیرت انگیز ہی

[1] یہ وہی امامی ہیں جن کو مجد ہمگر نے شیخ سعدی پر ترجیح دی تھی، اور شیخ سعدی نے ناراض ہو کر کہا تھا — ہمگر بعمر خود نکرد دست نماز | ننگ نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

[2] مجالس المومنین تذکرہ انوری، ہمگر کے قطعہ کے چند شعر ہم نے چھوڑ دیئے ہیں،

قصیدہ کا جو اندازہ چلا آتا تھا، اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا، اور جس قدر کیا اس میں اس کے اور ہمعصر شریک ہیں، انوری کے قصائد کے خصوصیات یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس نے جدید مضامین پیدا کئے، مبالغہ کو ترقی دی نئی تشبیہیں پیدا کیں، لیکن عبدالواسع جبلی، ارزقی اور ظہیر ان باتوں میں انوری سے کسی طرح کم نہیں، انوری نے ایک قصیدہ میں ہلال کی تشبیہ سے مدح کی طرف گریز کیا ہے، اور وہ انوری کے محاسنِ اشعار میں محسوب ہے،

دوش سلطاں چرخ آئینہ فام　　　آنکہ دستور شاہ راست غلام

از کنار نبردگاہِ افق　　　چوں بدست غروب داد زمام

دیدم اندر سوادِ طرۂ شب　　　گوشوار فلک زگوشۂ بام

گفتم آں نعل خنگ دستور است　　　قرۃ العین و فخر آلِ نظام

(گھوڑا) (وزیر)

لیکن یہ تشبیہ اور گریز منطقی رازی سے ماخوذ ہے، وہ کہتا ہے،

مہ گردوں مگر بیمار گشتہ　　　کہ نالید و تنش بگرفت نقصان

بسان گوے سیمیں بود اکنوں　　　برآمد بر فلک چو نوکِ چوگان

تو گفتی خنگ صاحب تاختن کرد　　　فگند ایں نعلِ زریں در بیاباں

اس میں جو لطافت اور ندرت ہے انوری کے ہاں نہیں، ظہیر فاریابی نے بھی اس تشبیہ کو لیا ہے، لیکن چند اور تشبیہیں اضافہ کرکے اسکو زیادہ دلآویز کر دیا ہے،

پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسمان　　　شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار

من با خرد بہ حجرۂ خلوت شتافتم — گفتم کہ اے نتیجۂ الطافِ کردگار

باز ایں چہ نقشِ بوالعجب و شکلِ نادرست — کز کارگاہِ غیب ہمے گردد آشکار

گردوں زجانۂ کہ؟ بریدہ است ایں طرانہ — گیتی زساعدکہ؟ بودست ایں سوار

گفت آنچہ برشمروی ازاں جملہ ہیچ نیست — دانی کہ ہیچ باتو بگویم بہ اختصار

نعل سمندِ شاہِ جہان ست کاسماں — ہر ماہ برسرش نہد از بہرِ افتخار

وطن کی ناقدری میں انوری کا مشہور شعر ہے،

بہ شہرِ خویش دروں بے خطر بود مردم — بہ کانِ خویش درون بے بہا بود گوہر

لیکن یہ بالکل میر معزی کے شعر کا سرقہ ہے

مردم بہ شہرِ خویش نہ دارد بسے خطر — گوہر بہ کانِ خویش ندارد بسے بہا

غرض انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں، البتہ اپنے معاصرین یعنی ادیب صابر، ازرقی، لامعی، رشید الدین وطواط، عبدالواسع جبلی، معزی وغیرہ سے بعض باتوں میں ممتاز ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اور شعراء کی طرح اسکا کلام مدح پر محدود نہیں، وہ ہر طرح کے واقعات اور معاملات ادا کرتا ہے، جس سے زبان کو وسعت حاصل ہوتی ہے، آج کوئی شخص اگر عام معاملات ادا کرنا چاہے تو اس کو الفاظ میں، بندش میں، ترکیب میں، انوری کے سوا اور شعراء کے کلام سے بہت کم مدد ملیگی،

ایک قصیدہ میں شاعری کی بُرائی اور اس کا غیر ضروری ہونا بیان کیا ہے،

اس میں وہ تمام خیالات ظاہر کئے ہیں جو آج کل شاعری کے بیکار ثابت کرنے میں پیش کئے جاتے ہیں؛ اس نے ثابت کیا ہے کہ شاعر کا رتبہ حلال خور سے بھی کم ہے، اسلئے کہ حلال خور دنیا کے لئے ضروری ہے، لیکن شاعری کی کیا ضرورت ہی؟ ایک ادنیٰ اسی چیز کے بنانے میں بواسطہ اور بلاواسطہ سینکڑوں آدمی کی شرکت کی ضرورت پڑتی ہے لیکن شاعر کون سا کام انجام دے سکتا ہی، مدحیہ شعر کہہ کر صلہ کا طالب ہونا کس قدر لغو ہے، ممدوح نے کب کہا تھا کہ تم اسکی مدح کرو؛ البتہ وہ شاعر قدر کے قابل ہی جو کسی کی مدح وغیرہ نہیں کرتا، ان تمام خیالات کو انوری نے نہایت صفائی اور برجستگی سے ادا کیا ہے

اے برادر بشنوی رمزی زشعر و شاعری ——— تازما مشتے گدا کس را بمردم نشمری

زاں کہ از کناس ناکس در ممالک چارہ نیست ——— حاش للہ تا ندانی ایں سخن را سرسری

زانکہ گر حاجت فتد تا فضلہ را کم کند ——— ناقلے باید، تو نتوانی کہ خود بیروں بری

کار خالد کے بجعفر مے شود ہرگز تمام ——— آں یکے جولاہگی داند دگر بذری گری

باز گر شاعر نہ باشد، ہیچ نقصاں نا وفتد ——— در نظام عالم از روے خرد گر بنگری

آدمی را چوں مونث شرط کار شرکت است ——— ناں ز کناسی خوری بہ زاں بود کز شاعری

آں شنیدستی کہ سہ صد کس بباید پیشہ ور ——— تا تو نادانستہ و بے آگہی نانے خوری

در ازاے آں اگر از تو بنا شد یارے ——— آں نہ ناں خوردن بود، دانی چہ باشد بہرہ؟

چوں نہ داری بر کسے حقی حقیقت داں کہ ہست (مقابل) ——— ہم تقاضا ریش گاوے ہم بجا...

از چہ واجب شد بگو؟ آخر ہمیں آزار مرد ——— اینکہ میخواہی ازو، یا آنکہ زو مستکبری

اوترا کے گفت؟ کایں گلترہ ہا را جمع کن — تا ترا لازم شود چنداں شکایت گستری

لغویات

عمر خود خود میکنی ضائع از و تاواں مخواہ — ہم تو حاکم باش تا ہم زاں کہ بفروشی خری

دشمنِ جانِ من آمد شعر چندیں پرورم — اے مسلماناں فغاں از دستِ دشمن پروری

شعر دانی چیست؟ دور از روے تو حیض الرجال — قائلش گو خواہ حیواں باش خواہی شتری

اینکہ پرسد ہر زماں ایں کون خراں گاوریش — کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سنجری

راستی بہ بوفراس آمد نگار شاعراں — واں نہ از جنسِ سخن بل از کمالِ قادری

زانکہ ہمچوں دیگراں مدح و ثنا ہرگز نہ گفت — پس امر بخ ار گویدت من دیگرم تو دیگری

مرد را باید کہ حکمت نیز دامن گیر دش — تا شفاے بوعلی خواند نہ ژاژِ بحتری

جس زمانہ میں غز (ون تاتاریوں) نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا، اور کئی برس تک قید میں رکھا، تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی، اہلِ خراسان نے احمد سلیمان سے استغاثہ کرنا چاہا، انوری نے درخوست کی کہ ان عبرت انگیز واقعات کو نظم میں ادا کر دے، انوری نے فرمایش کی تعمیل کی،

بر سمرقند اگر بگذری اے بادِ سحر — نامہ اہلِ خراساں بہ برِ خاقان بر

نامۂ مطلعِ او، رنجِ تن آفتِ جاں — نامہ مقطعِ او دردِ دل و سوزِ جگر

نامہ بر رقمش، آہِ شہیداں پیدا — نامہ در شکنش، خونِ شہیداں مضمر

تاکنوں حالِ خراسان و رعایا بودہ است — بر خداوندِ جہاں خاقان پوشیدہ مگر

اے کیومرث بقا، بادشہ کسریٰ عدل — اے منوچہر لقا، خسرو افریدوں فر

قصۂ اہلِ خراساں بشنو از سرِ لطف	چوں شنیدی، ز سرِ رحم درایشاں بنگر
ایں دلِ انگار جگر سوختگاں می گویند	کاے دل و دولت و دیں را ز تو شادی و ظفر
خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں	نیست یک تن ز خراساں کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگانِ زمانہ شدہ خرداں سالار	بر کریمانِ جہاں گشتہ لئیماں مہتر
شاد الّا بہ درِ مرگ نہ بینی مردم	بکر جز در شکم مادر نیابی دختر
بر مسلماناں زاں شکل کنند استخفاف	کہ مسلماں نہ کند صد یک آں با کافر
خلق را زیں غمِ فریادرس اے شاہ نژاد	ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک سیر
رحم کن رحم برآں قوم کہ جویند جویں	از پس آنکہ نخوردندے از نازِ شکر
رحم کن رحم برآنہا کہ نیابند نمد	از پس آنکہ ز اطلس شاں بودے بستر

کسی دوست کو دعوت میں بلایا ہے، اور نظم میں رقعہ لکھا ہے،

ندارد مجلسِ ما بے تو نورے	اگرچہ نیست مجلس در خورِ تو
چہ فرمائی چہ گوئی مصلحت چیست	تو آئی نزدِ ما؟ یا ما برِ تو،

دربار داری اور دریوزہ گری سے توبہ کی تو یہ قطعہ لکھا،

من وایں عہد کہ با قحبۂ رعنای جہاں	بعد ازاں عشق نبازم نہ بسہو و نہ بعمد
قوت دادن اگر نیست مرا باکے نیست	قوت ناستدن ہست فللہ الحمد

یعنی اگر دوسروں کو دینے کا مقدور نہیں تو یہ قدرت تو ہے کہ دوسروں سے کچھ نہ لوں،

علم کی بے قدری پر اس طرح غصہ ظاہر کرتا ہے،

اے خواجہ مکن، تا بتوانی طلب علم	تا در طلب اتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز	تا دادِ خود از کہتر و مہتر بستانی
فرعونِ عذاب بدو ریشِ مرصع	موسیٰ کلیم اللہ و چوبی و شبانی

یعنی فرعون کافر ہوکر داڑھی میں موتی پروتا تھا، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہوکر بکریاں چراتے تھے،

عوام کی بے تمیزی کو ایک فرضی قصہ میں ادا کرتا ہے،

روبہے می دوید در غم جاں،	روبہے دیگرش بدید چناں،
گفت خیر است؟ باز گوئی خبر	گفت خرگیری کند سلطاں
گفت تو خر نہ چہ می ترسی	گفت آرے ولیک آدمیاں
می ندانند و فرق می نہ کنند	خر و روباہ شاں بود یکساں

شیخ سعدیؒ نے "ایں ہم بچۂ شتر است" کا لطیفہ غالباً یہیں سے لیا ہے،

بات چیت، خط کتابت میں ایشیائی تکلفات سے انوری بھی تنگ آگیا تھا، چنانچہ کہتا ہے اور کس بے تکلفی سے کہتا ہے،

تکلف میانِ دو آزاد مرد	بود ناپسندیدہ و سخت کام
بیا تا تکلف بیک سو نہیم	نہ از تو رکوع و نہ از ما قیام
بہ سنت کنم اقتدا زیں سپس	سلام علیکم، علیکم سلام

ہجو | انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی شریعت ہوتی تو انوری

اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اُس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک، اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں، ان ہجوؤں میں قوتِ تخئیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہی، صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہی کہ اس صنف میں اسکا جو کلام زیادہ نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے سینکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کرنے کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتشکدۂ آذر موجود ہے، ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے، وہ حاضر ہے،

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلہ کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی دیکھو کس لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را	یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا	ازیں سہ بیت دوگفتم، دگرچہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہی کہ تین نظمیں لکھتے ہیں، اول مدح پھر قطعۂ تقاضائی جسمیں صلہ کا تقاضا ہوتا ہے، اب ممدوح نے صلہ دیا تو شکریہ ورنہ ہجو ان تین نظموں سے میں دو تو کہہ چکا، فرمایئے اب کیا ارشاد ہوتا ہے،

گھوڑے کی ہجو لکھتا ہے،

بر عادت از وثاق بصحرا بروں شدم	با یک دو آشنا ہم از ابناے روزگار
اسپے چناں کہ دانی زیر از میانہ زیر	دزکاہلی کہ بود نہ سکسک نہ راہوار

درخفت وخیز ماند ہمہ راہ عیدگاہ — من گاہ از و پیادہ و گاہے برو سوار

نہ از غبار خاستہ بیروں شدے بزور — نہ از زمین خستہ بر انگیختے غبار

گہ طعنہ از یں کہ کابش دراز کن — گہ بذلہ از اں کہ عنانش فروگذار

من والہ و خجل متحیر فرو شدہ — چشمے سوے بہینم و گوشے سوے سوار

سوداؔ نے گھوڑے کی ہجو میں جو قصیدہ لکھا ہے، اسی کا تتبع ہے، چنانچہ بحر و قافیہ بھی یہی ہے،

نکتہ انوری کے دیوان میں چند ہجویں، انوریؔ کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں، عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوریؔ کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا، لیکن غالباً اور شعرا نے یہ ہجویں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دیں، اور چونکہ پبلک اُسکی دشمن تھی، اسلئے وہ اسی طرح قائم رہ گئیں، اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ فتوحیؔ مروزی نے انوریؔ کے نام سے بلخ کی جو ہجو لکھ کر مشہور کر دی وہ آج تک انوریؔ کے دیوان میں داخل ہے، حالانکہ ابو الحسن فراہانی شارح قصائد انوریؔ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ وہ ہجو، فتوحیؔ مروزی کی تصنیف ہے،

انوریؔ علوم عربیہ میں کمال رکھتا تھا، اس لئے اس کے کلام میں یہ خصوصیت خود بخود پیدا ہو گئی ہے کہ عربی تلمیحات، عربی جملے، عربی الفاظ اس خوبی سے شامل کرتا ہے، کہ گویا انگوٹھی پہ نگینہ جڑ دیا ہے، ملاحظہ ہو،

شاعری، دانی، کدامی قوم کردند آنکہ بود — اولش شان امرء القیس، آخرشاں بو فراس

دین کہ من خادم ہمی پردازم اکنوں سیاست حریت　　سامری گو تا بیابد گوشمال لامساس

سنائی کے قصیدے کا جو جواب لکھا ہے، اس میں اکثر قافیے اسی قسم کے آئے ہیں، مثلاً

بر دجانِ پدر تن در شیت دہ کہ زیر افتد　　زیا جوج تمنا رخنہ در سدِ ولو شینا

بلے از جاھدوا اکیسر ست تستایں رشتہ　　ولیک از جاھدوا ہم بر نخیزد ہیچ بے فینا

(یعنی جاہدوا فینا)

چوں مراد خویش را با ملک رے کردم قیاس　　در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس

چوں غنیمت را مقابل کردہ شد با المنی　　عقل سی روز و طمع ماہے بود در اسابداس

انظرونا نقتبس من نورکم کے گفت چرخ　　کافتاب از آفتاب ہمت کرد اقتباس

تاکہ باشد ایں مثل کالیاس احدی الراحتین　　بادے اندر راحتے کو را نباشد بیم یاس

بے سپیدہ دم شب خذلاں بخواہت چنانکہ　　تا بصبح حشر میگوید احادٌ ام سداس

متبنی کے اس مطلع کی طرف اشارہ ہے، احادٌ ام سداسٌ فی أحاد،

دوستاں بایک جگر پرخوں کہ اینک قد مضے　　دشمناں با کید گر پر خندہ کاینک قد ہلک

آدم از نسبت وجود تو یافت　　اختصاصِ خلقتہ بیدی

دوش با آسماں ہمے گفتم　　بر سبیل سوال مطلب لیتے

کاے علی! خرج ایں حشم بر کیست　　ہمت گفت قد ضنیت علی

میر آب ست و حق ہمی گوید　　کہ من الماء کل شیٔ حیّ

خصم تو و قاعدۂ ملک او　　آں شدہ از بد و جہان مستقیم

چوں دو بنا بود برافراشتہ | زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم
زلزلۂ قہر تو شاں کرد پست | زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم

جو لوگ انوری کی پیغمبری کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں اُسکی مضمون آفرینیوں سے استدلال کرتے ہیں،

متنبی نے مضمون باندھا تھا کہ ممدوح گو انسانوں میں داخل ہے، لیکن انسانوں سے فائق ہے جس طرح نافہ کہ ہرن کے خون سے بنا ہے، لیکن خون سے اس کو کچھ نسبت نہیں ہے،

فان تفق الانام و انت منھم | فان المسک بعض دم الغزال

اس سے ترقی کرکے شراب انگور کی مثال دی ہے،

فان فی الخمر معنی لیس فی العنب

یعنی گو شراب انگور سے بنتی ہی، لیکن یہ انگور سے بڑھکر ہے، ممدوح کا بھی یہی حال ہے
انوری نے ان سب تشبیہوں کو گرد کر دیا،

در جہانی و از جہاں بیشی، | ہمچو معنی کہ در بیاں باشد

یعنی اے ممدوح تو دنیا میں ہے، لیکن دنیا سے زیادہ ہے، جس طرح عبارت میں معنی ہوتے ہیں کہ عبارت ذرا سی ہوتی ہے اور مضمون نہایت وسیع ہوتا ہی،

زحرص خدمت او سر نگوں ہمے آیند | بوقت زادن از ارحام مادراں طفلاں

بچے عموماً ماں کے پیٹ سے سر کے بھل پیدا ہوتے ہیں، انوری اس کا سبب یہ قرار دیتا

ہے کہ انسان فطرۃً ممدوح کی خدمت کے خواہشمند ہیں، اس لئے دنیا میں آتے ہیں تو سر کے
بل آتے ہیں، مبالغہ جو عوام کے نزدیک شاعری کی ایک اعلیٰ صفت ہے، انوری
اس میدان میں سب سے آگے ہے،

ممدوح کی مدح میں ع اے بیش زآفرینش وکم زآفریدگار
ع چیست کاں بر تو روانیست مگر عزوجل

بزرگواری کاندر کمال قدرت خویش نہ ایزد ست و چو ایزد بزرگ بے ہمتا ست
گر صبا از کف و دست تو وزد وقت بہار درم افشاں و ہماز شاخ بروں دست چنار

انوری اور یورپ انوری کی خوش قسمتی میں ایک نمبر یہ بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ یورپ نے
اس کے کلام کے ساتھ نہایت اعتنا کیا، روس کے پروفیسر والن ٹن ژوکوسکی نے ۱۸۸۳ء
میں بمقام سینٹ پٹرسبرگ انوری کے کلام اور اسکی سوانحمری پر ایک کتاب لکھی جس کا
یہ نام ہے "میٹریس فار اے بیوگرفی اینڈ کیرکٹرسٹک اسکیچ" یہ کتاب ۱۰۰ صفحات پر مشتمل
ہے، اور اس کے عنوانات حسب ذیل ہیں،

دیباچہ	از صفحہ ۱ تا ۷
مقدمہ	۸ تا ۲۴
باب اول	۱ تا ۳۰ اسمیں انوری کی سوانحمری ہے،
باب دوم	۳۱ تا ۸۷ مشتمل بر خصوصیات انوری
باب سوم	از ۷۹ تا ۹۷ مشتمل بر شروح کلام انوری

پروفیسر براؤن نے اس کتاب کا حال تفصیل سے لکھا ہے، ناظرین اسکو ملاحظہ فرمائیں اور غور کریں کہ اہل یورپ ہر زبان کے متعلق، کیا کیا نکتہ سنجیاں اور دیدہ ریزیاں کرتے ہیں کہ ہم انکی تقلید بھی نہیں کر سکتے،

نظامی،

الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص، باپ کا نام مویدؔ تھا، وطن عام طور پر گنجہ مشہور ہے، لیکن در اصل قم کے رہنے والے تھے، چنانچہ خود سکندر نامہ میں فرماتے ہیں،

چو در گرچہ در بحر گنجہ گمم ولے از قہستان شہر قمم

قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے، اصل وطن یہاں تھا، لیکن چونکہ قم صدر مقام ہے، اسلئے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں، نظامی کے والد بزرگوار وطن چھوڑ کر گنجہ میں آئے، نظامی[1] یہیں پیدا ہوئے، سالِ ولادت کسی نے بیان نہیں کیا لیکن چونکہ بروایت صحیح سن وفات ۵۹۶ھ ہے اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان کیجاتی ہے، اس لئے سالِ ولادت ۵۳۳ھ سمجھنا چاہیئے،

نظامی کا خاندان علمی خاندان تھا، ان کے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر ہیں، انکا ایک قصیدہ ہے، جس میں تمام صنائعِ شاعری جمع کر دیئے ہیں،

نظامی نے ابتدا میں درسی علوم کی تحصیل کی، ان کے کلام سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے

[1] یہ امین ارحی اور لطف علی آذر کی تحقیق ہے، لیکن سکندر نامہ کے جس شعر سے امین آرحی نے استدلال کیا ہے، وہ موجودہ نسخوں میں مذکور نہیں، تفرش کی مزید تفصیل اور نظامی کی جائے ولادت لطف علی آذر سے ماخوذ ہے،

کہ علمی مسائل ان کے پیشِ نظر ہیں، خود بھی دعویٰ کرتے ہیں،

ہرچہ ہست از دقیقہاے نجوم ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ با یکایک نہفتاے علوم
خواندم و سرِ ہر ورق جستم ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ چوں ترا یافتم ورق شستم

سلسلۂ طریقت میں واخی فرج زنجانی سے بیعت تھی،

نظامی اگرچہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے، لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے، گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا تھا، اس لئے درسی علوم سے فارغ ہوکر تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا، تو حرف موزوں نکلے، مشق روز بروز بڑھتی گئی، اور کلام کا شہرہ دور دور پہنچا، یہانتک کہ اُس زمانہ کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمایش کرکے اُن سے اپنے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں، اسباب اسکے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا لیکن یہ سعادت دور والوں کی قسمت میں لکھی تھی، سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ[1] تھا، نظامی نے مخزن الاسرار ۵۵۹ھ میں اسی کے نام پر لکھی، اور صلہ میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر، اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے،

[1] سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے منکوچک غازی کو جو قائم بامر اللہ کا منظور نظر تھا، ارزنجان اور کماخ وغیرہ کے علاقہ کا حاکم مقرر کیا تھا اس کے خاندان میں سب سے بہرام شاہ نے بہت جاہ و جلال حاصل کیا، یہاں تک کہ سلطان قلیج ارسلان سلجوقی بادشاہ روم نے اسکو اپنی لڑکی بیاہ دی، بہرام شاہ نہایت فیاض اور بلند ہمت تھا، یہی بہرام، نظامی کا ممدوح ہے، جن کے نام پر انھوں نے مخزن الاسرار لکھی، (از ہفت اقلیم امین رازی)

مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا،

نظامی کا وطن گنجہ سلجوقیوں کی حدودِ حکومت میں واقع تھا، اور اس زمانہ میں اس سلسلہ میں سلطان طغرل بن ارسلان فرماں روا تھا، وہ نہایت دلیر، شجاع اور عدل پرور بادشاہ تھا، علم و فضل میں بھی کمال رکھتا تھا، شعر و شاعری کا بھی مذاق تھا، چنانچہ یہ رباعی اسکی مشہور ہے،

دی روز جہاں وصال جاں افروزی | وامروز جہاں فراق عالم سوزی
حیف است کہ در دفتر عمرم ایام | آں را روزے نویسد ایں را روزی

طغرل نے سلطنت کا تمام کاروبار اتابک محمد بن ایلدگز کے ہاتھ میں دیدیا تھا جو ابتدا میں غلام تھا اور ترقی کرتے کرتے امیر الامرائے کے منصب پر پہنچ گیا تھا، محمد ابن ایلدگز کا بھائی قزل ارسلان جس کی مدح میں ظہیر فاریابی کا یہ شعر مشہور ہے،

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے | تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

کاروبارِ سلطنت میں برابر کا شریک تھا،

اس زمانہ میں نظامی نے شیریں خسرو لکھنی شروع کی تھی، کتاب کا ابھی آغاز تھا کہ اس کے چرچے دور دور پھیل گئے، طغرل کو خبر ہوئی، اسی وقت فرمان بھیجا کہ ایسی کتاب لکھئے کہ یادگار رہجائے، چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چو سلطانِ جہاں شاہ جواں بخت | کہ برخوردار بادا از تاج وازتخت

۱؎ حبیب السیر،

بہ سلطانی بہ تاج و تخت پیوست | بجای ارسلان بر تخت بنشست
من این گنجینہ را دم می کشادم | بنای این عمارت مے نہادم
اشارت رنگے از درگاہ معمور | بہ شغل بندہ القا کرد منشور
کز ینسان تحفۂ عالی بسازد | کہ عقل از منش گردن فرازد

جس زمانہ میں نظامی یہ مثنوی لکھ رہے تھے، ان کے ایک دوست جو مذہب میں نہایت تعصب رکھتے تھے، ان کے پاس آئے اور نہایت ناراضی کے لہجہ میں کہا کہ کافروں کے جھوٹ سچ قصے لکھنے سے کیا فائدہ،

فسوں بت پرستاں لفگن از مشت | فسوں خوانی مکن بر زند زردشت
در توحید زن کاوازہ داری | چرا رسم مغاں را تازہ داری

لیکن نظامی نے جب مثنوی کے چند اشعار پڑھکر سنائے، تو انھوں نے بیساختہ کہا،

چنیں سحرے تو دانی ساز کردن | تبے با کعبۂ انباز کردن

شیریں خسرو جب انجام کو پہنچی تو محمد بن یلدکز جو درحقیقت تاج و تخت کا مالک تھا وفات کر چکا تھا، اور اس کا بھائی قزل ارسلان اس کا قائم مقام مقرر ہوا تھا اسکو شیریں خسرو کے تمام ہونے کی خبر پہنچی تو نظامی کی طلبی کا فرمان بھیجا، قاصد فرمان لیکر آیا، نظامی نے آداب شاہی کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا، پھر تین جگہ بوسہ دیکر کھولا، چنانچہ شیریں خسرو کے خاتمہ میں خود فرماتے ہیں،

مثال شاہ را بر سر نہادم | سہ جا بوسیدم و سر بر کشادم

اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے، اور دشت و بیاباں طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینہ میں پائے تخت میں پہنچے، قاصد نے جاکر دربار میں اطلاع کی، قزل ارسلان نے شمس الدین محمد کو حکم دیا کہ خود جاکر ان کو ساتھ لائیے، دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ مجلسِ عیش آراستہ ہے، ساز چھڑ رہے ہیں گانا ہو رہا ہے، بادہ و جام کا دور چل رہا ہے، قزل ارسلان نے فوراً اُن کے ادب سے گانا بجانا بند کرادیا، اور تخت سے اُٹھکر تعظیم بجالایا، پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہر طرح کی باتیں ہوتی رہیں، بیچ بیچ میں بزرگانہ نصیحتیں بھی کرتے جاتے تھے، مدحیہ نظم لکھ کرے گئے تھے، اسکو سنانا چاہا، قاعدہ یہ تھا کہ شعرا اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے، بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے، جو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا تھا اور اسکو راوی کہتے تھے، چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا، یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ہو جاتا تھا، اور قصیدہ کے ختم ہونے تک کھڑا رہتا تھا، نظامی نے بھی اس قاعدہ کو بجالانا چاہا، لیکن قزل ارسلان نے قسم دلاکر منع کیا،

چو برپا ایستادم گفت بنشیں به سوگندم نشانداں منزلت بیں

راوی نے مدح کے بعد، شیریں خسرو کا قصہ شروع کیا، بادشاہ نظامی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شوق میں سن رہا تھا اور بار بار بیساختہ تحسین کرتا جاتا تھا، نظامی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے میرا نام زندہ کر دیا، اسکا صلہ دینا میرا فرض ہی، پھر پوچھا کہ بھائی صاحب (اتابک پہلوان محمد بن ایلدکز) نے آپ کی جاگیر میں جو دو گاؤں دیئے تھے، وہ آپ کو ملے یا نہیں، انھوں نے کہا،

بلے شاہ سعید از خاص خویشم | پذیرفت آنچہ فرمودی زپیشم
چو رخت عمر او کشتی رواں کرد | مرا نے جملہ عالم رازیاں کرد

قزل ارسلاں نے ایک گاؤں جس کا نام حمدونیاں تھا، اپنی طرف سے جاگیر میں دیا[1]،

معلوم نہیں، جان کر یا غلطی سے، گاؤں جو جاگیر میں دیا گیا وہ غیر آباد اور بنجر تھا، چنانچہ نظامی نے شیریں خسرو میں، اسکی شکایت اس تقریب سے کی ہو کہ حاسدوں نے مجھکو طعنہ دیا میں نے جواب میں کہا کہ غیر آباد ہے تو کیا، بادشاہ کا عدل اس کو آباد کردیگا،

نظامی کی شہرت اب اس قدر عالمگیر ہو گئی تھی کہ اور سلاطین کو بھی آرزو ہوئی کہ ان سے اپنے نام پر تصنیفات لکھوائیں کہ اس ذریعہ سے ان کا نام بھی یادگار رہجائے ان میں علم و فضل کی قدر دانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ اخستان تھا جو سلاطین شروانیہ کے سلسلہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی النسل یعنی بہرام چوبیں کی یادگار تھا، منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا، خاقانی ابو العلاء گنجوی (اُستاد خاقانی) ذوالفقار شروانی، شاہفور وغیرہ شعراء اسی کے خوانِ کرم کے زلہ خوار تھے، ابو العلاء گنجوی، اسی کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اور خاقانی کو افضل الشعراء کا خطاب اسی نے عنایت کیا، منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجئے، چنانچہ دیباچہ میں خود کہتے ہیں،

---

[1] یہ تمام حالات تفصیل کے ساتھ خود نظامی نے شیریں خسرو کے خاتمہ میں لکھے ہیں،

در حال رسید، قاصد از راہ	آورد مثال حضرت شاہ،
بنبشتہ بہ خط خوب خوشیم	دہ پانزدہ سطر نغز پیشم
کاے محرم حلقۂ غلامی	جادو سخن جہاں نظامی
خواہم کہ بہ یاد عشق مجنوں	گوئی سخنے چو دُرّ مکنوں

خط پہنچا تو نظامی کو تردد ہوا، اتفاق سے ان کے صاحبزادے محمد جن کی عمر اسوقت ۱۴ برس کی تھی، اس وقت موجود تھے، اُنھوں نے بھی تحریک کی، نظامی نے کہا جانِ پدر قصہ کی شہرت میں کلام نہیں، لیکن جہاں کی سرگذشت ہے، وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں، باغ و بہار چشمہ و سبزہ زار، رقص و سرود، شاہی در و دربار، خیل و حشم، جاہ و جلال کسی چیز کا پتہ نہیں، خشک ریگ زار، اور کوہستان میں میں کیا صنعت گری دکھاؤں گا،

نے باغ و نہ بزمِ شہریاری	نے رود و نہ مَی نہ کامگاری
بہ خشکی ریگ و سختی کوہ،	تا چند سخن رود در اندوہ

یہی بھید ہے کہ آجتک کسی نے اس قصہ کو ہاتھ نہیں لگایا، صاحبزادہ نے کہا یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسا موثر اور عجیب و غریب واقعہ نظم کی آرائش سے محروم رہجائے، غرض نظامی نے بادشاہی ارشاد کی تعمیل شروع کی، اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچائی، سالِ اتمام رجب ۵۸۴ھ ہے،

من گفتم و دل جواب می داد	خاریدم، و چشمہ آب می داد

ایں چار ہزار بیت و اکثر | گفتم بہ چہار ماہ کمتر
گر شغل دگر حرام بودے | در چار دہ شب تمام بودے
تاریخ عیاں کہ داشت باخود | ہشتاد و چہار بود و پانصد

نظامی نے اس مثنوی کے صلہ میں بادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحبزادے (۵۸۴ھ) ولیعہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کئے جائیں،

۱۴ رمضان ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرپ[1] ارسلاں علاء الدین آقسنقری کی فرمایش سے ہفت پیکر لکھی، جس میں بہرام گور کا قصہ ہے،

قزل ارسلاں کے مرنے کے بعد، اس کا بھتیجا یعنی محمد بن ایلدکز کا فرزند ارجمند ابوبکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا، نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا، اس وقت تک اُنھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، سلاطینِ وقت کی فرمایش سے لکھی تھیں، لیکن سکندر نامہ اپنی خواہش سے لکھا، اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام سے موسوم کیا، یہ کتاب ۵۹۹ھ میں انجام کو پہنچی، چنانچہ خود سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

بہ پایاں شد ایں داستان دری | بہ فیروز فالی و نیک اختری
ز ہجرت چناں بر دہم یادگار | نود و نہ گزشتہ ز پانصد شمار

کتاب لکھکر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، تو مقررہ رقم کے علاوہ سواری کا گھوڑا بیش قیمت کپڑے، خلعت وغیرہ عطا ہوا،[2]

---

[1] اسکا حال نہ معلوم ہوسکا [2] سکندر نامۂ بحری کے خاتمہ میں یہ تصریح ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

اساتذہ سے میں نے سنا ہے کہ سلاطینِ وقت نظامی کی اسقدر عزت کرتے تھے، کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی، ان کے بیٹے سے بیاہ دی تھی، میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندر نامہ بحری کے خاتمہ سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمد کو، نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا، چنانچہ کہتے ہیں،

دو گوہر برآمد ز دریاے من | فروزندہ از روی شان اے من
یکے عصمتِ مریمے یافتہ | یکے نور عیسیٰ بر و تافتہ
فرستادہ ام ہر دو در از دو شاہ | کہ یاقوت را درج دار د نگاہ
عروسے کہ دور او ز مادر بود | بہ از پردہ دارش برادر بود
ببایدچو آید بر شہریار | چنیں پردگی را چناں پردہ دار
چو منزل خاص تو جا دادہ ام | جگرریز با جان فرستادہ ام

اخیر شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہی،

اس کتاب کی تصنیف کے وقت اُنکی عمر ۶۳ برس کی تھی، چنانچہ جہاں اور حکما، کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم کیا ہی، اپنے نام کی بھی سرخی قائم کی ہی، اسکے ذیل میں لکھتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۹) لیکن تعجب ہی کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہی، اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لئے جائیں تب بھی ایسی رقم ہی جو نہ نظامی کے شایان ہی، نہ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلتی ہی،

نظامی چو این داستان شد تمام | بہ عزم شدن تیز برداشت گام
فزون بود شش ز شصت و سہ سال | کہ بر عزم رہ بر دہل زد دوال

اس کتاب پر انکی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہوا، سال وفات میں سخت اختلاف ہے، دولت شاہ میں ۵۹۶ھ لکھا ہی، لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہی، تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے، جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں، لیکن اس قدر قطعی ہی کہ ۵۹۹ھ کے بعد اُن کی وفات ہوئی ہی اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے،

چونکہ اُنھوں نے تمام عمر گوشۂ عزلت سے قدم نہیں نکالا، نہ لوگوں سے زیادہ ملتے جلتے تھے، اسلئے ان کی زندگی کے حالات و واقعات بہت کم معلوم ہیں، عام تذکرہ نویس، ان کے اس وصف کے نہایت مداح ہیں کہ وہ بادشاہوں کی خوشامد اور دربارداری سے بالکل پاک تھے، البتہ جو سلاطین ان کے ساتھ ارادت و اعتقاد کیساتھ پیش آتے تھے، ان پر بزرگانہ عنایت کرتے تھے، لیکن انکی کتابوں میں سلاطین کی جو مدحیں ہیں ان میں وہی حد سے زیادہ مبالغہ، خوشامد اور تملق ہی جو عام مداحوں کا انداز ہی۔ اس سے بڑھکر یہ کہ جس بادشاہ کا ذکر کرتے ہیں اسطرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہی کہ ان کو اسکے سوا، کسی دربار سے تعلق نہیں، اور وہ اسکو فرمانروائے عالم سمجھتے ہیں، بے شبہ اُنھوں نے مدحیہ قصائد نہیں لکھے لیکن مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں، ملاحظہ ہو،

ولایت ستاں گیتی پناہ | فریدوں کمر بلکہ خاقاں کلاہ

ستارہ کہ بہ چرخ ساید سرش | زدہ سکۂ عبدہٗ بر درش
چو تیر از کمانِ کمیں افگند | سرِ آسماں بر زمیں افگند
فرنگ و فلسطین و رہبان روم | پذیرائے فرمان مہرش چو موم

اس سے زیادہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بادشاہوں کے سامنے اپنے آپکو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں، وہی ہوتی ہے جو گداپیشہ شاعروں کا انداز ہے یعنی حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں، بندۂ درگاہ ہوں، حضور کی ذرا سی توجہ سے میرے سارے کام بنجائیں گے، حضور ہی میری مشکلوں کو حل کر سکتے ہیں،

کلام — پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے، دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں، موشحات اور صنائع کے بیس ہزار شعر تھے، تذکروں میں چند قصائد، قطعات اور غزل کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انہی کی بدولت وجود میں آئیں، لیکن غزلیں پھیکی اور بے مزہ ہیں، ملاحظہ ہو،

خوشا جانے کزو جانے بیاسود | نہ درویشے کہ سلطانے بیاسود
نکوئی بر نکو روئے بماناد | کہ از لبہاش دندانے بیاسود
بہ عمر خود پریشانی مبیناد | دلے کز وے پریشانے بیاسود
مرا گوئی کہ چونی؟ چونم اے دوست | جگر پُر درد دل پر خونم اے دوست
شنیدم عاشقاں اے نوازی | مگر من زاں میاں بیرونم اے دوست

پیش تو کردہ ام عیاں حال تباہ خویش را　　تا تو نصیحتے کنی چشم سیاہ خویش را

سرزنشم مکن کہ تو شیفتہ تر زمن شوی　　گر نگری در آئینہ روے چو ماہ خویش را

ختنی جمالی اے مہ زحبش چہ نام داری　　تو بجز خطے و خالے زحبش کدام داری

حبشی منم بہ درتن ہمہ سوخت است خونم　　ختنی توئی کہ در بر ہمہ سیم خام داری

حبشی است رنگ مویت ختنی است رنگ رویت　　تو میان ایں دو کشور بہ کجا مقام داری

حبشی سفید نہ بود، ختنی نمک نہ دارد　　تو بغایت سفیدی نمکے تمام داری

انہی بوڑھے غمزوں میں، کبھی کبھی بڑے شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں،

بوسہ می خواہم ازاں لب تو چہ می فرمائی　　گر صواب است بگو ورنہ خطاے بکنم

میں لب کا ایک بوسہ چاہتا ہوں کہئے کیا رائے ہے　　مناسب ہو تو بہتر، ورنہ نامناسب ہی کیا جائے

قصیدے بہت ہیں، لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں، سنائی کا انداز ہے، اخلاق اور تصوف کو ترکیب دیکر کہتے ہیں، لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں، اس لیے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ نہایت صاف، شستہ اور پر لطف کہا ہے، جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا،

دوش رفتم بہ خرابات و مرا راہ نبود　　می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود

یا نہ بد ہیچ کس از بادہ فروشاں بیدار　　یا کہ من ہیچ کسم، ہیچ کسم، در نکشود

پاسے از شب بگذشت بیشتر کی یا کمتر　　رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

گفت خیر است! دریں وقت کرا میخواہی　　بے محل آمدنت بر در ما بہر چہ بود

گفتمش در بکشا، گفت برو ہرزہ مگوی — کاندریں وقت کسے بہر کسے در نکشود

این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بکشایند — کہ تو دیر آئی و اندر صف پیش استی زود

این خرابات مغان ست درو زندانند — شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود

ہر چہ در جملۂ آفاق دریںجا حاضر — مومن و برہمن و گبر و نصارا و یہود

گر تو خواہی کہ دم از صحبت ایشان بزنی — خاک پاے ہمہ شو تاکہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہے، لیکن جواب نہ ہو سکا عصمت کا قطعہ یہ ہے،

سرخوش از کوی خرابات گذر کردم دوش — بہ طلب گاری ترسابچۂ بادہ فروش

پیشم آمد بہ سر کوچہ پری رخسارے — کافرے عشوہ گرے زلف چو زنار بدوش

گفتم این کوی چہ کوی ہست ترا خانہ کجاست — اے مہ نو خم ابروی ترا حلقہ بگوش

گفت تسبیح بہ خاک افگن و زنار بہ بند — سنگ بر شیشۂ تقوی زن و پیمانہ بنوش

بعد ازاں پیش من آتا بتو گویم سخنے — راہ بنمایم اگر بر سخنم داری گوش

دیں برافگندہ و مدہوش و دویدم در پیش — تا رسیدم بہ مقامے کہ نہ دیں ماند و نہ ہوش

دیدم از دور گروہے ہمہ دیوانہ و مست — از خم بادۂ عشق آمدہ در جوش و خروش

بے می و مطرب و ساقی ہمہ در عیش و سرور — بے می و جام و صراحی ہمہ در نوشانوش

چوں سر رشتۂ ناموس برفت از دستم — خواستم تا سخنی پرسم ازو گفت خموش

این نہ کعبہ است کہ بے پا و سر آئی بہ طواف — ویں نہ مسجد کہ چنیں بے ادب آئی بخروش

ایں خرابات مغان است درو رندانند — از دمِ صبح ازل تا بقیامت مدہوش

قصیدہ میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا، اور جس قدر مثنویاں لکھیں سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں، تاہم قصیدہ کو انھوں نے مداحی سے آزاد رکھا، اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صنف سے اور بھی مفید کام لئے جا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر کوئی نہ چلا، قصیدے اس وقت سے آج تک خوشامد کی طرز میں ادا کئے جاتے ہیں،

نظامی کی شاعری

نظامی نے شاعری کو جس طرح ترقی دی اور جو باتیں اس میں پیدا کیں ان کو ہم تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے ان سب کو اجمالاً لکھ دینا چاہئے تاکہ یکجائی طور سے سب باتیں پیشِ نظر ہو جائیں، ان کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں،

(۱) جامعیت، یعنی شاعری کی ہر صنف کو انھوں نے ترقی دی،

(۲) زورِ کلام،

(۳) بلاغت

(۴) جدتِ استعارات اور تشبیہات

(۵) ایجاد و اختراع اور قوتِ تخیل،

(۶) اولیات یعنی بہت سی باتیں اول انہی نے ایجاد کیں،

اب ہم ایک ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

جامعیت | ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں وہ خاص خاص انواعِ شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی رزم کا مردمیدان ہی، عشقیہ شاعری میں اسکو کمال نہیں، سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں، لیکن رزم میں پھیکے ہیں، چنانچہ سکندرنامہ کی طرز پر شاطر اصفہانی کی جو حکایت بوستان میں لکھی ہے، اگرچہ اس میں اپنا پورا زور صرف کردیا ہے، لیکن وہ بوڑھاپن نہیں جاتا، ایک مصرع نہایت زور شور کا ہے، دوسرے میں دفعۃً پست ہو جاتے ہیں، خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہی، حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں، بخلاف اس کے **نظامی** نے رزم، بزم، فلسفہ، عشق، اخلاق، سب کچھ لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے، لاجواب لکھا ہے، البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی، لیکن مدح کوئی شاعری نہیں، شاعر بھاٹ نہ ہو تو اسکی شاعری میں کیا نقص ہی،

نظامی کی انواعِ شاعری پر الگ الگ بحث آگے آتی ہی،

اولیات، **نظامی** بہت سی باتوں کے موجد ہیں،

مثلاً سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں، جسکی تقلید اُس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے شعرا کرتے آئے ہیں، چنانچہ اُن کے خمسہ پر تمام اکابر شعرا نے خمسہ لکھا ہے،

مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو اوّل انہی نے مثنوی میں داخل کیا،

سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن اسرار) میں پانچ نعتیں لکھیں اور

ہر ایک کا جدا رنگ ہے،

سب سے پہلے انہی نے فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا،

سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کا خاکہ قائم کیا،

سب سے پہلے انہی نے قصیدہ کو مدح سے پاک کیا،

زور کلام نظامی سے پہلے شعرا کا کلام، صفائی، سادگی، شستگی تک محدود رہا تھا، اور انہی چیزوں کے کمال سے شاعری کے کمال کا اندازہ کیا جاتا تھا، نظامی پہلے شخص ہیں، جس نے ترکیبوں میں چستی اور کلام میں زور، بلندی اور شان و شوکت پیدا کی، عرفی اور ابوالفضل کی نظم و نثر کا زور مشہور ہے، مگر دونوں پر نظامی ہی کا نام ہے، یہانتک کہ طغرا نے کہدیا کہ ابوالفضل نے سکندر نامہ ہی کو لیکر نثر کر دیا ہے،

فردوسی کے زمانہ تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی، چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی، البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا، عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہو جاتی تھیں یہانتک کہ علوم عربیت کے گھر گھر پھیل جانے سے روزمرہ کی زبان بھی وہی مخلوط العربیۃ فارسی ہو گئی، اب عربی الفاظ کا جدا کرنا، فارسی زبان کا بدمزہ اور بے اثر کر دینا تھا، اسلئے نظامی نے اس باب میں فردوسی کی تقلید نہیں کی، بلکہ اسی زبان کو لیا جو ملک اور قوم کی عام زبان تھی، لیکن ان کی نکتہ سنجی یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے جو لفظ انکے ہاں آتے ہیں وہ ہوتے ہیں کہ اس کا ہم معنی کوئی لفظ اس انداز اور شان و شوکت کا تمام زبان میں نہیں ملتا

مل سکتا، یہی بات ہے کہ ان کے کسی مضمون کو جب کوئی شاعر اپنے لفظوں میں ادا کرنا چاہتا ہے، تو وہ شان قائم نہیں رہتی، مثلاً اُن کا یہ شعر کمند کی تعریف میں ہی،

کمند اژدہاے مسلسل شکنج　　دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

سعدی اسی مضمون کو لیکر یوں تصرف کرتے ہیں،

بہ صید ہژبراں پرخاش ساز　　کمند اژدہاے دہن کردہ باز

دونوں کے مضمون اور معنی میں جو فرق ہی، اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن الفاظ کی ساخت اور ترکیب پر غور کرو، کس قدر فرق ہی، مسلسل شکنج، تاراج، گنج، یہ الفاظ، اور انکی پرزور ترکیب، سعدی کے ہاں کہاں ہی،

فردوسی، سعدی اور نظامی کے ہاں جو مضامین مشترک ہیں، اُن کا باہم موازنہ کرو، بلاغت سے قطع نظر، الفاظ کی شکوہ شان اور ترکیبوں کی چستی اور نظم ونسق میں نظامی کا کلام علانیہ ممتاز نظر آئیگا، نمونہ کے لئے ہم صرف دو ایک مثالیں درج کرتے ہیں،

فردوسی خدا کی ذات اور عالم غیر عنصری کے ادراک کی حد سے خارج ہونے کو اس طرح ادا کرتا ہے،

نیابد بدو نیز اندیشہ راہ　　کہ او برتر از نام واز جایگاہ

سخن ہرچہ زیں گوہراں بگذرد　　نیابد بدو راہ جان وخرد

ازیں پردہ برتر سخن گاہ نیست　　بہ ہستیش اندیشہ را راہ نیست

نظامی اسی مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

اساسے کہ در آسمان و زمی است ‌ ‌ ‌ ‌ بہ اندازۂ فکرت آدمی است

شو و فکرت اندازہ را رہنموں ‌ ‌ ‌ ‌ سر از حدِ اندازہ نارد بروں

بہر پایۂ دست چنداں رسد ‌ ‌ ‌ ‌ کہ آں پایہ را حد بہ پایاں رسد

چو پایاں پذیرد حد کائنات ‌ ‌ ‌ ‌ نماند در اندیشہ دیگر جہات

نیندیشد اندیشہ افزوں ازیں ‌ ‌ ‌ ‌ کہ ہستی نہ، بلکہ بیروں ازیں

اسی مضمون کے قریب قریب یہ اشعار ہیں،

چناں برکشیدی و بستی نگار ‌ ‌ ‌ ‌ کہ بہ زاں نیارد خرد در شمار

چناں بستی ایں طاقِ نیلوفری ‌ ‌ ‌ ‌ کہ اندیشہ را نیست زو برتری

چناں آفریدی زمین و زماں ‌ ‌ ‌ ‌ ہماں گردشِ انجم و آسماں

کہ چنداں کہ اندیشہ گردد بلند، ‌ ‌ ‌ ‌ سر از خود بروں ناورد زیں کمند

شاید تمکو خیال ہو کہ فردوسی کے بہت سے الفاظ، اب نامانوس ہیں، نظامی ان کے بجائے متداول الفاظ لاتے ہیں، اس کے سوا نظامی کو یہ موقع حاصل ہو کہ جہاں فارسی الفاظ سے شان و شکوہ نہ پیدا ہو سکے، وہاں عربی الفاظ سے کام لیں، فردوسی اپنے التزام کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، نظامی جہاں خود فردوسی کی بولی بولتے ہیں، وہاں بھی یہ فرق قائم رہتا ہے، عناصر کی ابتدا اور ان کی ترکیب کو دونوں نے لکھا ہو اور خالص سادہ فارسی میں لکھا ہو، فردوسی

از آغاز باید کہ دانی درست ‌ ‌ ‌ ‌ سرمایۂ گوہراں از نخست

یکے آتشے برشدہ تابناک — میان باد وآب از بر تیرہ خاک
نخستین کہ آتش زجنبش دمید — زگرمیش پس خشکی آمد پدید
وزاں پس ز آرام سردی نمود — زسردی ہماں باز تری فزود
چو ایں چار گوہر بجائے آمدند — زبہر سپنجی سرائے آمدند
گہر ہا یک اندر دگر ساختہ — زہر گونہ گردن برافراختہ

یعنی عناصر (گوہر) کی ابتدا یوں ہوئی کہ پہلے آگ بلندی پر پیدا ہوئی، اسکے پیچھے ہوا، پھر پانی، پھر خاک، آگ حرکت سے پیدا ہوئی، اسکی حرارت کی وجہ سے یبوست پیدا ہوئی، پھر سکون کی وجہ سے برودت کا وجود ہوا، برودت نے رطوبت پیدا کی، یہ عناصر باہم ترکیب پاکر عالم بنا، **نظامی**

زگشت سپہر آتش آمد پدید — کہ آتش بہ نیروی گرمش دمید
زنیروے آتش ہواے کشاد — کہ مانند او گرم دارد نہاد
بہ باڈے گرانیدہ شد گوہرش — کہ گردندگی دور بود از برش
چکید از ہوا ترشے در مغاک — پدید آمد آبے چناں نغز و پاک
چو ہر چار گوہر بہ امر خدا — گرفتند بر مرکز خویش جائے
مزاج ہمہ در ہم آمیختند — وز و رستنیہا بر انگیختند

ان اشعار میں امر، مرکز، مزاج کے سوا باقی تمام الفاظ فارسی ہیں، لیکن فردوسی کے الفاظ اور ترکیب الفاظ میں وہ بلندی اور شان نہیں جو نظامی کے ہاں ہی، گشت سپہر، نیرو،

نہاد، گرایندہ گروندگی، مغاک، مغز، ان الفاظ اور ان کی حسنِ ترکیب نے جو بات پیدا کی مذاقِ صحیح اس کا اندازہ کر سکتا ہے،

اسی مضمون کو ایک اور جگہ لکھا ہے،

نختیں طلسمے کہ پرداختند | زمیں بود و ترکیب ازو ساختند
چو نیروی جنبش ورد کرد کار | با فسردگی زود آمد بخار
ازو ہرچہ رخشندہ و پاک بود | سزاوار اجرام افلاک بود
دگر بخشہا کاں بلندی نداشت | بہر مرکزے مایہ می گذاشت
یکے بخش ازو آتشِ روشن است | کہ بالاتریں طاقِ ایں گلشن است
دگر بخش ازو باد جنبندہ خواست | کہ تا او نہ جنبد ندانند کواست
سوم بخش ازو آبِ راوق پذیر | کہ ہستش ز راوق گری ناگزیر

ان اشعار میں اکثر فلسفیانہ اصطلاحات کو عربی کے بجاے فارسی میں ادا کیا ہے، مثلاً

عربی	فارسی	عربی	فارسی
قوتِ حرکۃ	نیروی جنبش	قسر	افسردگی
نوع	بخش	مادہ	مایہ
متحرک بالطبع	جنبندہ خو	سیال	راوق پذیر

نظامی کے اشعار کا سعدی سے مقابلہ کرو، تو یہ فرق اور واضح ہو جاتا ہے، مثلاً نظامی انقلاباتِ زمانہ اور واقعاتِ عالم کی عبرت انگیزی کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

فلک بر بلندی، زمیں بر مغاک
یکے طشت خوں شد، یکے طشت خاک

نوشتہ بریں ہر دو آلودہ طشت
زخونِ سیاوش بسے سرنوشت

سعدی اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں،

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک
بگوش آمدم نالۂ دردناک،

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر
کہ چشم و بناگوش و روی است و سر

جوانی شد و زندگانی نماند
جہاں گو مماں چوں جوانی نماند

عہدِ شباب کی حسرت کو دونوں نے لکھا ہے، نظامی کہتے ہیں،

چو باد خزانی در افتد بہ باغ
زمانہ دہد جاے بلبل بہ زاغ

بود برگ ریزاں چو شاخِ بلند
دلِ باغباناں شود دردمند

بنال اے کہن بلبلِ سال خورد
کہ رخسارۂ سرخ گل گشت زرد

دوتا شد سہی سروِ آراستہ
کہ دیور شد از باغ برخاستہ

فرو ماند دستم زمے خواستن
گراں گشت پایم ز برخاستن

تنم گونۂ لاجوردی گرفت
گلم سرخی انداخت زردی گرفت

ہیوں روندہ زرہ ماند باز
ببالیں گہ آمد سرم را نیاز

سعدی لکھتے ہیں،

چو باد صبا بر گلستاں وزد
چمیدن درخت جواں را سزد

نہ زیبد مرا با جواناں چمید،
کہ بر عارضم صبح پیری دمید

شمارست نوبت بریں خواں نشست | کہ ما از تنعم بشستیم دست
گل سرخ رویم، نگر زرناب | فرورفت چوں زرد شد آفتاب
گلستانِ مارا طراوت گذشت | کہ گلدستہ بند د چو پژمردہ گشت

قوت تخیل | شاعری کے تمام نازک اور مشکل مقامات میں ان کی جدت اور اختراع کی عجیب و غریب صناعیاں نظر آتی ہیں، قصہ کے خاکے کھینچنے میں، ترتیبِ واقعات میں تمہید میں، واقعہ نگاری میں، بندشِ مضامین میں، تشبیہات میں، استعارات میں، مبالغوں میں ہر جگہ نیا انداز نظر آتا ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُنکی قوتِ تخیل (امیجنیشن) کس قدر قوی اور زبردست ہے،

بادشاہ کی مدح لکھتے ہیں، اور یہ تمہید اُٹھاتے ہیں،

علم برکش اے آفتاب بلند | خراماں شو اے ابر مشکیں پرند
بنال اے دلِ رعد چوں کوسِ شاہ | بخند اے لب برق چوں صبحگاہ
ببار اے ہوا، قطرۂ ناب را | بگیر اے صدف در کن آں آب را
برآ اے دُر از قعر دریاے خویش | بہ تاجِ سرِ شاہ کن جاے خویش

قدیم خیال یہ تھا کہ آفتاب کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں، اس سے بادل پیدا ہوتے ہیں، بادل برستا ہے، تو سیپ کے منہ میں جو قطرے پڑتے ہیں، موتی بنجاتے ہیں، ان خیالات کی بنا پر نظامی کہتے ہیں،

او آفتاب، علم اُٹھا، او سیہ پوش بادل، آہستہ آہستہ چل،

اور رعد نقارۂ شاہی کی طرح کڑک، اور بجلی صبح کی طرح ہنس، اور ہوا قطرے برسا اور سیپ قطرہ کو لیکر موتی بنا، اور موتی دریا کی تہ سے نکل، اور نکل کر بادشاہ کے تاج پر جگہ لے،

بات اتنی تھی کہ بادشاہ کا تاج جواہر نگار ہے لیکن شاعر کو قوتِ تخیل کے ذریعہ سے یہی بات اس صورت میں نظر آتی ہے کہ عالم کا تمام کاروبار صرف بادشاہ کی اوج وشان بڑھانے کے لئے ہے، اسکی قوتِ خیالیہ اس سے بھی آگے بڑھتی ہے، ممدوح کے بل پر اسکو تمام عالم اپنا محکوم نظر آتا ہے، اور وہ تحکمانہ انداز سے آفتاب، بادل، رعد برق اور ہوا کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اپنے کام انجام دیکر موتی تیار کرو، تاکہ بادشاہ کے تاج پر ٹانکے جائیں، اس کے ساتھ انداز بیان کے زور الفاظ کی شوکت ابندش کی درو بست کو دیکھو کہ طلسم کا عالم نظر آتا ہے، پھر خیال کرو کہ ایک ایک مختلف حالت کو کس طرح صرف ایک ایک مصرع میں کھپا دیا ہے،

مثال ۲ - سکندر نامہ میں متعدد جگہ آفتاب کے غروب اور طلوع کو بیان واقعہ کی حیثیت سے لکھا ہے لیکن ہر جگہ ایک نیا پیرایہ قائم کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں،

چو یاقوت خورشید را دزد برد	بہ یاقوت جستن جہاں پے فشرد
بہ دزدی گرفتند مہتاب را	کہ ایں بردآں گوہر ناب را

یعنی جب آفتاب کا یاقوت چوری گیا تو زمانہ نے یاقوت کے ڈھونڈھنے کیلئے دوڑ دھوپ شروع کی، آخر چاند کو جا کر پکڑا کہ اُس نے یہ جوہر چرایا ہے، چونکہ آفتاب کے غروب کے

بعد چاند نکلتا ہے، اس لئے اسکو چور قرار دیا،

کہ چوں آتش روز روشن گزشت	بر از دود شد گنبد تیز گشت
شب از ماہ بربست پیرایہ	شگفتے بود نور در سایہ،

یعنی جب دن کی آگ بجھ گئی تو دھواں اُٹھا (یعنی رات) اور گنبد (آسمان) میں بھر گیا، راتنے چاند کا زیور پہنا، لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ سایہ میں نور نظر آتا ہی،

دگر روز کیں ساقیِ صبح خیز	زمی کرد بر خاک، یا قوت ریز
چو خورشید بر زد سر از گنج نیل	فرو شست گردوں قبار از نیل (یعنی دھوپ)
چو در برقع کوہ رفت آفتاب	سر روز روشن، فرو شد بخواب
شب تیرہ چوں اژدہاے سیاہ	زماہی بر آورد سر سوے ماہ
سیہ کرد بر شبروان راہ را	فرو برد چوں اژدہا ماہ را
سپاہ سحر چوں علم بر کشید	جہاں، حرف شب اقلم در کشید
چو سلطانِ شب، چتر بر سر گرفت	سواد جہاں راہ عنبر گرفت
ستارہ چناں گنجے از زر فشاند	کہ ہمد زمیں گاؤ بر گنج راند
کہ چوں شاہ چین صبح را بار داد	عروس عدن در بہ دینار داد
چو شب در سر آورد کحلے پرند	سر مہ درآمد بہ مشکیں کمند (رات، ستارہ، آفتاب)

استعارات اور تشبیہات نظامی کی خصوصیاتِ شاعری میں نہایت نمایاں خصوصیت استعارات اور تشبیہات کی جدت ہے، استعارہ اور تشبیہ اگر صرف حسنِ کلام اور تفنن

طبع کے کام آئے تو وہ کوئی بڑی چیز نہیں، لیکن بعض استعارے یا تشبیہات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر اصل مضمون پر پڑتا ہے یعنی مضمون کا زور بڑھ جاتا ہے، جو بات صفحوں میں ادا ہو سکتی ہے، ایک لفظ سے ادا ہو جاتی ہی، صورتِ واقعہ کی تصویر اسطرح سامنے آجاتی ہے، کہ کسی اور طرح سے نہیں آسکتی تھی، اس قسم کے استعارات اور تشبیہیں اور شعرا کے ہاں بہت کم پائی جاتی ہیں، لیکن نظامی کا کلام ان سے بھرا پڑا ہی، مثلاً دارا جب زخم کھا کر گرا ہی اس موقع پر اس واقعہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

نسب نامۂ دولتِ کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

دارا سلسلۂ کیانی کا اخیر فرماں روا تھا، اور اس کے مرنے سے گویا، اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ مٹ گئی، اس مضمون کو تشبیہ نے کس قدر موثر اور بلند کر دیا، دارا کو خاندان کیانی کا نسب نامہ کہا، یعنی جس طرح نسب نامہ میں تمام خاندان کے نام درج ہوتے ہیں دارا کا وجود گویا تمام خاندان کا وجود ہے، اور اس کے دیکھنے سے کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس سب کی مجموعی عظمت و شوکت آنکھوں میں پھر جاتی ہی، پھر اس کے مرنے کو یوں بیان کیا کہ نسب نامۂ کیانی کا ایک ایک ورق اڑ گیا، اسی مضمون کو ایک اور تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کیا ہی،

بہار فریدون و گلزار جم زباد خزاں گشت تاراجِ غم

سکندر نے جب دارا کی سسکتی لاش کو اپنے زانو پر رکھ لیا ہی، اس موقع پر کہتے ہیں،

سر خستہ را بر سر ران نہاد شبِ تیرہ بر روز رخشاں نہاد

سکندر نے جب دارا کو گستاخانہ جواب لکھا ہی تو دارا کہتا ہی،

ازاں ابر عاصی چناں ریزم آب	کہ نارو دگر دست بر آفتاب
اس سرکش بادل کو اسطرح نچوڑ دونگا	کہ پھر آفتاب پر ہاتھ نہ بڑھا سکے

سکندر نے جب ایک حبشی سردار پر حملہ کیا ہو تو حملہ کی تیزی اور زور کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بہ کبک دری چوں؟ درآید عقاب	چگونہ؟ جہد بر زمیں آفتاب
ازاں تیز تر خسرو پیلتن	بہ تندی درآمد بہ آں اہرمن

آفتاب سورج کو بھی کہتے ہیں، اور دھوپ کو بھی اس موقع پر بلاغت کے انداز کو دیکھو تشبیہ سے ابتدا نہیں کی، بلکہ مخاطب سے کہتے ہیں، کہ تم کو خیال ہو کہ عقاب چکور پر کیونکر گرتا ہی دھوپ کس طرح زمین پر دفعۃً چھا جاتی ہے؟ اس سے مقصد یہ ہو کہ پہلے مخاطب کے ذہن میں اچھی طرح یہ سماں قائم ہوجائے، پھر کہتے ہیں "اس سے بھی زیادہ تیزی اور زور کے ساتھ سکندر نے اس دیو پر حملہ کیا" حملہ کی خاص حالت سے قطع نظر کرکے سکندر کو آفتاب اور حریف کو زمین سے تشبیہ دینا، یوں بھی موزوں تھا، تشبیہ مرکب نے اس لطف کو اور دوبالا کر دیا،

سکندر نے جب ایک روسی پہلوان پر کمند پھینکی ہے، اس موقع پر کہتے ہیں،

کمند عدو بند را شہریار	بینداخت چوں چنبر روزگار

کنایہ تھا کہ سکندر نے اس طرح کمند پھینکی کہ حریف کسی طرح اس سے بچ نہیں سکتا تھا، اس مضمون کو چنبر روزگار کی تشبیہ نے کس قدر پرزور کر دیا،

رسول اللہ صلعم نے جب خسرو پرویز کو خط لکھا ہے تو خط میں عرب کی رسم کے مطابق اپنا نام خسرو کے نام سے پہلے لکھا تھا، خسرو نے خط کھولا تو چونکہ ایران میں بادشاہ کا نام عموماً تمام تحریروں میں پیشانی پر لکھا جاتا تھا، رسول اللہ صلعم کا نام سرنامہ پر دیکھکر خسرو سخت جھلا اٹھا، اور خط کو پرزے پرزے کرکے پھینکدیا، اس موقع کو نظامی نے شیریں خسرو میں جہاں لکھا ہی خسرو کی جھلاہٹ اور برہمی کو اس طرح تشبیہ کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں،

چوں عنواں گاہ عالم تاب را دید | تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید

دیوانہ کتا جب کسی کو کاٹ کھاتا ہی، تو سگ گزیدہ پانی کو دیکھکر بڑے زور سے جھجکتا ہی،

اب تشبیہ کے تمام اجزا پر خیال کرو، رسول اللہ صلعم کا خط آب شیریں ہی، خسرو نے چونکہ رسول اللہ صلعم کے خط سے بے ادبی کی ہی، اسلئے شاعر اسکو سگ نجس سمجھتا ہے، فوری اور شدت کی جھلاہٹ، سگ گزیدہ کی اس مخصوص حالت سے بڑھکر نہیں ہوسکتی، ان سب باتوں کو پیش نظر رکھو، تو نظر آئیگا، کہ یہ مضمون جس طرح اس تشبیہ سے ادا ہوسکتا تھا اور کسی طرح ادا نہیں ہوسکتا تھا،

قدمار اور متاخرین کی خصوصیات جدا جدا ہیں اور اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ گو قدمار کی متانت، پختگی، جزالت کے مقابلہ میں متاخرین کا کلام سبک معلوم ہوتا ہی، تاہم متاخرین کی بعض بعض خصوصیتیں اس قابل ہیں کہ اُن پر رشک کیا جائے، ان میں ایک تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی نزاکت ہے، قدمار آس پاس کی چیزوں سے

سادہ سادہ تشبیہیں پیدا کرتے تھے، استعارے بھی سادے اور سہل الماخذ ہوتے تھے، لیکن متاخرین کے زمانہ میں تمدن بہت ترقی کر گیا تھا، اسلئے انسانی احساسات نازک اور لطیف ہو گئے تھے، اس بنا پر اب قدما کی تشبیہیں بے مزہ ہو گئی تھیں اس کو مادیات کے ذریعہ سے یوں سمجھو کہ جب کسی قوم کا تمدن، ابتدائی حالت میں ہوتا ہے تو وہ نہایت تیز اور کرخت خوشبو کو پسند کرتی ہے، اور کم درجہ کی خوشبو کو اس کا دماغ اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتا، یہی سبب ہے کہ عرب مشک اور عنبر اور ہندو تلسی اور ناز بو کی خوشبو پسند کرتے تھے، لیکن آج چونکہ ہر چیز میں لطافت پیدا ہو گئی ہے، مشک اور تلسی کی خوشبو سے بعض وقت دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے، اب گلاب اور کیوڑہ کا عطر درکار ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھکر انگریزی عطر محبوب ہے، جو اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ عام آدمیوں کو اسکی خوشبو محسوس بھی نہیں ہوتی، استعارہ اور تشبیہ کا بھی یہی حال ہے استعارہ اور تشبیہ کی یہ لطافت، متاخرین کا خاصہ ہے، مثلاً قدما معشوق کے چہرہ کو آفتاب سے اور اسکی ہنسی کو خندۂ صبح سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن متاخرین کے مذاق میں ایک شاعر کہتا ہے، ع صبح ز خورشید رخت خندۂ،

یعنی معشوق کا چہرہ ہنسا تو صبح پیدا ہو گئی، یعنی صبح خود معشوق کی ہنسی کا نام ہے،

استعارہ اور تشبیہ کی اس لطافت اور نزاکت کے موجد نظامی ہیں، انھوں نے اس کثرت سے نازک اور لطیف استعارے اور تشبیہیں پیدا کیں، کہ متاخرین میں سے بھی کسی ایک شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں،

بہ باغ شعلہ در، دہقان انگشت　　　بنفشہ می درو د لالہ می کشت

کہنا یہ تھا کہ انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا اور آگ بھڑکتی جاتی تھی، اسکو اس طرح ادا کیا کہ انگیٹھی کا دہقاں، شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا، اور لالہ بوتا جاتا تھا،

در آمد نقشبند مانوی دست　　　زمیں را نقشہا بوسہ می بست

کہنا یہ تھا کہ مصور جب دربار میں آیا، تو آداب دربار کے موافق زمین بوس کرتا آتا تھا، اسکو اس طرح یہ ادا کیا کہ مصور بوسوں سے نقش و نگار کرتا آتا تھا،

بہ نوشیں لب آں جام را نوش کرد　　　ز لب جام را حلقہ در گوش کرد

پیالہ پینے کے وقت لب کی جو ہیئت پیدا ہوتی ہے اسکو حلقہ سے تشبیہ دی ہی، اور اس بنا پر پیالہ کو لب کا حلقہ بگوش قرار دیا ہے،

ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ　　　زمرد را بہ مروارید بستہ

شبنم کو موتی سے، اور سبزہ کو زمرد سے تشبیہ دی ہی، اس بنا پر کہتا ہے کہ ہوا نے سبزہ پر جو موتی بکھیر دیئے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ زمرد میں موتی ٹانک دیئے ہیں،

ز گیسو گہ کمر گہ کرد و گہ تاج　　　بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

معشوقہ جو زلفوں کا کبھی جوڑا باندھتی تھی اور کبھی کمر پر چھوڑ دیتی تھی، اسکو تاج و کمر سے تشبیہ دی ہے،

قلم کی تعریف، ع　مشک در جیب لعل در داماں،

عاشق و معشوق کا ہمکنار ہونا،

شبا روزے دگر خفتند مدہوش بنفشہ در سر و نسریں در آغوش

نوشابہ کا جواب دینا،

بہ پاسخ نمودن زنِ ہوشمند ز یاقوت سربستہ بکشاد بند

ازاں سیمگوں سکۂ نو بہار درم ریز کن بر لبِ جوبار

آغازِ بہار میں جو شگوفے کھلتے ہیں، انکو بہار کا سکہ قرار دیا ہے،

ز باریدن ابر کافور بار سمن رستہ از دستہاے چنار

یعنی چنار کے پتوں پر جو برف گرتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ چنار کے ہاتھوں پر چنبیلی کے پھول کھلے ہیں،

سمنبر غافل از نظارۂ شاہ کہ سنبل بستہ بد بر نرگسش راہ

یہ اُس وقت کا بیان ہے کہ شیریں نہا رہی تھی، اور زلفوں کو چہرہ پر چھوڑ دیا تھا، شعر کا مطلب یہ ہے کہ شیریں کو خسرو کے نظارہ کی خبر نہ تھی، کیونکہ سنبل نے نرگس کا راستہ روک رکھا تھا،

کشادہ طاقِ ابرو تا سر دوش کشیدہ طوقِ غبغب تا بنا گوش

خواب نرگس، خمار دیدۂ او نازِ نسریں، درم خریدۂ او

چو بر فرق آبے انداخت از دست فلک بر ماہ مروارید می بست

سمن ساقی و نرگس جام بر دست بنفشہ در خمار و سرخ گل مست

بنفشہ تابِ زلف افگندہ بر دوش کشادہ باد نسریں را بنا گوش

گونہ گونہ گلے شگفتہ درو　　سبزہ بیدار آب خفتہ درو

بعض اوقات تشبیہ سے ہیبت اور عظمت مقصود ہوتی ہے، اس قسم کی تشبیہات آج تک کسی نے نظامی سے بڑھکر بلکہ ان کے برابر بھی نہیں پیدا کیں، مثلاً

کمند از دہاے مسلسل شکنج　　دہن بازکردہ بہ تاراج گنج

زمیں کو بساطے بد آراستہ　　غبارے شد از جاے برخاستہ

دراں دجلہ خوں بلند آفتاب　　چو نیلوفر، افگند زورق در آب

ز شمشیر برگشتہ جاے بنود　　کہ در غار وے اژدہاے نبود

زخم کو غار اور تلوار کو اژدہا سے تشبیہ دی ہے،

اے مدنی برقع و مکی نقاب　　سایہ نشیں چند بود آفتاب

تاج تو و تخت تو دارد جہاں　　تخت زمیں آمد و تاج آسماں

ز بس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک　　چو گوگرد سرخ آتشیں گشت خاک

نہنگ خدنگ، از کمین کماں　　نیاسود بر یک زمیں یک زماں

شاعری کی لطافت اور رنگینی کا ایک بڑا راز یہ ہے کہ بے جان چیزوں کو صاحب ادراک قرار دے کر اُن کی نسبت ارادی کام منسوب کئے جائیں، مثلاً عرفی کہتا ہے،

نہ گفت و من نشنودم، ہر آنچہ گفتن داشت　　کہ در بیاں نگہش کرد بر زباں تقدیم

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت　　فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم،

یعنی اس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں، اسکی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی، جب ہونٹوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا، یا مثلاً

راضیم ازنکہ شوق کہ گوید ہمہ باز | ازز باں انچہ دم عرض تمنا ماند

متاخرین نے اس طرز کو نہایت وسعت دی، اور اس سے نہایت لطیف اور رنگین نئے نئے اسلوب پیدا کئے، لیکن اس طرز کے موجد نظامی ہیں، شیریں خسرو میں لکھتے ہیں،

نہاں باد شاہ می گفت آں بنا گوش | کہ مولاے توام، ہا، حلقہ در گوش

چو سر پیچید گیسو مجلس آراست | چو رخ گردید گردن عذر ہا خواست

بگویم غمزہ را تا وقت شبگیر | سمندش را برقص آرد بیک تیر

بگویم زلف را تا یک فن آرد | شکیبش را رسن در گردن آرد

نظامی کے یہ مضامین، متاخرین کے شمع راہ بنے، جس کی روشنی میں انکو گوناگوں اسالیب کا سلسلہ ہات آگیا، نظامی نے جب (پہلے شعر میں) بنا گوش کی نسبت یہ باندھا، کہ اسی نے چپکے سے بادشاہ سے کہا، تو بے تکلف ایک شاعر اسکو یوں بدل کر کہہ سکتا ہے،

ع زلف او خم شدہ در گوش سخن می گوید

شعر کے سینکڑوں انواع ہیں، لیکن بڑی قسمیں یہ ہیں، رزمیہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی، جذبات انسانی کا اظہار اور مناظر کی تصویر، ان میں سے ہر نوع کو نظامی نے لیا ہے اور

معراجِ ترقی تک پہنچا دیا ہے،

سکندر نامہ میں انھوں نے لکھا ہی کہ سکندر کے حالات تین حیثیتیں رکھتے ہیں، سلطنت، نبوت، فلسفہ وحکمت، میں تینوں قسم کے حالات لکھونگا، اور تفصیل سے لکھونگا،

گروہیش خوانند صاحب سریر | ولایت ستاں بلکہ آفاق گیر
گروہے ز دیوان دستور او | بہ حکمت نوشتند منشور او
گروہے زپاکی و دیں پروری | پذیرا شدندش بہ پیغمبری
من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند | درختے برومند خواہم نشاند

چنانچہ سکندر نامہ بری میں کشورستانی اور سکندر نامہ بحری میں پیغمبری کے واقعات اور فلسفیانہ بحثیں ہیں،

فارسی میں فلسفیانہ مسائل ناصر خسرو کے سوا کسی نے ادا نہیں کئے، لیکن ناصر خسرو نے تمام اصطلاحیں وہی عربی کی قائم رکھی ہیں، اس بنا پر عام خیال یہ ہے کہ فارسی میں فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، بوعلی سینا کی کتاب حکمت علائیہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ نظامی نے فلسفیانہ مسائل اس حد تک لکھ دیے ہیں کہ زبان کی کم مایگی کی شکایت نہیں ہو سکتی، اور اگر متاخرین بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بنگئی ہوتی،

سکندر نامۂ بحری میں انھوں نے ایک خاص داستان سکندر اور حکماے یونان کی فلسفیانہ بحثوں کے متعلق لکھی ہی، اس میں ارسطو، فلاطون، والیس، بلیناس، سقراط،

فرفوریوس (یارفیریس) ہرمس کے اقوال اور رائیں لکھی ہیں، ہندوستان کے ایک حکیم نے سکندر سے سوالات کئے تھے، سکندر کی زبان سے اُن کے جوابات لکھے ہیں، ان تمام بحثوں میں فلسفہ کی اصطلاحیں فارسی میں ادا کی ہیں، عربی الفاظ جا بجا آتے ہیں، لیکن اس حد تک کہ زبان نامانوس اور دسا تیر و ژند نہ بنجائے

ایک ہندو حکیم نے سکندر سے سوال کیا تھا کہ نظر بد کیا چیز ہے؟ اہمیں کہاں سے تاثیر پیدا ہوتی ہے؟ عام قاعدہ یہ ہے کہ کسی چیز کو پسند کیا جائے تو اس کی ترقی کا سبب ہوتا ہے بخلاف اس کے بد نظر جس چیز کو پسند کرتا ہے، اسی کو نظر لگتی ہے، سکندر نے جواب دیا کہ انسان جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو آنکھ سے شعاعیں نکل کر اس چیز پر پڑتی ہیں، شعاع ہوا سے گذر کر اس چیز تک پہنچتی ہے، اب ہوا میں اگر سمیت ہے تو یہ شعاعیں بھی اس سے آلودہ ہو کر زہریلی ہو جاتی ہیں اور اس چیز کو جا کر نقصان پہنچاتی ہیں،

اس سے قطع نظر کر کے کہ سوال و جواب دونوں طفلانہ ہیں، یہ دیکھو کہ نظامی ان باتوں کو کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

دگر بار ہندو در آمد بہ گفت گہر کرد با نوک الماس جفت

کہ بر چشم بد شاہئے دہ مرا ز چشم بد آگاہئے دہ مرا

چہ نیروست، در جنبش چشم بد کہ نیکوی خود را کند چشم زد

ہمہ چیز را کاز مایش رسید چو دیدہ پسندد، فزایش رسید

جز او را کہ ہر چہ پسند آورد | سر و گردنش زیر بند آورد
ہر حرفے چونکہ دیدیم ژرف | درستی ندیدیم در ہیچ حرف
ہمیں یک کماندار شد از نخست | بر آماج گہ تیر او شد درست
بگو تا چہ پیروست نیرو ے او |
جہاندار گفتا کہ طابع شناس | چنیں آرد از روی معنی قیاس
کہ بر ہر چہ گردد نظر جا ئگیر | گذر بر ہوا ے کند ناگزیر
بر آں چیز کار د نظر تاختن | کند با ہوا رای دم ساختن
بنہ چوں در آرد بہ آں رخنت گاہ | ہوا نیز یابد بر آں رخنہ راہ
ہوا گر ہوا ے بود سودمند | در ارکان آں چیز ناید گزند
مزاج ہوا گر بود زہرناک | بیند از د آں چیز را در مغاک
ہوا ے بدست آں کہ در چشم زد | بدارد بہ ہمرا ہئے چشم بد

موجودات کی ابتدا، اور انکی ترتیب، افلاک، عناصر، سلسلۂ علل، ان تمام بحثوں کے متعلق، یونانی حکمار کی رائیں نقل کی ہیں، اور ان تمام مباحث میں بہت کم عربی کے الفاظ کو دخل دیا ہے،

اخلاقی شاعری | نظامی کی شاعری کا بڑا حصہ اخلاق کے متعلق ہی، مخزن اسرار کے سوا جو خاص اسی مضمون پر لکھی ہی، اور مثنویوں میں بھی جا بجا اخلاقی ہدایتیں موقع بموقع لکھی ہیں، چنانچہ کسی صاحب ذوق نے خاص اس قسم کے اشعار کو اُن کے پنج گنج

سے چن کر یکجا جمع کر دیا ہے اور اخلاق کے ۳۵ عنوان قرار دیکر ایک ایک عنوان کے
نیچے تمام مثنویوں کے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں، جو اس عنوان سے تعلق رکھتے تھے میں نے
اس مجموعہ کا ایک نہایت خوشخط نسخہ، عالمگیری کتب خانے کا حیدرآباد میں دیکھا تھا

جذبات انسانی

شاعری کی اس اہم اور لطیف نوع کو نظامی نے جس رتبہ پر پہنچایا، قدما
میں فردوسی کے سوا اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اور انصاف یہ ہے کہ فردوسی بھی اس
خصوصیت میں اُن کی ہمسری نہیں کر سکتا، فردوسی نے جہاں جذبات کا اظہار کیا ہی
معمولی اور سادہ حالت کو ادا کیا ہی، بخلاف اس کے نظامی نہایت نازک لطیف
اور دقیق پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، مثلاً دارا جب زخمی ہو کر گرا ہی تو سکندر اس کے
پاس گیا ہے، اور دارا نے اس سے حسرت ناک باتیں کی ہیں، فردوسی نے اس موقع
پر وہی معمولی افسوس اور عبرت کے کلمات ادا کر دیئے ہیں، جو ہر شخص کے خیال
میں آسکتے ہیں، لیکن نظامی کی نظر ان نازک اور دقیق نکتوں تک پہنچی ہی، جہاں ہر شخص کا
وہم رسائی نہیں پا سکتا، دارا کوئی معمولی آدمی نہ تھا، بلکہ دنیا کے وسیع خطہ کا شاہ اور
شاہنشاہ تھا، شکست کھانے اور خود اپنے نوکروں کے ہات سے زخمی ہو کر مرنے کا
سکو صدمہ ہی، اور اس وجہ سے افسوس، حسرت اور بیکسی کے خیالات اسکے دل میں ہجوم کرتے
ہیں، لیکن ساتھ ہی شاہنشاہانہ ادعا، غرور اور تمکنت کا نشہ بھی سر میں ہی، اسلئے اسکے
غمزدہ اور عاجزانہ الفاظ بھی صولت اور رعب کے لہجہ میں ادا ہوتے ہیں، اسکی آہیں
بھی نعرۂ جنگ ہیں، اسکی پر حسرت نگاہیں بھی برق غضب ہیں، نظامی ان تمام

خصوصیات کو دکھاتے ہیں

چو در موکبِ قلبِ دارا رسید زموکب درآں ہیچ کس را ندید

تنِ مرزباں دید در خاک و خوں کلاہِ کیانی شدہ سرنگوں

بہ بازوے بہمن برآسودہ مار زروئیں دژ افتادہ اسفندیار

بہارِ فریدوں و گلزارِ جم زبادِ خزاں گشتہ تاراجِ غم

نسب نامۂ دولتِ کیقباد ورق بر ورق ہر سوے بردہ باد

سکندر فرود آمد از پشتِ بور درآمد بہ بالینِ آں پیل زور

بہ بالیں گہِ خستہ آمد فراز زدرعِ کیانی گرہ کرد باز

سرِ خستہ را بر سرِ راں نہاد شبِ تیرہ بر روزِ رخشاں نہاد

چو دارا بروئش نگہ کرد و دید بہ سوزِ جگر آہ از دل کشید

چنیں داد دارا بہ خسرو جواب کہ بگذار تا سر نہم من بہ خواب

رہا کن کہ در من رہائی نماند چراغِ مرا روشنائی نماند

سپہرم بداں گونہ پہلو درید کہ شد در جگر پہلوم ناپدید

رہا کن کہ خوابِ خوشم مے برد زمیں آب و چرخ آتشم مے برد

سرِ سروراں را رہا کن ز دست تو مشکن کہ مارا جہاں خود شکست

چو من زیں ولایت کشادم کمر تو خواہ افسر از من ستاں خواہ سر

اگر تاج خواہی ربود از سرم یکے لحظہ بگذار تا بگذرم

مبیں سرو را در سرافگندگی   چناں شاہ را و چنیں بندگی

دریں بندم از زحمت آزاد کن   بہ آمرزش ایزدی یاد کن

چو گشت آفتاب مرا روی زرد   نقابے بمن درکش از لاجورد

مگرداں سر خفتہ را از سریر   کہ گرد و نِ گرداں برآرد نفیر

تو اے پہلواں کامدی سوے من   نگہدار پہلو ز پہلوے من

کہ با آں کہ پہلو دریدم چو میغ   ہمے آید از پہلوم بوے تیغ

چہ دستے کہ با مادر ازی کنی   بہ تاجِ کیاں دستبازی کنی،

نگہدار دستت کہ دارا ست ایں   نہ پنہاں چو روز آشکاراست ایں

زہیں راہنم تاج تارک نشیں   مجنباں مرا تا نہ جنبد زمیں

اس واقعہ کو فردوسی نے بھی لکھا ہے، لیکن زور اور اثر نہیں، چنانچہ اس موقع کے اشعار ہم درج کرتے ہیں،

برآنم کہ از پاک دادار خویش   بیابی تو پاداشِ گفتارِ خویش

یکے آنکہ گفتی کہ ایراں تراست   سر تاج و تختِ دلیراں تراست

بمن مرگ نزدیک تر زانکہ تخت   بپرداخت تخت از نگوں گشتہ بخت

برین است فرجام چرخِ بلند   خرامش ہمہ رنج و سردش گزند

بمردی نگر تا نگوئی کہ من،   فزونم ازیں نامدار انجمن

بد و نیک، ہر دو ز یزداں شناس   وزو دار تا زندہ باشی سپاس

نمودارِ گفتار من، من بسم — بریں داستان عبرتِ ہر کسم

کہ چنداں بزرگی و شاہی و گنج — مرا بود واز من بند کس برنج

ہماں نیز چنداں سلیح و سپاہ — گراں مایہ اسپان و تخت و کلاہ

ہماں نیز فرزند و پیوستگاں — چہ پیوستگاں داغِ دلخستگاں

زمین و زماں بندہ بد پیشِ من — چنیں بود تا تخت بد خویشِ من

چو از من ہماں بخت بیگانہ شد — ہمہ کاخ و ایواں چو ویرانہ شد

ز نیکی جدا ماندہ ام زیں نشان — گرفتار در دست مردم کشان

ز فرزند و خویشاں شدہ نا اُمید — سیہ شد جہاں، دیدگانم سفید

ز خویشاں کسے نیست فریاد رس — امیدم بپروردگارست و بس

بدیں گونہ خستہ بخاک اندرم — ز گیتی بدامِ ہلاک اندرم

برین است، آئین چرخ رواں — اگر شہریاری اگر پہلواں

بزرگی بفرجام ہم بگذرد — شکاراست و مرگش ہمی بشکرد

سکندر ز دیدہ بہارید خوں — براں شاہِ خستہ بخاک اندروں

چو دارا بدید از دل درد اوی — سرشکِ رواں بر رخِ زرد اوی

بدو گفت بگرمی کز و سود نیست — ز آتش مرا بہرہ جز دود نیست

مناظر | مناظرِ قدرت کو جا بجا لکھا ہے، اور جہاں لکھا ہے، نیچر کی تصویر کھینچدی ہے مناظرِ قدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے، جس پر تمام شعرا نے طبع آزمائیاں کی

ہیں، اور دادِ سخن دی ہی، لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علحدہ اور سب سے ممتاز ہیں، تمام شعرا نے صرف بہار کا سماں دکھانے پر اکتفا کیا ہی، لیکن نظامی نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ سا چھا جاتا ہی، وہ باغ میں جاتا ہے، پھولوں سے کھیلتا ہی، گلدستے بنا کر درختوں پر اچھالتا ہی، نہر کے کنارے بیٹھ جاتا ہی اور شگوفے توڑ توڑ کر نہر میں بہاتا ہی، حوض کے پاس چنبیلی کے پھولوں کا بچھونا بچھاتا ہی بغل میں معشوق ہے، اسکی زلفوں کے حلقے اپنی گردن میں ڈالتا ہی، اور دنیا سے آزاد ہو جاتا ہے، مرغانِ چمن سے فرمایش کرتا ہے کہ ہاں پھر اسی انداز سے اڑنا ساتھ ہی ساز بھی چھیڑتا جاتا ہے، اور قابو سے باہر ہوا جاتا ہی،

بیا باغباں خرّمی ساز کن — گل آمد در باغ را باز کن،

نظامی بباغ آمد از شہر بند — بیارای بستاں بہ چینی پرند،

ز جعدِ[1] بنفشہ بر انگیز تاب — سرِ نرگسِ مست برکش ز خواب

ز سیمائے سبزہ فرو شوی گرد — کہ روشن بہ شستن شود لاجورد

درختاں شگفتند در طرف باغ — برافروختہ ہر گلے چوں چراغ

بہ مرغ زباں بستہ آواز دہ، — کہ پرواز پارینہ را ساز دہ

سرائیدہ کن نالۂ چنگ را — برآور بہ رقص ایں دلِ تنگ را

سرِ زلفِ معشوق را طوق ساز — برافگن ز گردن خود ایں طوق باز

[1] یہ نکتہ بھی لحاظ رکھنا چاہئے کہ نظامی نے ان باتوں کو بجائے خبر کے انشا کے پیرایہ میں ادا کیا ہی اور یہ زیادہ بلیغ ہی،

ریاحین سیراب را دستہ بند | برافشاں بہ بالاے سرو بلند
ازاں سیمگوں سکۂ نوبہار | درم ریزکن بر لبِ جوئبار
بہ پیرامنِ برکۂ آب گیر | زسوسن درافگن بساطِ حریر

عشقیہ | ایران کی شاعری کا اصل مایۂ ناز عشقیہ شاعری ہے، اور اس میں شبہہ نہیں کہ عشق و عاشقی کے معاملات اور راز و نیاز، جس رنگینی اور دلفریبی سے ایرانی شاعری نے ادا کئے، دنیا کی اور کوئی زبان اس انداز سے ادا نہیں کرسکتی، اس قسم کی شاعری کے لئے غزل مخصوص کر دی گئی ہی، اور اس کے موجد شیخ سعدی خیال کئے جاتے ہیں، نام کے لے غزل کی بنیاد ان سے بھی بہت پہلے پڑ چکی تھی، لیکن انصاف یہ ہی کہ وہ قدمار کے بوڑھے غمزے ہیں،

بے شبہہ غزل کے موجد سعدی ہیں، لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے، عشقیہ مثنویاں نظامی سے پہلے بھی لکھی گئیں جنمیں سے فردوسی کی یوسف زلیخا آج بھی موجود ہے، لیکن مثنویاں وہی قدمار کی غزلیں ہین نظامی نے عشقیہ شاعری کی جس طرح بنیاد ڈالی اور اُسکو ترقی دی اُسکی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) عشق و عاشقی کے خیالات کے ادا کرنے کے لئے ایک خاص زبان درکار ہے، جس کے الفاظ نازک، لطیف اور شیریں ہوں، خاص قسم کے استعارات اور تشبیہیں ہوں، ادا میں دلآویزی اور دلفریبی ہو، یہ زبان خاص نظامی نے پیدا

کی ہے، قدما رکی عشقیہ مثنویوں کا نظامی کی مثنویوں سے مقابلہ کرو تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے،

غزل کے مہماتِ مضامین یہ ہیں معشوق کے حسن کی تعریف، ادا اور ناز و غمزہ کے کرشمے، الگ الگ اعضا کا بیان اور انکی تشبیہات، عاشق و معشوق کے معاملات یعنی راز و نیاز، اصرار و انکار، سوال و جواب، عجز و غرور، وغیرہ ان تمام مضامین کو نظامی نے اس وسعت، تنوع، رنگینی اور لطافت سے ادا کیا ہے کہ انکا ہر ہر شعر سینکڑوں غزلوں کا سرمایہ ہے، چند مثالیں ذیل میں درج ہیں،

شیریں کا غسل کرنا،

چو قصد چشمہ کرد آں چشمۂ نور	فلک را آب در چشم آمد از دور
پرند آسماں گوں بر میاں زد	بشد در آب و آتش در جہاں زد
تنِ صافش کہ می غلطید در آب	چو غلطد قاقمے بر روی سنجاب
چو بر فرق آب مے انداخت از دست	فلک بر ماہ، مروارید می بست
ز ہر سو شاخِ گیسو، شانہ می کرد	بنفشہ بر سر گل، دانہ می کرد
در آب انداختہ از گیسوان شست	نہ ماہی بلکہ ماہ آوردہ در دست

شیریں آراستہ ہو کر خسرو کے سامنے آتی ہے،

پس آنگہ ماہ را پیرایہ بر بست	نقاب آفتاب از سایہ بر بست
فرو پوشید گلنارے پرندے	بر ہر شاخ گیسو چوں کمندے

سر آغوشے بر آمودہ بگوہر،
بہ رسم چینیاں افگندہ بر سر

(دوپٹہ)

بدیں طاؤس کردارے ہمائے
رواں شد چوں تذروے در ہوائے

ایک موقع پر جب خسرو نے شیریں سے زیادہ اختلاط کرنا چاہا ہے، تو وہ برہم ہو کر اٹھی ہے، اس حالت میں اس کا تن کر کھڑا ہونا، پیشانی کا غصہ سے سمٹنا، چہرہ کا کھل جانا بدن ڈھکنے میں حسن کا اور چمکنا، بالوں کو کبھی سمیٹنا اور کبھی چھوڑ دینا، ان تمام اداؤں کو کس خوبی سے ادا کیا ہے،

بگفت این وچو سرو انجای برخاست
جبیں راگرہ کرد و فرق را آراست

یہ کہہ کر سرو کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی
پیشانی سمٹ گئی اور قد تن گیا

بہ آں آئین کہ خوباں را بود دست
زنخداں می کشاد و زلف می بست

اس خاص انداز سے جس میں معشوقوں کو کمال ہوتا ہے
چہرہ کھولنے اور بال سمیٹنے لگی،

جمالِ خویش را در خز و خارا،
بہ پوشیدن ہمے کرد آشکارا

اپنے حسن کو حریر اور کمخواب میں جس قدر
چھپاتی تھی، اسی قدر اور کھلتا تھا،

گہے بر فرق تند آشفتہ می بود
گرہ می بست و بر مہ مشک می سود

کبھی زلفوں پر جھلاتی تھی اس میں
گھونگھر بناتی تھی اور چاند پر مشک ملتی تھی

بہ زیور راست کردن دیر می شد
کہ پایش بر سرِ شمشیر می شد،

زیور کے سنبھالنے میں دیر ہوئی جاتی تھی
کیونکہ جلدی کی وجہ سے گویا اسکا قدم تلوار پر تھا

زگیسو گہ کمر می کرد گہ تاج
بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

زلفوں کو کبھی کمر سے لپیٹتی تھی، اور کبھی سر پر جوڑا باندھتی تھی جو کمر بند اور تاج بنجاتی تھی، اور اس کمر بند اور تاج کا خسرو بھی محتاج تھا

ایک موقع پر شیریں جب روٹھکر اٹھی تو اس ادا سے اٹھی جس میں لگاوٹ بھی پائی جاتی تھی، اسکی تصویر اس طرح کھینچی ہی،

بہ چشمے ناز بے اندازہ می کرد	بہ دیگر چشم عذرے تازہ می کرد
چو سر پیچید، گیسو مجلس آراست،	چو رخ گردید، گردن عذرہا خواست
نمود اندر ہزیمت شاہ را پشت	بہ گو گرد سفید آتش ہمی کشت
غلط گفتم نمودش تختہ عاج	کہ شہ را نیز باید تخت یا تاج
حسابے دیگر آں بودش دراں کوی	کہ پشتم نیز محرابے است چوں روے
دگر وجہ آنکہ گر وجہے شد از دست	ازاں روشن ترم وجہے دگر ہست
چہ خوش نازیست نازے خوبرویاں	ز دیدہ راندہ را در دیدہ جویاں
بہ چشمے خیرگی کردن کہ برخیز	بہ دیگر چشم دل دادن کہ مگریز

منہ پھیر کر بھاگنے کی توجیہیں کس قدر شاعرانہ ہیں، یعنی اسکو یہ دکھانا تھا کہ جس طرح میرا چہرہ محرابی اور روشن ہے، اسی طرح پیٹھ بھی محرابی اور بلوری ہی،

غزلیہ شاعری کا ایک بڑا میدان معشوق کا ناز و غرور ہے، نظامی نے داستان کی داستان اس مضمون پر لکھی ہی، جس کا ہر شعر غزل کا کام دیسکتا ہے،

خسرو نے جب شیریں کو شاہی اقتدار کا زور دکھانا چاہا ہے تو وہ کہتی ہی،

ہنوزت در سر از شاہی غرور است	دریغا کیں غرور از عشق دور است

ابھی تک تیرے سر میں سلطنت کا غرور ہے — لیکن افسوس عشق کو غرور سے کیا نسبت

دریں گرمی کہ آہِ سرد باید — دل آسان است با دل درد باید

اس گرمجوشی میں کہ آہ سرد کی ضرورت ہے — دل آسان ہے لیکن دل میں درد مشکل ہے

ہنوزم ہندواں آتش پرستند — ہنوزم چشم چوں ترکان مستند

ابھی تک ہندو، مجھکو پوجتے ہیں — ابھی تک میری آنکھیں ترک ہیں

ہنوزم لب پر آب زندگانی است — ہنوزم آب در جوی جوانی است

ابھی تک میرے ہونٹوں میں آب حیات ہے — ابھی تک میرے چشمہ میں آب شباب ہے

بہ غمزہ گرچہ ترکی دلستانم، — بہ بوسہ دل نوازی نیز دانم

اگرچہ غمزہ کے لحاظ سے میں ترک ہوں — لیکن بوسہ سے میں دلداری بھی کرسکتی ہوں

برو تا بر تو نکشانم بخون دست — کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست

ہٹ جا! ایسا نہ ہو کہ میں تیرے لہو پر ہاتھ ڈالدوں — ایسے اور بہت سے خون میری گردن پر ہیں

خسرو نے جب شاپور کے ہاتھ شیریں کو بلا بھیجا ہے، تو وہ کہتی ہے،

اگر خسرو نہ کیخسرو بود شاہ — بنا یدکر دنش سرپنجہ با ماہ

بگویم غمزہ را تا وقت شبگیر — سمندش را بہ رقص آرد بیک تیر

فرستم زلف را تا ایک فن آرد — شکیبش را رسن در گردن آرد

میں زلف کو بھیجدوں گی کہ چالاکی سے — خسرو کے صبر کو گرفتار کرکے لائے

مزاحی کردم واو خواست پنداشت — دروغ گفتم واو راست پنداشت

میں نے تو دل لگی تھی تو وہ تقاضا سمجھے — میں نے جھوٹ کہدیا تھا وہ سچ سمجھ گئے

خسرو ایک مرتبہ چند ندیموں کے ساتھ مستی کی حالت میں شیریں کے مکان پر گیا، شیریں نے اس کی یہ حالت دیکھکر کوٹھے سے اترنا مناسب نہ سمجھا، خواصوں کو بھیجا کہ شہ نشین میں فرش کرکے وہیں خسرو کو بٹھائیں، خسرو کوٹھے پر جانا چاہتا ہی، شیریں منظور نہیں کرتی، اس موقع کا سماں اور سوال وجواب کا انداز دیکھو،

رقیبے را بہ نزد خویش خواند — کہ مارا نازنیں بر در چرا ماند

ایک خواص کو اپنے پاس بلایا اور کہا — کہ مجھکو نازنین نے باہر کیوں بٹھایا

دروں شو، گو نہ شاہنشہ غلامی — فرستادست نزدیکت پیامی

اندر جاکر کہو کہ ایک شاہنشہ نے نہیں بلکہ — ایک غلام نے پیغام بھیجا ہی،

کہ مہمانے بہ خدمت مے گراید — چہ فرمائی ؟ درآید یا نیاید

کہ ایک مہمان خدمت کے لئے آیا ہی — کیا ارشاد ہی؟ اندر آئے یا نہ آئے،

بدیں زاری پیامِ شاہ می گفت — شکر لب می شنید وآہ می گفت

بادشاہ کا عاجزانہ کلام شیریں — سنتی تھی اور افسوس کرتی تھی،

کنیزے کاروان را گفت آں ماہ — بخدمت خیز وبیروں شو سوی شاہ

ایک ہوشیار کنیز سے شیریں نے کہا کہ — بادشاہ کے پاس جا،

فلاں شش طاق دیبا را بروں بر — بزن با طاق ایں ایواں برابر

مخمل کے تھان لے جاکر — شہ نشیں میں بچھا دے

بنہ بر پیشگاہ و شقہ بربند — پس آنگہ شاہ را گو کاے خداوند

اور پردے باندھ کر — بادشاہ سے کہہ

نہ ترک این سرا ہندوی این بام — شہنشہ را چنین داد است پیغام

اس گھر کی ترک (یعنی معشوق) نے نہیں بلکہ — ہندو (غلام) نے حضور کو یہ پیغام دیا ہی

اِس کے بعد خسرو اور شیریں سے دوبدو گفتگو ہوئی ہی، خسرو کہتا ہی کہ تم نے دروازہ کیوں بند کردیا، شیریں جواب دیتی ہی،

حدیث آں کہ در بستم روا بود — کہ سرمست آمدن پیشم خطا بود

چوں من خلوت نشیں باشم تو مخمور — ز تہمت ہاے مردم کے بود دور

تو می خواہی مگر زراہِ دستاں — بہ نقلانم خوری چوں نقلِ مستاں

بدست آری مرا چوں غافلاں مست — چو گل بوی کنی و اندازی از دست

رہا کن نام شیریں از لبِ خویش — کہ شیرینی دہانت را کند ریش

تو در عشقِ من از مالی و جاہے — چہ دیدی جز خداوندی و شاہے

تو ساغر می زدی با دوستاں شاد — قلم شاپور می زد تیشہ فرہاد

اس کے مقابلہ میں رندانہ شوخیاں دیکھو، شیریں جب کسیطرح راضی نہیں ہوتی تو خسرو اس سے کہتا ہے،

بہ گستاخی درآمد کے دلارام — گرفتہ چند خواہی بد، بیا رام

خسرو نے گستاخانہ کہا کہ اے معشوق — یہ برہمی کب تک، ذرا نرم ہو

چو می خوردی و میدادی بمن یار	چرا باید کہ من مستم تو ہشیار

تم نے شراب پی اور مجھکو بھی پلائی لیکن یہ خلافِ انصاف ہے کہ میں مست ہو جاؤں اور تم ہوش میں رہو

شمار بوسہ خواہد بود کارم	تو می دہ بوسہ تا من می شمارم
میرا کام صرف بوسہ کا گننا ہوگا	تم بوسہ دیتی جاؤ میں گنتا جاؤں گا

یعنی یہ کام تمہارا ہی ہے، لیکن میں اسکو تمہاری خاطر سے انجام دیدوں گا،

سکندر نے جب کنیز کِ چینی سے اختلاط کرنا چاہا ہے تو وہ غرور کے لہجہ میں اپنے اوصاف بیان کرتی ہے، بادشاہ اور کنیز کا کوئی مقابلہ نہیں، لیکن اس موقع پر نظامی نے جدت آفرینی سے سکندر کا ایک ایک وصف بیان کرکے اس کے مقابلہ میں اسکے ترجیح کی وجہیں کنیز کی زبان سے ادا کی ہیں،

ملک گر ز جمشید بالاتر است	رخِ من ز خورشید زیباتر است
شہ ار کیقباد بلند افسر است	مرا افسر از مشک و از عنبر است
شہ ار چوں سلیمان شود دیو بند	مرا در جہاں ہست دیوانہ چند
شہ ار ز انکہ عالم گرفت ای شگفت	من آں را گرفتم کہ عالم گرفت
اگرچہ کمند جہانگیر شاہ	فتادہ است در گردن مہر و ماہ
کمندے من از زلف بر ساز مش	نہ ترسم بہ گردن در اندازمش
گر او را کمندے بود ماہ گیر	مرا ہم کمندے بود شاہ گیر
گر او ناوک انداز و از دور دست	مرا غمزۂ ناوک انداز ہست

سکندر بہ حیواں خطا می رود | من اینجا سکندر کجا می رود
اگر راہ ظلمات می بایدش | سر زلف من راہ بنمایدش
لب من کہ یاقوت رخشاں دروست | بسے چشمۂ آب حیواں دروست

رزمیہ | شاہ نامہ کو سو برس سے اوپر ہو چکے تھے، اس عرصہ میں زبان میں بڑا انقلاب ہو گیا تھا، سینکڑوں الفاظ بالکل متروک ہو گئے تھے، اکثر الفاظ حروف زائد گرا کر خوبصورت قالب میں ڈھل چکے تھے، عربی کے نئے نئے مانوس الفاظ داخل ہوتے جاتے تھے، زبان کے انقلاب کے ساتھ مضامین کی طرز ادا کی روش بھی بدل گئی تھی، استعارات اور تشبیہات میں لطافت و نزاکت آ گئی تھی، طبیعتیں مضمون آفرینی کی طرف مائل ہوتی جاتی تھیں، ان باتوں سے شاہنامہ کی عالمگیر آواز دھیمی پڑنے لگی تھی، قصے زبانوں پر رہ گئے تھے لیکن اشعار بھولتے جاتے تھے، اس بنا پر قوم کے شجاعانہ جذبات کے زندہ رکھنے کیلئے ایک دوسرے شاہنامہ کی ضرورت تھی جو سکندر نامہ کے قالب میں نمودار ہوا،

سکندر نامہ کے ہیرو کے انتخاب میں غلطی ہوئی، لیکن مجبوری تھی، قومی تاریخ فردوسی کے حصہ میں آ چکی تھی، رسول اللہ صلعم کے غزوات اور خلفاء کے معرکوں میں شاعری کی گنجائش کم تھی کیونکہ اصلیت سے بال برابر بھی ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے اور شاعری کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا، خود کہتے ہیں،

چو نظم گذارش بود راہ گیر | غلط کردن رہ بود ناگزیر
مرا کار با نغز گفتاریست | ہمہ کار من خود غلط کاریست

وگر بے شگفتے گزاری سخن	ندارد نوی، نامہ ہائے کہن

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کیجائے اس حیثیت سے سکندر کا کوئی ہمسر نہ تھا، ایشیا اور یورپ دونوں اس کو مانتے تھے، البتہ یہ افسوس ہے کہ نظامی نے مذہب ملا دیا، یعنی ذوالقرنین کو سکندر بنا دیا، جو صریح قرآن مجید کے خلاف ہے،

سکندر نامہ میں اگرچہ شاعری کے محاسن بہت زیادہ ہیں، بااین ہمہ شاہنامہ کے برابر مقبول نہ ہو سکا، اس کے خاص اسباب ہیں،

۱۔ سکندر نامہ میں اکثر جگہ تعقید ہے، جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس طرح صاف صاف نہیں کہہ سکتے کہ زبان سے نکلنے کے ساتھ دل میں اتر جائے، یہی وجہ ہے کہ کثرت سے شرحیں اور حاشیے لکھے گئے، اس پر بھی بہت سے مقامات لاینحل رہ گئے، اور اکثر جگہ زبردستی مطلب پہنانا پڑا،

۲۔ کتاب کا ہیرو ایک غیر شخص یعنی سکندر تھا، اسلئے ایرانیوں کو اسکے واقعات سے ایسی دلچسپی اور محبت نہیں ہو سکتی تھی جو خود اپنی قوم سے ہو سکتی تھی، شاہنامہ کے مقبول ہونے کا بڑا گر یہ تھا کہ خود اپنی قوم کی داستان تھی،

۳۔ تمام کتاب میں صرف ایک شخص کی داستان ہے، پڑھنے والا اکتا اکتا جاتا ہے بخلاف اس کے شاہنامہ میں سینکڑوں اشخاص کے واقعات اور گوناگوں حالات ہیں ایک غذا سے جی گھبرائے تو اور طرح طرح کے الوانِ نعمت موجود ہیں،

ہے، تمام کتاب میں کوئی درد انگیز اور عبرت خیز واقعہ نہیں ہے، بخلاف اس کے شاہنامہ میں رستم وسہراب، منیژہ وبیژن، جمشید وضحاک کی داستانیں نہایت پر اثر اور حسرت آمیز ہیں،

باوجود ان باتوں کے سکندر نامہ نے جو قبولیت حاصل کی، تعجب انگیز ہے، شاہنامہ کے سو ڈیڑھ سو ہی برس بعد سکندر نامہ لکھا گیا، اور شہرتِ عام پاگیا، سکندر نامہ کو آج چھ سو برس کا زمانہ گذر چکا، اس مدت میں اس طرز پر بیسیوں کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا، سکندر نامۂ جامی، آئینہ سکندری، ہمای ہمایوں، اکبر نامہ، سلیمان نامہ[1]، ان کا نام کس نے سنا ہے،؟

رزمیہ نظم کا یہ اصول ہے کہ پہلے حربی باجوں کے بجنے، دار وگیر، ہنگامۂ شور وغل اور عام ہلچل کا نقشہ کھینچا جائے، پھر فوجوں کی حملہ آوری، زور شور، جوش وخروش کا ذکر کیا جائے، پھر آلاتِ جنگ یعنی تیر وکمان، تیغ وسناں، نیزہ وخنجر کی کارستانیاں دکھائی جائیں، پھر ایک ایک پہلوان کا معرکہ میں آنا، رجز پڑھنا، مبارز طلب ہونا، حریف سے لڑنا، داؤں پیچ کرنا، مرنا یا مارنا، ان باتوں کا ذکر کیا جائے اور اس طرح کیا جائے کہ میدانِ جنگ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، سکندر نامہ میں یہ سب باتیں ہیں اور کمال کے درجہ پر ہیں،

حربی باجوں کا ذکر

[1] یہ سب مثنویاں سکندر نامہ کی طرز پر اور اسکے جواب میں لکھی گئی ہیں،

در آمد بہ غرّیدن آوازِ کوس
فلک بر دہانِ دہل داد بوس

زغرّیدنِ کوس خالی دماغ
زمیں لرزہ افتاد در کوہ و راغ

چناں آمد از نائے ترکی خروش
کہ از نائے ترکاں برآورد جوش

برآوردہ خرمہرہ آوازِ شیر
گلا
دماغ از دمِ گاؤدم گشت سیر

ناقوس
طراقے کہ از مقرعہ خواستہ
ترنا
بروں رفت ازیں طاق آراستہ

ترانے کی آواز تازیانہ
زبیم چقاچق کہ آمد ز تیر
کفن گشت در زیر جوشن حریر

ہنگامہ جنگ

روا رو برآمد ز راہِ نبرد
ہزاہز درآمد بہ مردانِ مرد

بہ جنبش درآمد دو دریائے خوں
شد از موجِ آتش، زمیں لالہ گوں

زمیں گفتی از یکدگر بر درید
سرافیل صورِ قیامت دمید

یکے گفت ہوی و دگر گفت ہاں
برآورد سرہای و ہوی از جہاں

جگر تاب شد نعرہ ہائے بلند
گلوگیر شد حلقہائے کمند

سپاہ از دو جانب صف آراستہ
زمیں آسماں وار بر خاستہ

زسمِ ستوراں دراں پہن دشت
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

فرو رفت و بر رفت روزِ نبرد
نمِ خوں بہ ماہے و بر ماہ گرد

زبس گرد بر تارک ترک و زیں
زمیں آسمان، آسماں شد زمیں

چناں گرم گشت آتشِ کارزار
کہ از نعلِ اسپاں برآمد شرار

زبس خوں کہ گرد آمد اندر مغاک
چو گوگردِ سرخ آتشیں گشت خاک

آلاتِ جنگ

زغریدنِ تُندہ پیلانِ مست ‌ ‌ گرہ در گلوی ہژبران شکست
زمیں کو بساطے بُد آراستہ ‌ ‌ غباری شد از جاے برخاستہ
ز پولاد پیکان پیکر شکن، ‌ ‌ تنِ کوہ لرزید بر خویشتن
پدر با پسر کیں برآراستہ ‌ ‌ محابا شدہ، مہر برخاستہ
ستونِ علم جامہ در خوں زدہ ‌ ‌ نجات از جہاں خیمہ بیروں زدہ
ز شمشیر برگشتہ جاے نبود، ‌ ‌ کہ در غار او اژدہاے بنود
نہنگ خدنگ از کمین کماں ‌ ‌ بنا سود بر یک زمیں یک زماں
کمند اژدہاے مسلسل شکنج ‌ ‌ دہن باز کردہ بہ تاراجِ گنج
ز بس بر دہن ناچخ انداختن ‌ ‌ نفس را نہ راہِ بروں تاختن
ز نیزہ نیستاں شدہ روے خاک ‌ ‌ ز گوپالہا کوہ گشتہ مغاک
سناں در سناں رستہ چوں نوکِ خار ‌ ‌ سپر بر سپر بستہ چوں لالہ زار (گرز)
نہنگانِ شمشیرِ جوشن گداز ‌ ‌ بہ گردن کشی کردہ گردن فراز (تیغ)
بہ ابرو درآمد کماں را شکنج ‌ ‌ شتاباں شدہ تیر چوں مار گنج (گرگ)
ز روسی درآمد بہ ناوردگاہ ‌ ‌ یکے تیر بر طاسؔ[1] روئیں کلاہ
مبارز طلب کرد و جولاں نمود ‌ ‌ بہ نام آوری خویشتن را سرود
کہ پرطاسیاں را دریں خام حرم ‌ ‌ بہ پرطاسیِ من شود پشت گرم

---

[1] پرطاس ایک مقام کا نام ہے،

پلنگاں درم بر سرِ کوہسار — نہنگاں خورم بر لبِ جویبار

درشتم بہ چنگال و سختم بزور — بہ حملہ درم پہلوی نرّہ گور

سنانم ز پہلو در آید بہ ناف — در وغے نمی گویم اینک مصاف

ہمہ خونِ خام است نوشیدنم — ہمہ چرمِ خام ست پوشیدنم

شہ گردناں شاہ گردوں گرائے — زبر کار موکب تہی کرد جائے

حلیۂ جنگ سے آراستہ ہوکر حملہ کرنا

پہلوان

زدہ بر میاں گوہر آگیں کمر — در آورد پولاد ہندی بہ سر

بہ تن بر یکے آسماں گوں زرہ — چو مرغول زنگی گرہ در گرہ،

یمانی یکے تیغ زہراب جوش — حمائل فروہشتہ از طرفِ دوش

بہ کبکِ دری چوں در آید عقاب — چگونہ جہد بر زمیں آفتاب

ازاں تیز تر خسرو پیل تن — بہ تندی در آمد بہ آں اہرمن

بزد بانگ بروی کہ اے زاغِ پیر — عقابِ جواں، آمد آرام گیر

جنگ

نخستیں نبردے کہ تدبیر کرد — برآں تیرہ دل بارشِ تیر کرد

چو دژخیم را نامد از تیر باک — ز تندہ شد از تیر خود خشمناک

بدذات

یکے خشت پولاد الماس رنگ — برآورد و زد بر دلاور نہنگ

ز سختی کہ تن را بہم در فشرد — برآں خارہ شد خشت پولاد خرد

پتھر

دگر خشتے انداخت زاں تیز تر — برآں کشتنی ہم نہ شد کارگر

چو دانست کاں دیو آہن سرشت — نیندیشد ز حربۂ تیر و خشت

نہنگ جہانسوز را بر کشید	سوے اژدہاے دمندہ دوید
زدش بر کتف گاہ و بر دش زجاے	چناں کاں ستمگر در آمد زپاے

لیکن انصاف یہ ہے نظامی، فردوسی کی طرح خاص لڑائی کے داؤں پیچ اور فنونِ جنگ کی تصویر اچھی طرح نہیں کھینچ سکتے،

نظامی اور فردوسی کا موازنہ

اگرچہ انصاف یہ ہے کہ نظامی فردوسی کے ہمپایہ نہیں ہیں تھوڑا سا شیریں پانی لے کر بار بار چھانا جائے، مقطر کیا جائے، اور پھر کسی خوش رنگ، خوشنما گلاس میں رکھا جائے تو اسکی شیرینی، خوشگواری، صفائی، اور خوشنمائی میں کیا شک ہے لیکن ایک صاف شیریں قدرتی چشمہ جو پہاڑ کے دامن سے نکل کر، بہتا چلا جاتا ہے اس سے کیا نسبت، تاہم دونوں کا اندازِ کلام دکھانے کے لئے ہم چند مشترک عنوانوں کے اشعار نقل کرتے ہیں اور ان کا فرق دکھاتے ہیں،

سکندر کا قاصد بنکر نوشابہ کے دربار میں جانا، سکندرنامہ کی مشہور داستان ہے، یہی قصہ شاہنامہ میں بھی ہے، فرق یہ ہے کہ شاہنامہ میں نوشابہ کے بجاے قیدافہ کا نام ہے جو اندلس کا بادشاہ تھا، باقی حالات مشترک ہیں، یعنی بادشاہ نے سکندر کو پہچان لیا ہے، اور اس سے اسکا اظہار کیا ہے، سکندر انکار کرتا ہے، بادشاہ اسکی تصویر منگا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ اپنے چہرہ سے ملالو، سکندر سخت مضطر ہوتا ہے، بادشاہ اس کو تسلی دیتا ہے کہ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

فردوسی	نظامی
چو قیدافہ را دید بر تختِ عاج	برآراست نوشابہ درگاہ را
زیاقوت و پیروزہ بر سرش تاج	بزر درگرفت آہنی راہ را
ز زربفت پوشیدہ چینی قباے	پری چہرگاں را بصد گونہ زیب
فراواں پرستندہ پیشش بہ پاے	صف اندر صف آراست آں دل فریب
رخ شاہ تاباں بہ کردار ہور	برآمود گوہر بہ مشکیں کمند
نشستنگہش راستوں ہا بلور	فروہشت بر گوہر آگیں پرند
پرستندہ با طوق و با گوشوار	براورنگ شاہنشہی بر نشست
بہ پا اندراں گلشنِ زرنگار	گرفتہ معنبر ترنجے بدست
سکندر بداں در شگفتی بماند	بفرمود کائیں بجاے آورند
فراواں نہاں نامِ یزداں بخواند	فرستادہ را در سراے آورند
نشستنگہے دید، قیصر کہ نیز	فرستادہ از در درآمد دلیر
نیامد ورا روم و ایراں بہ چیز	سوے تخت شد چوں شتابندہ شیر
بر مہتر اندر زمیں داد بوس	کمربند شمشیر بکشاد باز
چناں چوں بود، مردم چاپلوس	برسمِ رسولاں نہ بردش نماز
ورا دید قیدافہ بشناختش،	نہانی دراں قصر زیبندہ دید
بپرسید بسیار و بنواختش	بہشتی سراے فریبندہ دید

فردوسی	نظامی
به مے خوردن اندر گرانمایه شاہ	زبس گوہریں گوش گردن کشاں
فزوں کرد سوی سکندر نگاہ	شدہ چشم بینندہ گوہر فشاں
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر	ز تابندہ یاقوت و رخشندہ لعل
بنشتہ برو صورتِ دلپذیر	خرامندہ را آتشیں گشت نعل
بہ پیشِ من آور چناں ہم کہ ہست	مگر کان و دریا بہم تاختند
بہ تندی برو ہیچ مپسای[1] دست	ہمہ گوہر اینجا بر انداختند
بیاورد گنجور و بنہاد پیش	زن زیرک از سیرت شانِ او
چو دیدش نگہ کرد زاندازہ بیش	دراں داوری شد ہراسان او
بہ چہر سکندر نکو بنگرید	کہ ایں کارداں مرد آہستہ رای
ازاں صورت او را جدائی ندید	چرا شرط خدمت نیارد بجای
بدانست قیدافہ کاو قیصر است	ز سر تا قدم دید در شہریار
براں لشکرِ نامور مہتر است	زر پختہ را بر محک زد عیار
بدو گفت کاے مرد گستردہ کام	چو نیکو نگہ کرد بشناختش
بیا تا چہ دادت سکندر پیام	بہ تختِ خود آرامگہ ساختش
چنیں داد پاسخ کہ شاہ جہاں	سکندر بہ رسم فرستادگاں

[1] یعنی بے احتیاطی سے ہاتھ نہ لگانا۔

فردوسی	نظامی
سخن گفت با من میانِ جہاں	نگہ داشت آئینِ آزادگاں
کہ قیدافہ، پاک دل رابگوے	پس آنگہ گذارش گرفت از پیام
کہ جز راستی در زمانہ مجوے	کہ شاہِ جہاں داور نیک نام
مگر سر نہ پیچی ز فرمانِ من	چنیں گفت کاے داور ناجوی
نگہدار بیدار پیمانِ من	ز نام آورانِ جہاں بردہ گوی
دگر ہیچ تاب اندر آری بدل	چہ افتاد کز ما عناں تافتے
بیارم یکے لشکرے دل گسل	سوے ما تو یکرُو نشتافتے
برآرم دمار از ہمہ لشکرت	ز بونے چہ دیدی کہ توسن شدی
بہ آتش بسوزم ہمہ کشورت	چہ بیداد کردم کہ دشمن شدی
بدو گفت کاے زادہ فیلقوس	چو من رہ دریں مملکت ساختم
ہمت رزم بزم ست و ہم نعم و بوس	بر و سایۂ دولت انداختم
دلیر آمدی پیش من باز خواہ	کمر چوں نہ بستی بدرگاہِ من
ندانم ترا اینکہ بنمود راہ	چرا روی پیچیدے از راہِ من
سکندر ز گفتارِ او گشت زرد	بہ پاسخ نمودن زنِ ہوشمند
رواں پُر ز در و و رخاں لاجوُرد	ز یاقوت سربستہ بکشاد بند
بدو گفت کاے مہترِ پُر خرد	کہ صد آفریں بر تو شاہِ دلیر

چنیں گفتہ از تو نہ اندر خورد
منم یطقون کد خدائے جہاں
جزایں بچۂ فیلقوسم مخوان
بدو گفت قیدافہ کز داوری
لبت را بپرواز کا سکندری
بیاورد و بنہاد پیشش حریر
نوشتہ بر و صورتے دلپذیر
کہ گر ہیچ جنبش بدے درنگار
نبودے جزا سکندر شہریار

کہ پیغام خود خود گذاری چو شیر
چناں آیدم در دل اے پہلواں
کہ با ایں سرو سایۂ خسرواں
میانجی نہ شاہ آزادہ،
فرستندہ نہ فرستادہ
پیام تو چوں تیغ گردن زند
کرا زہرہ کیں تیغ بر من زند
ز تیغ سکندر چہ رانی سخن
سکندر توئی چارۂ خویش کن
مرا خواندی و خود بدام آمدی
نظر پختہ ترکن کہ خام آمدی
جہاندار گفت اے سزوار تخت
پژوہش مکن جز بہ فرمان بخت

نظامی

سکندر محیط است و من جوے آب — مشو تہمت سایہ بر آفتاب
بدرگاہ او بیش ازاں ست مرد — کہ او را قدم رنجہ بایست کرد
دگر بار نوشابۂ ہوشمند — ز نوشیں لب خویش بکشاد بند

نظامی

گزیں بیش بر و بفریبی مباش	بہ ناراستی یکر کیبی مباش
پیامت بزرگ است و نامت بزرگ	نهفتہ مکن شیر در چرم گرگ
فرستادہ را نیست ایں دسترس	کہ با ما بہ تندی بر آرد نفس
نہ جباری خویش را کم کند	نہ در پیش من پشت را خم کند
جوابش چنیں داد شاہ دلیر	کہ ناید ز روباہ پیغام شیر
اگر من چہ چشم تو نام آورم	سکندر نیم زو پیام آورم
اگر در میانجی دلیر آمدم	نہ از روبہ از نزد شیر آمدم
بہ آشفت نوشابہ ازاں شیر دل	کہ پوشید خورشید را زیر گل
بفرمود کار دکینزے دواں	حریرے برو پیکر خسرواں
یکے گوشہ از شقۂ آں حریر	بدو داد کیں نقش بر دست گیر
بہ بیں تا نشانِ رخ کیست ایں	دریں کارگاہ از پے چیست ایں
اگر پیکر تست چندیں مکوش	بہ ابروی خود آسماں را مپوش
سکندر بفرمان او ساز کرد	حریر نوشتہ ز ہم باز کرد،
بعینہ در و صورت خویش دید	ولایت بدست بد اندیش دید
بترسید و شد رنگ ویش چو کاہ	بدارائے خود برد خود را پناہ

(۱) سب سے پہلے اس پر نظر ڈالو کہ جہاں ایک ہی خیال ایک ہی واقعہ ایک ہی

بات کو دونوں نے لکھا ہے وہاں بھی، بندشِ الفاظ کے لحاظ سے کس قدر فرق ہی نظامی کی ترکیبوں کی چستی، قافیوں کی بلندی، فقروں کے در و بست، الفاظ کے شکوہ کا یہ انداز ہے کہ گویا شیر گونج رہا ہے، اسکے مقابلہ میں فردوسی کا کلام ایسا معلوم ہوتا ہے جس طرح کوئی پراتم بڈھا پیرانہ لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا ہو، ان اشعار کا مقابلہ کرو،

فردوسی	نظامی
ززربفت پوشید چینی قباے	پر بچہرگاں را بصد گونہ زیب
فراواں پرستندہ پیشش بپاے	صف اندر صف آراست آں دل فریب
برهنتر اندر زمیں داد بوس	سکندر بہ رسمِ فرستادگاں
چناں چوں بود مردم چاپلوس	نگہ داشت آئینِ آزادگاں
سکندر بداں در شگفتے بماند	نہانے دراں قصر زیبندہ دید
فراواں نہاں نامِ یزداں بخواند	بہشتی سراے فریبندہ دید
بہ مے خوردن اندر گراں مایہ شاہ	ز سر تا قدم دید در شہریار
فزوں کرد سوے سکندر نگاہ	زر پختہ را بر محک زد عیار
بہ گنجور گفت آں درخشاں حریر	یکے گوشہ از شقۂ آں حریر
نبشتہ بر و صورتے دلپذیر	بدو داد کیں نقش بر دست گیر
کہ قیدافہ پاک دل را بگوے	چنیں گفت کاے داورِ نامجوی
کہ جز راستی در زمانہ مجوے	ز نام آورانِ جہاں بردہ گوے

نظامی	فردوسی
کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر	دلیر آمدی پیشِ من باز خواہ
کہ پیغامِ خود خود گذاری چو شیر	ندانم ترا اینکہ بنمود راہ
میانجی نہ شاہ آزادہ	بدو گفت قیدافہ کز داوری
فرستندہ نہ فرستادہ	لبت را بپرداز کا سکندری
بترسید و شد رنگ ویش چو کاہ	سکندر ز گفتارِ او گشت زرد
بہ دارائے خود برد، خود را پناہ	رواں پُر ز درد و رخاں لاجورد
سکندر محیط است و من جوی آب	منم بیطقون کد خدائے جہاں
منہ تہمتِ سایہ بر آفتاب	جز ایں بچۂ فیلقوسم مخواں

(۲) انہی اشعار میں بلاغت کا فرق دیکھو،

نظامی	فردوسی
صف اندر صف آراست آں دلفریب	فراواں پرستندہ پیشش بپاے

فردوسی کے بیان سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کا ہجوم تھا، اور سب کھڑے تھے، لیکن نظامی کے بیان سے ان کا باقاعدہ صف بصف ایستادہ ہونا بھی ثابت ہوتا ہے، "آراست" کے لفظ نے اس خصوصیت کو اور روشن اور خوشنما کر دیا ہے،

نظامی	فردوسی
سکندر بہ رسمِ فرستادگاں	بہ بہتر اندر زمیں داد بوس

چناں چوں بود مردم چاپلوس	نگہ داشت آئین آزادگاں

فردوسی نے سکندر کی شان کا کچھ لحاظ نہیں رکھا، زمین چومنا خوشامدیوں کا شیوہ ہے، فردوسی کو اس پر بھی قناعت نہیں بلکہ کھول کر کہتا ہے کہ سکندر نے اس طرح زمین چومی جس طرح خوشامدی چوما کرتے ہیں، نظامی نے اگرچہ "برسم فرستادگاں" کے لفظ سے ظاہر کر دیا ہے کہ سکندر نے قاصدوں کے طریق اور آئین کو ملحوظ رکھا تھا تاہم دوسرے مصرع میں وفع دخل بھی کر دیا، کہ اس حالت میں بھی اپنی آن بان نہیں چھوڑی،

فردوسی	نظامی
سکندر بداں در شگفتے بماند	نہانے دراں قصر زیبندہ دید
فراواں نہاں نام یزداں بخواند	بہشتی سرائے فریبندہ دید

فردوسی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سکندر بالکل ندیدہ تھا، دربار کے ٹھاٹ کو دیکھکر مبہوت ہوگیا تھا، اور بار بار خدا کا نام لیتا تھا، نظامی نے مکان اور ایوان کی عمدگی اور خوبی کا اثر سکندر پر طاری کرنا چاہا ہے، لیکن اسی قدر کہ وہ کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا،

فردوسی	نظامی
فزوں کرد سوے سکندر نگاہ	ز سرتا قدم دید در شہریار

فزوں نگاہ کردن سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہی کہ قیدافہ سکندر کو بڑی

دیر تک دیکھتا رہا، ممکن ہے کہ صرف چہرہ پر ہی دیر تک اسکی نظر جمی رہی ہو، لیکن صرف چہرہ کی مشابہت پہچاننے کے لئے کافی نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے چہرے ملتے جلتے ہوتے ہیں، لیکن اور اعضا میں فرق ہوتا ہی، بخلاف اس کے نظامی کے بیان سے ثابت ہوتا ہی کہ نوشابہ نے سکندر کو سر سے پاؤں تک دیکھا، یعنی نہ صرف چہرہ بلکہ تمام اعضا اور ڈیل ڈول، رنگ روپ، سج دھج کو بھی دیکھا جس سے صاف ثابت ہوگیا کہ یہ سکندر رہے،

نظامی	فردوسی
چنیں گفت کاے داور ناجوی زنام آوران جہاں بردہ گوی	کہ قیدافہ پاک دل را بگوے کہ جز راستی در زمانہ مجوے

قاصد کا بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کا نام لینا، اور پھر فوراً تنبیہ و نصیحت شروع کر دینا دستور کے خلاف ہے، اس لئے نظامی نے نام نہیں لیا بلکہ داور ناجو کے لفظ سے خطاب کیا اور اس کے ساتھ مدحیہ الفاظ اضافہ کئے،

نظامی	فردوسی
کہ صد آفریں بر تو شاہ دلیر کہ پیغام خود خود گذاری چو شیر	دلیر آمدی پیش من باز خواہ ندانم ترا ایں کہ بنمود راہ

فردوسی نے اس بات کو کہ قیدافہ نے سکندر کو پہچان لیا نہایت بے مزہ طریقہ سے بیان کر دیا ہے، اسکے ساتھ یہ الفاظ کہ معلوم نہیں کس نے تمکو یہ طریقہ سکھایا

اور بھی بدتہذیبی ہے، بخلاف اس کے نظامی اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں، جس سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ نوشابہ کو یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں کہ میں نے آپ کو پہچان لیا بلکہ وہ سکندر کی دلیری اور جرأت کے اثر سے متاثر ہے، اور بے اختیار تعریف کرتی ہی،

فردوسی	نظامی
سکندر زگفتار او گشت زرد	بترسید و شد رنگ رویش چو کاہ
رواں پر زدرد و رخاں لاجوُرد	بہ وارائے خود برد خود را پناہ

اس قدر مضمون دونوں کے ہاں مشترک ہی کہ جب سکندر کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اسکو پہچان لیا، تو وہ ڈرا اور متردد ہوا، لیکن فردوسی نے اسکے ڈرنے کو اسقدر حد سے بڑھا دیا جو سکندر کی شان سے بالکل بعید ہے "رواں پر زدرد و رخاں لاجورد" نظامی کے بیان سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کا رنگ زرد پڑگیا اور دل میں خدا سے دعا مانگی کہ اس خطرہ سے بچ جائے، لیکن اتنا بھی بدحواس نہیں ہوا کہ دل میں ٹیس اٹھنے لگی، فردوسی نے پہلے مصرع میں سکندر کا زرد پڑجانا بیان کردیا تھا، لیکن اس پر بھی تسلی نہیں ہوئی اور دوسرے مصرع میں پھر کہنا پڑا "رخاں لاجورد"

(۳) اب عام طرح پر نظر ڈالو، جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ بیان کرنے والا واقعہ کا خاکہ (پلین) کیونکر قائم کرتا ہی، اور یہ بلاغت کا پہلا لیکن سب سے ضروری مرحلہ ہی،

فردوسی نے واقعہ کا جو خاکہ قائم کیا ہی اُس میں متعدد ناموزونیاں ہیں،

(۱) سکندر قاصد کے لباس میں خوشامدیوں کی طرح دربار میں آداب بجا لاتا ہی،

(۲) دربا کو دیکھکر مبہوت ہو جاتا ہی، گویا کبھی شاہانہ دربار دیکھا ہی نہ تھا،

(۳) حالانکہ سکندر کی رفتار، گفتار، طور و طریقہ سے ابھی کوئی بات ظاہر نہیں ہوئی تھی جس سے اس احتمال کی طرف ذہن جائے کہ یہ خود سکندر ہے، تاہم بادشاہ کو شبہہ ہوتا ہے اور وہ سکندر کے چہرہ کو بہت غور سے دیکھتا ہے، اسلئے نظامی نے اسکا یہ پہلو نکالا کہ سکندر نے قاصدوں کی طرح سجدہ نہیں کیا تھا، اور پیغام اس شان سے ادا کیا کہ قاصد اس دلیری اور جرأت سے ادا نہیں کر سکتا تھا، اس حالت میں شبہہ پیدا ہونا ضرور تھا، اور شبہہ کو اس لئے قوت ہوئی کہ سکندر کی تصویر اُسکی نظر سے گذر چکی تھی،

(۴) قیدافہ نے سکندر کے سامنے ہی تصویر منگا کر دیکھی، حالانکہ جب مخفی طور سے سکندر کو پہچاننا مقصود تھا، تو سکندر کے سامنے تصویر منگوا کر دیکھنا نہ چاہئے تھا،

(۵) سکندر جب قاصد کی حیثیت سے پیغام ادا کرتا ہی تو معلوم ہوتا ہی کہ آدابِ شاہی سے ناواقف ہی، اوّل تو بادشاہ کا نام لینا خلافِ ادب ہی اسکے علاوہ پہلے ہی سخت کلامی شروع کر دینی نہایت بد تہذیبی ہی،

بہ آرم دمار از ہمہ لشکرت بہ آتش بسوزم ہمہ کشورت

(۶) سکندر جب اپنے آپ کو چھپاتا، اور سکندر کا قاصد ہونا ظاہر کرتا ہی تو اسکو سکندر کا نام بڑی تعظیم و تکریم سے لینا چاہئے تھا، لیکن وہ سکندر کو بچہ فیلقوس کے خطاب سے یاد کرتا ہے،

ع جزایں بچۂ فیلقوسش[1] مخواں

اس کے مقابلہ میں نظامی نے جس طرح اس تمام واقعہ کا خاکہ کھینچا ہی وہ یہ ہی،

نوشابہ کو جب معلوم ہوا کہ سکندر کے دربار سے قاصد آتا ہی تو اس نے بڑے سا وسامان سے دربار آراستہ کیا، خود بھی بن ٹھن کر ہاتھ میں ایک ترنج لئے ہوئے تخت شاہی پر بیٹھی، سامنے پریچہرہ کنیزیں صف باندھ کر کھڑی ہوئیں، پھر سکندر کو طلب کیا، سکندر دربار میں آیا تو آداب شاہی کے موافق کمربند سے تلوار کھول کر رکھدی، لیکن سجدہ نہیں کیا، اس موقع پر دربار جو جواہرات سے جگ مگ کر رہا تھا، اسکو نہایت مبالغہ آمیز پیرایہ میں ادا کیا ہے،

خرامندہ را آتشیں گشت نعل	ز تابندہ یاقوت درخشندہ لعل
ہمہ گوہر آں جا بر انداختند	تگر کان و دریا بہم تاختند

قاصد کے شاہانہ طرز کلام سے نوشابہ کو شبہہ ہوا کہ یہ خود سکندر ہے، خوب غور سے دیکھا تو یقین ہو گیا، قاصد نے اب پیغام ادا کرنا شروع کیا، کہ شہنشاہ نے کہا ہی کہ ہماری طرف کیا کمی ہوئی جو تم نے بے اعتنائی کی، آج تک تم دربار میں نہ آئے، ہم ان اطراف میں بھی آئے، لیکن تم نے ادھر رخ نہ کیا،

نوشابہ نے کہا کہ آپ کی جرات پر صد ہزار آفریں ہی کہ آپ اپنا پیغام ادا کرتے ہیں، آپ کی باتیں تلوار کا کاٹ کرتی ہیں، یہ تلوار اور کس کی مجال ہے کہ مجھ پر چلائے،

[1] اس بیان میں فردوسی اور نظامی کے اشعار مکرر آگئے ہیں لیکن اس بحث کو اچھی طرح ذہن نشین کرنیکے لئے ایسا کرنا ضرور تھا،

سکندر انکار کرتا ہے کہ میں سکندر نہیں، پھر اسکی نہایت عمدہ توجیہیں بیان کرتا ہی کہ کجا سکندر، کجا میں، سکندر کے دربار میں آدمیوں کی کیا کمی ہے کہ خود قاصد بنکر آتا، اس موقع پر نوشابہ و سکندر کے سوال و جواب کو نہایت بلیغ انداز میں طول دیا ہی، آخر نوشابہ جھلا کر سکندر کی تصویر منگوا کر اسکو دکھلاتی ہے، اور سکندر لاجواب ہوکر رہجاتا ہی، اس کے ساتھ خطرہ کے خیال سے اسکے چہرہ کی رنگت زرد پڑجاتی ہے،

اس تمام سلسلہ میں کہیں سے کوئی کسر نہیں، تمام واقعات، اصلیت اور نیچر کے مطابق ہیں، اسکے ساتھ فصاحت و بلاغت، تشبیہات اور استعارات کی ندرت اور لطافت، الفاظ کی شان و شکوہ، ان تمام باتوں نے اس داستان کو سحر سامری بنا دیا ہی،

نظامی اور فردوسی میں یہ فرق اور بہت سے موقعوں پر نظر آتا ہی لیکن طول کے لحاظ سے ہم قلم انداز کرتے ہیں، سکندر و دارا کی گفتگو اوپر گذر چکی ہی، اسکو اس موقع پر ایک بار اور دیکھ لینا چاہئے، ان سب باتوں پر بھی فردوسی فردوسی ہی اور نظامی نظامی۔

چند ضروری باتیں

۱۔ شعر العجم کے چار حصوں میں سے یہ پہلا حصہ جو شائع ہو رہا ہی، اسمیں صرف قدیم شعرا کے حالات اور ان کی شاعری سے بحث ہے، دوسرا اور تیسرا حصہ مطبع میں جا چکا ہی۔ پہلے حصہ کی تالیف میں اگرچہ تدقیق اور محنت میں کچھ کمی نہیں کی گئی لیکن مجھکو صاف کہنا چاہئے کہ یہ حصہ اور تمام حصوں کی بہ نسبت کم دلچسپ ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیف کی دلچسپی یا شعرا کے حالات سے ہو سکتی تھی یا اُن اشعار سے جو جا بجا مثال میں پیش کئے جاتے ہیں، قدیم شعرا کے حالات کم ملتے ہیں، اور یہ حصہ قدما ہی تک محدود ہی۔ دقیقی، عنصری، نظامی بہت بڑے رتبہ کے شاعر ہیں لیکن انکے حالات اور واقعات اس قدر کم ہیں کہ مجبوراً چھوٹی چھوٹی باتوں کو لیکر پھیلانا پڑا ہے، قدما میں سے دور اوّل کی زبان آج بالکل نامانوس ہی، دقیقی، فردوسی، منوچہری، عنصری کے متواتر دو شعر بھی آجکل کی زبان میں نہیں ملتے۔ اسکے علاوہ انکی شاعری میں عشق کی چاشنی گویا ہی ہی نہیں اسلئے ان کے کلام میں آج کل کے لوگوں کو مزا نہیں آسکتا،

غرض یہ حصہ چنداں تفریح اور تفنن کے کام کا نہیں، اسکو ایک علمی خشک مضمون کی حیثیت سے پڑھنا چاہئے، باقی حصے البتہ دلچسپ، بامزہ اور رنگین ہیں،

۲۔ چونکہ کتابوں کی تفحص اور تلاش کا سلسلہ ابتک قائم ہی، اور بعض بعض نادر کتابیں

اس حصہ کی تصنیف کے بعد ہاتھ آئیں، اسلئے وہ معلومات جو ان کتابوں سے ہاتھ آئے اب چوتھے حصے کے کام آئیں گے، مثلاً تمام تذکروں میں مذکور ہی کہ ایران میں سب سے پہلے بہرام گور نے شعر کہا اور وہ یہ تھا،

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ
نام بہرام مرا و پدرم بو جبلہ

لیکن میں نے اس روایت کو اسلئے نظر انداز کیا تھا کہ اول تو یہ اُس زمانہ کی زبان نہیں ہوسکتی، دوسرے یہ کہ بہرام کے کلام میں ابوجبلہ عربی لفظ کیوں آتا، لیکن لب الباب عوفی کی پہلی جلد، کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہرام گور عرب میں پلا تھا، اور عربی زبان میں شعر کہتا تھا، چنانچہ عوفی نے اس کا عربی دیوان خود دیکھا تھا، لب اللباب میں یہ شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ مذکور ہے جس سے اُس کی ساخت اور زبان دونوں پر اثر پڑتا ہی۔

۳- دنیا میں ناممکنات کی ابتک جو فہرست تیار ہوچکی ہی، اس میں ایک نمبر کتاب کا صحیح چھپنا بھی اضافہ کرنا چاہئے، یہ مصیبت مدت سے مجھ کو پیش آتی ہی لیکن علاج کی کوئی صورت نہیں نکلتی، کاپیوں اور پروف کی تصحیح چنداں کام نہیں دیتی، چھپنے میں حرف کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں، کسی کتاب کے ساتھ غلط نامہ لگانا بھی بیکار سا ہے، غلط نامہ سے کتاب کو مطابق کرکے تصحیح کرنا، اتنی بڑی زحمت کون اُٹھائے، اسی بنا پر میں نے کبھی اس کا قصد نہیں کیا، لیکن شعر العجم فارسی لٹریچر کا آئینہ ہے، اسکی غلط بیانی کا اثر خود زبان پر پڑ سکتا ہی، اسلئے چار و ناچار میں خود زحمت اٹھاتا ہوں اور احباب کو

بھی زحمت دیتا ہوں، خفیف غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے، اسلئے موٹی موٹی غلطیاں لکھدی ہیں، ایک عام غلطی یہ ہی کہ بین السطور میں جہاں کہیں میں نے کسی لفظ کے نیچے اس کے معنی لکھدیئے ہیں کاتب صاحب وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے لفظ کے نیچے وہ معنی لکھدیتے ہیں، اور اس سے مصنف کی سخت جہالت ثابت ہوتی ہی،

ایک جگہ اہلِ مطبع نے نہیں بلکہ میں نے خود سخت غلطی کی ہی جس سے فردوسی کی شاعری پر حرف آتا ہی، اسلئے نہایت ندامت کے ساتھ فردوسی سے اسکی معافی چاہتا ہوں، کتاب کے ۱۶۰ صفحہ سطرہ میں یہ عبارت ہی،

"صلاح و مشورہ کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، اس میں کھانا بھی سامنے آگیا ہے، لوگ کھاپی کر اٹھ کھڑے ہوئے، اسکو اس طرح ادا کرتا ہی،

پے مشورہ مجلس آراستند — نشستند، خوردند و برخاستند

لیکن فردوسی کا شعر میں نے غلط نقل کیا، اور اسلئے معنی بھی غلط لکھے شعر کا دوسرا مصرع اصل میں یوں آیا ہی ع

نشستند و گفتند و برخاستند

نکتہ دانِ بلاغت جانتا ہی کہ اس ایک لفظ (گفتند) کے تغیر سے شعر برباد ہو جاتا ہی،

حصّہ دوم

خواجہ فریدالدین عطّارؒ سے حافظ اور ابن یمین تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف

تاریخ عجم

۱۳۲۴ھ

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف

تذکرہ

۱۳۲۵ھ

مصنّفہ

شبلی نعمانیؒ

باہتمام:- مولوی مسعود علی صاحب ندوی

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع شد

۱۹۴۷ء

فہرست مضامین

شعر العجم حصّۂ دوم

شعر العجم

حصہ دوم

(ساتویں صدی ہجری تا ۶۹۰ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاعری بلکہ تمام اسلامی علوم و فنون کا جوش شباب تھا کہ دفعۃً تاتار کی طرف سے اس زور کا طوفان اٹھا کہ دنیا کا شیرازہ بکھر گیا، یعنی ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے تاتار سے نکل کر خراسان سے شام تک بے چراغ کر دیا، کم و بیش چالیس لاکھ آدمی کا خون بہ گیا، سیکڑوں ہزاروں شہر خاک کے برابر ہو گئے، مدارس اور خانقاہوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، علمی خزانوں کا ایک ایک ورق اڑ گیا، لیکن اسلام کچھ ایسا سخت جان تھا کہ ان ہنگاموں پر بھی زندہ بچ گیا، بلکہ جوں ہی یہ طوفان تھمنا شروع ہوا، دبی ہوئی چنگاریاں پھر چمکیں اور چمک کر اس طرح مشتعل ہوئیں کہ ایک دفعہ پھر ع عالم تمام مطلع انوار ہو گیا،

چنگیز خاں ایک غارت گر کی شان سے اٹھا تھا، اور اپنی فوری اور سرسری انتظامات کے لئے اس نے کچھ قاعدے بھی بنا لئے تھے جو تورۂ چنگیز خانی کے نام سے مشہور ہیں، لیکن جب سلطنت کو استقلال ہوا تو شاہانہ نظم و نسق کی ضرورت پڑی، تاتاری لوٹ مار کے سوا

اور کچھ جانتے نہ تھے، اس لئے مسلمانوں سے اعانت لینے کے سوا چارہ نہ تھا، چنگیز خاں کے بعد اس کا بیٹا اوکتائی قاآن اور اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا، رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کرلیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا تکودار، خواجہ شمس الدین محمد وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہوگیا اور اپنا نام احمد رکھا، ترک اس پر بگڑ گئے اور ارغون خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کرکے ۶۸۳ھ میں قتل کردیا، لیکن جب ارغون خاں کا بیٹا غازان خاں ۶۹۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تو وہ بھی مسلمان ہوگیا، اور اس کے ساتھ ساٹھ ہزار ترک مسلمان ہوگئے، غازان ۷۰۳ھ میں مرگیا، اس کے بعد اس کا بھائی خدابندہ اور اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان ابوسعید بادشاہ ہوا، یہ تمام سلاطین نہایت عادل، انصاف پسند، مدبر اور دیندار تھے، اور بالخصوص سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس پر کندہ ہوکر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گذرے ہیں اپنی مثنوی جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے؛

دو جہاں را صلائے عید زدند	سکہ بر نام بوسعید زدند
در چمن گفت بلبل و قمری	مدح ایں گلبن اُولو الامری

سلطان ابوسعید نے ۷۳۶ھ میں وفات پائی، تمام ملک نے اس کے مرنے کا ماتم کیا یہاں تک کہ مسجد کے میناروں پر ماتمی کپڑے لپیٹے گئے اور ہر شہر کی گلی کوچوں میں کئی کئی دن تک خاک اڑتی رہی، چونکہ سلطان کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے ہر طرف سے سرداروں نے خودسری کی، آذربائجان، امیر چوبان و شیخ حسن جلائر نے دبا لیا، عراق اور فارس پر مظفریوں نے قبضہ کیا، غرض ۷۳۶ھ سے ۷۸۱ھ تک تمام قومیں پریشان رہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے فرماں روا آپس میں

لڑتے بھڑتے رہے، یہی زمانہ ہے جو تاریخ میں طوائف الملوکی کے نام سے مشہور ہے[1]،
بالآخر تیمور اٹھا اور تمام دعویداروں کو مٹا کر شہنشاہی قائم کی، اس کے خاندان میں
حکومت کا جو سلسلہ قائم ہوا، اس کا خاتمہ سلاطینِ صفویہ کے آغاز سے جا کر ملتا ہے جہاں سے
ہماری کتاب کا تیسرا حصہ شروع ہوتا ہے،

مذکورۂ بالا واقعات میں ہمارے کام کی جو باتیں ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں، اس نے مسلمانوں کے شجاعانہ
جذبات کو فنا کر دیا، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئیں شاعری
کے فرائض پورے کرنے کے لئے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً
ہمای ہمایوں خواجوی کرمانی، آئینۂ اسکندری امیر خسرو، سکندر نامۂ جامی، تیمور نامۂ
ہاتفی، شاہنامۂ قاسم گونابادی، اکبر نامۂ فیضی، لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے منہ چڑھاتے
ہیں، دل میں کچھ نہیں، قوم اس قدر افسردہ ہو گئی تھی کہ ان کتابوں کے دو شعر بھی زبانوں
پر نہ رہ سکے،

۲۔ عام قاعدہ ہے کہ مصیبت میں خدا زیادہ یاد آتا ہے، اس لئے اس عہد میں تصوف
کا زیادہ زور ہوا، عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، سعدی، مغربی، انہی اسباب
کے نتائج ہیں،

۳۔ جنگی جذبات کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا جو تصوف
کے سوا ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا یعنی غزل گوئی، یہ مسلّم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اُس کی
ابتدا شیخ سعدی اور اُن کے معاصرین سے ہوئی، یہ اسی کا اثر ہے،

[1] یہ تمام حالات اوّل سے آخر تک مجالس المومنین اور دولت شاہی سے لئے گئے ہیں،

تاتار اور تیمور کی عام سفاکی نے قوموں کی قومیں غارت کر دیں، بڑے بڑے کج کلاہوں اور اورنگ نشینوں کا تاج و تخت خاک میں ملا دیا، خراسان سے لے کر شام تک زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا، ام الدنیا بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، تمام بڑے بڑے پائے تختوں میں خاک اڑنے لگی، کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہو گئے، ان امور نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا تھا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے، شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے، ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا، اور پھر ایک روشش قائم ہو گئی، اور سب اسی انداز میں کہنے لگے،

۴- ترک اور مغل بادشاہ اگرچہ اکثر نہایت مدبر اور عادل تھے اور اس لئے ان کے عہد میں عام امن و امان رہا، لیکن طبیعتوں میں شاعری کا مذاق نہ تھا، اس لئے دربار میں شعرا کی چنداں قدر نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس دور کے جو مشہور شعرا ہیں، مثلاً سعدی، خواجہ حافظ مولانا روم، اوحدی، ابن یمین کسی دربار سے خاص تعلق نہ رکھتے تھے، نہ سلطنت سے انکو کوئی خطاب حاصل تھا،

۵- اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری میں فی الجملہ آزادی کی روح آئی، سعدی اور ابن یمین کے قصائد اور قطعات میں جو خوشامدانہ و بیہودہ گوئی کی جا بجا عیب گیری پائی جاتی ہے وہ اسی کا اثر ہے،

۶- تیموریہ خاندان جو ایران میں قائم ہوا اُس کا خاتمہ سلطان حسین مرزا پر ہوا، وہ عادل اور ہنر پرور ہونے کے ساتھ شعر و شاعری کا نہایت فریفتہ اور قدردان تھا، اس لئے اس کے عہد میں شاعری اس کثرت سے پھیلی کہ بچہ بچہ شاعر بن گیا والہ داغستانی، ریاض الشعرا

میں لکھتے ہیں،

دور عایت فضلا، وشعرا سعی بلیغ فرمودہ است و در تربیت شعرا آں قدر مبالغہ کردہ است کہ فن شاعری کہ فضیلت علوم را لازمہ داشت از علم جدا شد وہر بے مایہ بہ محض طبیعت موزوں، ارادہ شاعری کرد، رفتہ رفتہ فن شاعری کہ الطف فنون بود از درجۂ اعتبار افتادہ بہ مضحکہ انجامید،

سلطان حسین کا انجام، صفویہ کے آغاز سے ملا ہوا ہے، اس لئے صفویہ کے زمانہ میں دفعۃً جو ایران کے چپہ چپہ سے شعرا ابل پڑے، یہ وہی سلطان حسین کے ابر فیض کے رشحات تھے، والہ داغستانی کو تو یہ رنج ہے کہ اس تعمیم کی وجہ سے ہر عامی شعر کہنے لگا، اور علمی کمالات کی قید اٹھ گئی، لیکن ہمارے نزدیک، اسی بات نے شاعری کو شاعری کے رتبہ پر پہنچایا، بے شبہ پہلے شعرا کے لئے علوم عربیہ اور معقول و منقول سے واقف ہونا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان کمالات کے بوجھ میں اصلی جذبات دب کر رہ جاتے ہیں، وقار و متانت اور عوام کے معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے اکثر جذبات اس آزادی سے ظاہر نہیں ہوتے تھے جس طرح دل میں آتے تھے، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین کی عشقیہ شاعری، اس قدر اصلی جذبات سے لبریز ہے کہ قدما کے ہاں اس کا پتہ بھی نہیں لگ سکتا،

اس دور میں شاعری میں اصناف ذیل کو ترقی ہوئی،

تصوف، عطار، مولانا روم، اوحدی، عراقی، مغربی،

غزل، مولانا روم، شیخ سعدی، امیر خسرو، حسن، خواجہ حافظ،

اخلاق و موعظت، شیخ سعدی، ابن یمین،

قصیدہ گوئی، کمال اسمٰعیل، سلمان ساوجی،

قصیدہ گوئی میں، جو ترقی ہوئی، اُس کی تفصیل حسب ذیل ہی،

(۱) زبان زیادہ صاف ہوگئی، قدما کے دور میں ظہیر فاریابی نے زبان کو جس حد تک صاف کردیا تھا، وہ اس دور کی اخیر سرحد ہے، کمال اسمٰعیل نے اور بھی زیادہ صاف کیا،

(۲) مضمون آفرینی میں بہت ترقی ہوئی کمال نے ابتدا کی اور سلمان نے اس حد تک پہنچا دیا کہ متاخرین کی سرحد سے ڈانڈا مل گیا،

(۳) خاقانی و انوری وغیرہ جو علمی اصطلاحات سے کلام کو زیربار کرتے تھے، یہ بات جاتی رہی، اس عہد کے قصائد ایک عامی کو بھی دیدئے جائیں تو اصطلاحات وغیرہ کی بنا پر اس کو کہیں اٹکاؤ نہ ہوگا،

اب ہم اس دور کے مشہور شعرا، کا حال لکھتے ہیں،

اس موقع پر اس قدر لکھدینا ضرور ہے کہ اس دور کے ایک بڑے رکن شاعری یعنی مولانا روم کا تذکرہ ہم کو قلم انداز کرنا پڑا ہے جس کی وجہ یہ ہے، کہ ہم ان کے حالات اور ان کی شاعری پر ایک مستقل کتاب "سوانح مولانا روم" کے نام سے لکھ چکے ہیں، اور وہ گھر گھر پھیل چکی ہے،

در مکہ رستن مضمون رنگیں لطف نیست ۔۔۔ کم دہد رنگ ار کسی بند دحنائے بستہ را

خواجہ فرید الدین عطّار

(ولادت شعبان ۵۱۳ھ، وفات ۶۲۷ھ)

اصلی نام محمد تھا، فرید الدین لقب ہے، نیشاپور کے اضلاع میں کدگن ایک گاؤں ہے، وہاں کے رہنے والے تھے، ان کے والد ابراہیم بن اسحاق، عطاری کا پیشہ کرتے تھے، اور کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، باپ کے مرنے کے بعد انھوں نے کارخانہ کو اور زیادہ رونق دی، ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ نیشاپور کے تمام کارخانے خواجہ صاحب کے اہتمام میں تھے، ارباب تذکرہ متفقاً لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب ایک دن دکان میں بیٹھے ہوئے تھے، کسی طرف سے ایک فقیر آنکلا، اور اُن کی دکان کے ساز و سامان اور آرایش کو دیر تک غور سے دیکھا کیا، خواجہ صاحب نے ناراض ہو کر کہا کیوں بے فائدہ اوقات ضائع کرتے ہو اپنا راستہ لو، اس نے کہا تم اپنی فکر کرو، میرا جانا کیا مشکل ہے، میں یہ چلا، یہ کہہ کر وہیں لیٹ گیا، خواجہ صاحب نے اٹھکر دیکھا تو تمام ہو چکا تھا، سخت متاثر ہوئے، کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی اور سارا کاروبار چھوڑ کر فقیر ہو گئے،

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں، ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچہ میں آنے کے بعد بھی وہ اپنے قدیم پیشہ میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار اور عرفان کے حقائق پر کتابیں لکھتے رہے، مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ جو ان کی قابل قدر تصنیفیں ہیں، اسی زمانہ

کی تصنیف ہیں، چنانچہ خود لکھتے ہیں،

مصیبت نامہ کاندوہ جہان است | الٰہی نامہ کاسرار عیان است
به دار وخانه ہر دو کرد م آغاز | چہ گویم، زود رستم زین وآں باز

خواجہ صاحب کی تصریحات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عطار نہیں بلکہ طبیب بھی تھے، اور بڑے زور شور کا مطب تھا، روزانہ پان سو آدمی ان کے مطب میں آتے تھے، خسرو نامہ میں لکھتے ہیں،

به دار وخانه پانصد شخص بودند | که در ہر روز نبضم می نمودند
میان آں ہمہ گفت و شنیدم | سخن را به ازیں روے ندیدم

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں،

بمن گفت اے بمعنی عالم افروز | چنیں مشغول طب گشتی شب وروز
سہ سال است ایں زماں تا لب بہ بستی | بہ زہد خشک در کنجے نشستی

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب بچپن سے درد آشنا تھے، ان کے والد قطب الدین حیدر کے مرید تھے، جو مشہور مجذوب گذرے ہیں، اور ۵۹۶ھ تک زندہ تھے، جب کہ خواجہ صاحب کی عمر ۸۴ برس کی تھی، خواجہ صاحب نے بچپن ہی میں ان سے فیض حاصل کیا تھا[1]، لیکن چونکہ اسلام رہبانیت کو گوارا نہیں کرتا اور اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کو ان کے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دنیوی سے مانع نہیں آتیں، اس لئے خواجہ صاحب نے باوجود فقر و تصوف کے عطار خانہ اور مطب کا تعلق قائم رکھا، اور متعدد کتابیں اسی حالت میں تصنیف کیں، یہ ممکن ہے کہ اخیر میں جب جذبہ محبت زیادہ بڑھا تو خود بخود اور چیزوں سے دل

[1] دولت شاہ،

اچاٹ ہوگیا، اسی حالت میں فقیر کا واقعہ گذرا اور اس نے آگ پر روغن کا کام دیا خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم میں اُنھوں نے مدت تک سیاحی بھی کی؛ لسان الغیب میں لکھتے ہیں،

چار اقلیم جہاں گردیدہ ام . . . .

سر برآوردہ بہ مجوے عشق — سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق

کوفہ و رے تا خراساں گشتہ ام — یحییٰ و جیحونش را ببریدہ ام

ملک ہندوستان و ترکستان زمیں — رفتہ چوں اہل خطا از سوے چیں

عاقبت کردم بہ نیشاپور جاے — اوفتادہ از من بعالم ایں صداے

در نشاپورم بہ کنج خلوتے — با خداے خویش کردم وحدتے

خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا، لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے، خرقۂ فقر مجدالدین بغدادی سے حاصل کیا تھا،

مجدالدین بغدادی، قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب[۱] خاص تھے، جس زمانہ میں چنگیز خاں دنیا کے مرقع کو زیر وزبر کر رہا تھا، خواجہ صاحب نیشاپور میں تھے، نیشاپور کی غارت گری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب کو پکڑ کر قتل کر دینا چاہا، برابر سے ایک مغل بولا کہ ہزار روپیہ پر میرے ہاتھ بیچ ڈالو، خواجہ صاحب نے مغل سے کہا کہ اتنی قیمت پر کبھی نہ بیچنا میرے دام بہت زیادہ ہیں، ایک اور مغل آنکلا، اس نے کہا اس غلام کو میرے ہات ایک توبڑہ گھانس کے معاوضہ میں فروخت کر دو، خواجہ صاحب نے گرفتار کرنیوالے سے کہا ضرور بیچ ڈالو، میری قیمت اس سے کہیں کم ہے، خواجہ صاحب کی اس اختلاف بیانی

---

[۱] ریاض العارفین،

کو وہ تسخر سمجھا، اور ان کو قتل کر ڈالا، وہ اس نکتہ کو کیا سمجھ سکتا تھا کہ واقعی انسان سے بڑھکر کوئی چیز گراں نہیں، اور نہ اس سے بڑھکر کوئی چیز ارزاں ہی، لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین ہ

مغل نے خواجہ صاحب کو قتل کر دیا، لیکن خواجہ صاحب کا خون خالی نہیں جا سکتا تھا، مغل کو ان کی عظمت کا حال معلوم ہوا تو توبہ کرکے ان کے مزار کا مجاور ہو گیا، اور مرتے دم تک جدا نہ ہوا[1]،

خواجہ صاحب کی تصنیفات تصنیفات کی تفصیل یہ ہے، اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جوہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز، سیاہ نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ، ان کے علاوہ غزلوں اور رباعیوں کا دیوان ہے، کل اشعار ایک لاکھ سے زیادہ ہیں، فقراء کا ایک تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیاء کے نام سے مشہور ہے، اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہے، عبدالوہاب قزوینی نے جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے،

کلام پر رائے صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں، سنائی، اوحدی، مولانا روم، اور خواجہ فریدالدین عطار، خود مولانا روم باوجود ہم رنگی کے فرماتے ہیں، ع

ما از پس سنائی و عطار آمدیم

ہفت شہر عشق را عطار گشت ‏ ‏ ‏ ‏ ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں، لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا، ان پر خاتمہ ہو گیا، ہر قسم

---

[1] ریاض العارفین،

کے خیالات اس بے تکلفی، روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہو سکتے،

اس کے ساتھ قوت تخییل بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، بہت سے نئے مضامین پیدا کئے ہیں، اور جو پہلے بندھ چکے تھے، ان کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ مضمون کہ معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد،

سقراط، فارابی، بوعلی سینا، الگ الگ طریقہ سے ادا کر چکے ہیں، تاہم خواجہ صاحب نے اس کی بالکل صورت بدل دی، فرماتے ہیں،

عقل و حکمت تا شود گویا کسے ‌‌ ‌‌ کاملے گفتہ است می باید بسے

تا شود خاموش یک حکمت شناس ‌‌ ‌‌ باز باید عقل بے حد و قیاس

یعنی ایک کامل کا قول ہے کہ بولنے اور تقریر کرنے کے لئے بہت عقل اور حکمت درکار ہے، لیکن چپ رہنے کے لئے اس سے بھی کہیں زیادہ عقل درکار ہے مطلب یہ ہے کہ جب انسان انتہائے درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، تب جاکر یہ سمجھتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں سمجھا، اور اس بنا پر چپ ہو جاتا ہے، اسی خیال کو ایک رباعی میں ادا کیا ہے،

اسرار ہمہ جہاں توانی دیدن ‌‌ ‌‌ می پنداری کہ جاں توانی دیدن

کورتی خود آں زماں توانی دیدن ‌‌ ‌‌ ہر گاہ کہ بینش تو گردد بکمال

وحدت وجود کا مضمون حد سے زیادہ پامال ہو چکا تھا، تاہم خواجہ صاحب کے پیرائے نئے ہیں،

سوئی او زہرۂ اشارت نیست ‌‌ ‌‌ پر شناز دوست ہر دو کون لیک

فغانی نے اسی مضمون کو اڑایا ہے،

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست　　انما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

خواجہ صاحب کے اور مختلف طرز ادا دیکھو،

از برای غریب خود خود گشت　　جلوہ در قد و در قدم رفتار

تاب در زلف، و وسمہ برابرو　　سرمہ در چشم، و غازہ بر رخسار

رنگ در آب و آب در یاقوت　　بوی در مشک و مشک در تاتار

قم باذنی و قسم باذن اللہ　　ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار

تو از در یا جدائی دیں عجب بیں　　ز تو یک لحظہ ایں دریا جدا نیست

در عشق چو من توام تو من باش　　یک پیرہن ست گو دو تن باش

خواجہ صاحب کا جو فلسفہ ہے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا،

عبادت اور وحی کی حقیقت،

روزہ حفظ دل ست از خطرات　　پس بود با مشاہدہ افطار

حج چہ باشد ز خود سفر کردن　　بہ کجا؟ جانب بدایت کار

وحی چہ بود ہر انچہ در دل تو　　سر زند از نتائجِ اسرار

انسان اصل حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا،

قرب سی سال بود تا کہ ہمی کندم جاں　　کہ بجاں راہ برم راہ نہ بردم بہ تنم

گرچہ بسیاری سن بازی فکرت کردہ ام　　بیش ازیں چیزے نمی دانم کہ سر و چیز زم

وصل تو گنجے است ہم پنہاں ز خود　　ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست

بیگانہ شدم ز ہر دو عالم　　واگہ نہ کہ آشنای من کیست

چندیں در بستہ بے کلید است چہ سود　　کس نام کشادن نشنید است چہ سود

پیراہن یوسف ست یک یک ذرات ۔ یوسف زمیانہ ناپدیداست چہ سود

نقش تو درخیال ؤخیال از تو بے بصر ۔ نام تو برزبان وزباں از تو بے خبر

درحقیقت گر قدم خواہی زدن ۔ محو گردی تا کہ دم خواہی زدن

ہر آں ہستے کہ بنشاسد سراز پا ۔ از و دعویٰ ہستی ناپسنداست

اگر در عشق از عشقت خبر نیست ۔ ترا ایں عشق عشق سود منداست

عشق بتاں و خویشتن بفروش ۔ کہ نکوتر ازیں تجارت نیست

دریں دریا کہ من ہستم نہ من ہستم نہ دریا ہم ۔ نداند ہیچ کس ایں سر، مگر آں کو چنیں باشد

ترا در راہ یک یکدم چو معراجیست سوئے حق ۔ زیک یک پایہ برتر می گزر چندانکہ بتوانی

گرفتم در بہشت نسیہ نتوانی رسیدن تو ۔ ولے خود را ازیں دوزخ کہ نقد ست برہانی

اخیر شعر میں ان لوگوں کے خیال کو رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بہشت کوئی چیز نہیں اسکو ادھار سمجھنا چاہئے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ مانا کہ بہشت ادھار ہے لیکن یہ تو کرنا چاہئے کہ اس نقد دوزخ (تفکرات دنیوی) سے نجات ہات آئے،

تو چوں در بند صد چیزے خدا را بندہ چوں گردی ۔ کہ تو در بند ہر چیزے کہ ہستی بندۂ آنی

عالم حقیقت، کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے،

لب دریا ہمہ کفرست و دریا جملہ دینداری ۔ ولیکن گوہر دریا ورائے کفر و دیں باشد

انسان ہی میں سب کچھ ہے،

انچہ می جویند بیرون دو عالم سالکان ۔ خویش را یابند چوں ایں پردہ از ہم بردرند

بہمیں دیدہ بنگری ظاہر ۔ صورت خویش را بصورت یار

ہر کہ ایں جا ندیدہ محروم ست ۔ در قیامت ز لذت دیدار

انا لیلی بگو اگر مردے ورنہ چوں ابلہاں سری می خوار

وحدت وجود

جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ ہمہ در تو گم و تو درمیاں نہ

خموشی تو از گویائی تست نہانی تو از پیدائی تست

ترا با ذرہ ذرہ راہ بینم دو عالم تم وجہ اللہ بینم

دوئی را نیست رہ در حضرت تو ہمہ عالم توئی و قدرت تو

نکو گوے نکو گفتہ است در ذات کہ التوحید اسقاط الاضافات

خدارا جز خدا یک دوست کس نیست کہ در خورد خدا ہم اوست کس نیست

دریں معنی کہ من گفتم شکے نیست تو بے چیزی و عالم جز یکے نیست

کمال اسمٰعیل خلاق المعانی اصفہانی

(وفات ۶۳۶ سنہ ہجری)

اسمٰعیل نام، اور کمال تخلص تھا، ان کے والد جمال الدین عبدالرزاق مشہور شاعر تھے، ان کا پورا دیوان آج موجود ہے، آتش کدہ میں ان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، ان کے دو بیٹے تھے، عبدالکریم اور اسمٰعیل، عبدالکریم فقیہ تھے، اسمٰعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کئے تھے لیکن شاعری کا مذاق خاندانی تھا، اس لئے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا، خاندان صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جلال الدین خوارزم شاہ کی مدح میں بھی قصیدہ کہا ہے، جو دیوان میں موجود ہے، لیکن درباروں میں چنداں قدر نہیں ہوئی،

ایک دفعہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے ہیں اور سلاطین سے اعراض کرتے ہیں، بولے کہ صاعدیہ سخن فہم ہیں، اُن سے داد سخن ملتی ہی، اور میں اس کو صلہ سے بڑھ کر سمجھتا ہوں[2] تاہم چار و ناچار، سلاطین کی مدح بھی کرتے تھے، بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی، گرجستان کو فتح کرکے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے،

---

[1] یہ کوئی شاہی خاندان نہ تھا بلکہ اصفہان کے قضاۃ میں تھے،

[2] بہارستان سخن از شاہ نواز خاں مصنف مآثر الامراء

حجاب ظلم تو برداشتی ز چہرۂ عدل | نقاب کفر تو بکشادی از رخ ایماں

بالآخر افسردہ ہو کر ترک تعلقات کیا، اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہے، ایک دفعہ کسی بات پر اہل وطن سے ناراض ہوئے، اور نظم میں بددعا کی،

اے خداوند ہفت سیّارہ | بادشاہے فرست خوں خوارہ
تا درو کوہ را چو دشت کند | جوے خوں آرد از جو بارہ[1]
عدد مردماں بیفزاید | ہر یکے را کند بہ صد پارہ

۶۳۵ھ میں جب اوکتای قاآن، اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا، اس زمانہ میں یہ گوشہ نشین ہو چکے تھے، اور شہر کے باہر ایک زاویہ میں رہتے تھے، چونکہ لوگ ان کا ادب کرتے تھے، اور ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا، اس لئے اکثر لوگ نقدی وغیرہ ان کے گھر میں لاکر امانت کے طور پر رکھدیتے تھے، گھر میں ایک کنواں تھا، وہ ان امانتوں کا خزانہ بن گیا تھا، شہر کی غارت گری میں ایک ترک اس طرف نکل آیا، اور ایک پرند کو غلیل سے مارنا چاہا، اتفاق سے زہ گیر اڑ کر کنویں میں جا پڑی، ترک کنویں میں اترا، زر و جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں، سمجھا کہ اور بھی خزانے گڑے ہوں گے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا کہ پتہ بتاؤ، انھوں نے لاعلمی ظاہر کی، اس نے غصہ میں آکر ان کا خاتمہ کر دیا، مرتے وقت یہ رباعی کہی اور اپنے خون سے دیوار پر لکھی،[2]

دل خوں شد و شرط جانگدازی این است | در حضرت تو کمینہ بازی این است
با این همہ هیچ دم نمے باید زد | شاید کہ ترا بندہ نوازی این است

---

[1] اصفہان کے ایک محلہ کا نام ہے [2] یہ تمام حالات آتشکدہ اور دولت شاہ سے ماخوذ ہیں،

ریاض الشعرا میں ایک اور رباعی لکھی ہے، جو کمال نے اس حالت میں لکھی تھی وہ یہ ہے

این کشتہ نگر، کمال اسمٰعیل است　　قربان شدنش نہ از رہ تجمیل است
قربان تو شد کمال اندر رہ عشق　　قربان شدن از کمال اسمٰعیل است

ید بیضا میں لکھا ہے کہ ترک کی انگوٹھی گر گئی تھی، اس کے نکالنے کے لئے وہ کنویں میں اترا تھا، ید بیضا میں اس واقعہ کا سن ۶۲۶ھ لکھا ہے،

شاعری

کمال کی شاعری، قدما اور متاخرین کی مشترک سرحد ہے، یعنی اس کا ایک سرا قدما اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے، قدما کی متانت، پختگی، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی، خیال آفرینی، نزاکت مضمون، دونوں یکجا جمع ہو گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین دونوں ان کے معترف ہیں، خواجہ حافظ فرماتے ہیں،

گر با درست نمی شود از بندہ این حدیث　　از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم
گر برکنم دل از تو و بردارم از تو مہر　　آں مہر برکہ افگنم و دل کجا برم

عرفی کہتا ہے،

مرا ز نسبت ہمدردی کمال غم است　　وگرنہ شعر چہ غم دارد از غلط خوانی

حزیں کے زمانہ میں بحث پیدا ہوئی کہ کمال اور جمال میں سے کس کو ترجیح ہے، لوگوں نے حزیں سے استفتا کیا، اس نے یہ جواب لکھا،

در شعر جمال ارچہ جائے بکمال است　　اما نہ بہ زیبائی افکار کمال است
لفظش بہ صفا آئینۂ شاہد معنی است　　یعنی بہ نکوہے ست کہ طغرای ہلال است
صدبار از سر تا سر دیوانش گزشتم　　لیلی ست کہ سر تا بقدم غنج و دلال است
دریوزہ گر رشحۂ او ہیند حریفاں　　الحق رگ ابر قلمش بحر نوال است

کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں، کمال کی بلند پایگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو گی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجہ میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے،

کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ بہت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے جن سے متاخرین کی مضمون آفرینیوں کی بنیاد قائم ہوتی ہے مثلاً

چوں لب صبح باز کرد دہن را بوصف او — چرخش درست مغربی اندر دہاں نہاد
(اشرفی)

جب صبح نے بادشاہ کی تعریف میں منہ کھولا تو آسمان نے اس کے صلہ میں اسکے منہ میں اشرفی ڈالدی

انگند چار نعل ہلال، آسماں دو بار — تا بارکاب خواجہ عناں بر عناں نہاد

بیروں فگند چرم تو از وزباں زکام — از بسکہ بار جود بر دبیسکراں نہاد

۲۔ نہایت مشکل مشکل طرحیں کرتے ہیں، اور ان میں نئے نئے مضمون پیدا کرتے ہیں، مثلاً

در گرد عزم او نہ رسد برق گرم رو — ور زانکہ تش بود بہ مثل چوں شرارپائے

از یمن ہمت تو برآرم چو مور پر — از فرط عجز، اگرچہ ندارم چو مار پائے

ترسم کہ چوں دراز شد ایں شعر ہمچکس — در گوش خویش جا نہ دہد چوں ہزار پائے
(کھجورا)

ایک بڑا سیر حاصل قصیدہ لکھا ہے، جس کی ردیف برف ہے،

ہرگز کسے ندید بدینساں نشان برف — گوئی کہ لقمۂ ایست نیں در دہان برف

مانند پنبہ دانہ کہ در پنبہ تعبیہ است — اجرام کوہ گشتہ نہاں درمیان برف
(پھینکیدہ)

۳۔ زبان کی صفائی اور سلاست کی حد جو ظہیر فاریابی پر ختم ہو چکی تھی کمال نے اس سرحد کو اور آگے بڑھایا، مثلاً

سبیدہ دم کہ نسیم بہار سے آید — نگاہ کردم و دیدم کہ یار سے آید

شراب در سر، و چہرہ زشرم رنگ آمیز — چنیں میانہ شرم دعقار سے آید

رخش چو شاخِ درخت بہشت ہر گل زاں — کہ می بچیدم، دیگر بیار سے آید

اس کا چہرہ، بہشت کا درخت تھا کہ جو پھول میں چنتا تھا، اس کی جگہ دوسرا نکل آتا تھا

زبسکہ داشت دل خستہ بستہ در فتراک — چناں نمود مرا کز شکار سے آید

گرفتمش ہمہ رہ در حدیث واو گہ گہ — بقدر حاجت، پاسخ گزار سے آید

میں نے اسے باتوں میں لگایا اور وہ بھی کبھی کبھی بقدر ضرورت جواب دیتا جاتا تھا،

ہزاں فریب کہ از عشوہ بست در کام — مرا زسادہ دلی، اِستوار سے آید
یقین

مراغرور کہ تشریف می دہد، او خود — برائے خدمت صدر کبار سے آید
عزت

ایک قصیدہ میں ممدوح کی لیت ولعل کرنے کی شکایت ہے، ردیف ہیچ ہے

اور کس روانی سے ہر جگہ ادا ہوتی ہے،

صدرا روا مدار کز انعام خود مرا — محروم ماندہ داری وآں را بہانہ ہیچ

ہر روز بامداد کنم رو بہ درگہت — یک دل پر از امید وپس آنگہ نشانہ ہیچ

چندیں ہزار تیر معانی و شست طبع — کردم کشادہ و ماند از و بر نشانہ ہیچ

پنجاہ سال خدمت ایں خانہ کردہ ام — وامروز نیست بہرہ من جز فسانہ ہیچ

گر مستحق ہیچ نیم من، بدیں ہنر — پس نیست مستحق عطا، در زمانہ ہیچ

از طالعست اینکہ منِ آفتاب چرخ — مشہور عالمیم و براں آستانہ ہیچ

زانم نمید ہی کہ ترا در خزانہ نیست — یعنی کریم را نبود در خزانہ ہیچ

بر منہج امید من، از وعدہائے تو — دامے است بس شگرف ولٰاں ام و دانہ ہیچ

آگے اور عنوانوں کے نیچے جو اشعار آئیں گے، ان میں صفائی زبان کی خصوصیت پر بھی لحاظ رکھنا چاہئے،

۴۔ شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لچوں کی زبان بن گئی تھی، کمال نے اسکو نہایت لطیف اور پرمزہ کر دیا، اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ بیہودہ صنف سرے سے اڑا دیجاتی، لیکن ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا جس سے اُن کے معاش کو تعلق تھا، اس لئے وہ اس سے بالکل دست بردار نہیں ہو سکتے تھے، امرا اور سلاطین، جب صلہ کے دینے میں لیت ولعل کرتے تھے تو کمال ہجو اور ظرافت سے کام لیتا تھا، لیکن اس طرح کہ خود اُس شخص کو مزہ آئے جس کی ہجو لکھی گئی ہے، ایک دفعہ گھوڑے کے زین ولگام اور دانہ گھاس کے لئے ممدوح سے درخواست کی، دیکھو کس ظریفانہ پیرائے میں اس مطلب کو ادا کیا ہے،

دوش خر بندہ کرد پیشم یاد	کاسپک خواجہ زندگی بتو داد
تنگ دل گشتم (سائیس) از رہ خبر شش	کہ جواں بود وزیرک و استاد
گرچہ غمگین شدم ز واقعہ اش	گفتم الحق ازاں یکے دل شاد
کہ شنیدم کہ او بہ وقت وفات	بہ وصیت لب ودہاں بکشاد
از جو وکاہ واز جل وافسار	ہرچہ بُد، در وجوہ خیر نہاد
درجہاں وقت ایں چنیں توفیق (گھاس، زین، لگام)	بہمہ جانور رسند ابداً و (یعنی خیرات کیا)
واجبم گشت تعزیت نامہ	بتو اے سرور کریم نہاد
بر تو فرض است حق گزاری او	زانکہ در خدمتت بسے استاد

مستحق تر ز اسپ من نبود — گر وصیت ہمی کنی انفاد (جاری کرنا)

ہیچ تاخیر بر نتابد خیر — زود تعجیل کن کہ خیرت باد

یعنی کل سائیس نے مجھ سے یہ خبر بیان کی کہ حضور کا گھوڑا مرگیا، مجھکو سخت رنج ہوا لیکن اس خیال سے خوشی بھی ہوئی کہ اس نے مرتے وقت وصیت کی اور جو کچھ اس کے پاس ساز و سامان تھا، سب خیرات کر دیا، ایسی توفیق خدا سب کو دے بہرحال آپ پر اس کا بڑا حق ہے، اور آپ کو اس کی وصیت پوری کرنی چاہئے لیکن اس وصیت کا مستحق، میرے گھوڑے سے بڑھ کر کوئی نہیں،

ایک بخیل کی ہجو کی ہے،

دی مرا گفت دوستے کہ مرا (کل) — با فلاں خواجہ از پے دوسہ کار

سخنے چند ہست و از پے آں — خلوتے مے ببایدم ناچار

خلوتے آں چناں کہ اندر وے — ہیچ مخلوق را نباشد بار

گفتم ایں فرصت ار توانی یافت — وقت ناں خوردنش نگہ مے دار (گذر)

یعنی مجھ سے کل ایک دوست نے کہا کہ فلاں رئیس سے مجھ کو کچھ مخفی (خیال رکھو) کام ہے، اس لیے میں ایسی تنہائی کا موقع چاہتا ہوں، کہ اس وقت ان کے پاس کوئی نہ ہو میں نے کہا ایسا موقع صرف اُن کے کھانے کے وقت مل سکتا ہے،

ایک اور بخیل کی ہجو میں لکھتے ہیں،

نہ مرد فانی یادر کنم اگر گوید — کہ من بخانہ خود می خورم طعام حلال

نہ آنکہ مال حلالست، مرد فانی را — کدام مال کہ او دارد و کدام حلال

و لے ز مسکی آنگاہ مال خویش خورد — کز اضطرار مرا و را شود حرام حلال

یعنی فلاں شخص اگر کہے کہ میں اکل حلال کھاتا ہوں تو میں یقین کر لوں گا، لیکن نہ اس بنا
پر کہ درحقیقت اس کا مال پاک اور حلال ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ کھانا اتنی دیر کے بعد
کھاتا ہے، جبکہ مردار بھی حلال ہو جاتا ہے، (کم سے کم تین دن کے بعد)

ایک اور بخیل کی ہجو،

بد ہمین نان خواجہ چوں بردم | خواجہ گفتا کہ آہ من مردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر | کہ من این لقمہ را فرو بردم

کسی نے کمال کو برا کہا تھا، اس کے جواب میں کہتے ہیں،

شخصے بد ما بہ خلق مے گفت | ما از بدا و نے خراشیم
ما نیکی او بخلق گفتیم | تا ہر دو، دروغ گفتہ باشیم

(برا نہیں مانتے)

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ

نظام بے نظام ار کافرم خواند | چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمان خوانمش زیرا کہ نبود | سزاوار دروغے جز دروغے

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے،

ایک رئیس سے صلہ کا تقاضا کیا ہے اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے،

سہ شعر رسم بود، شاعران طامع را[1] | یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ورنداد ہجا | ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شعراء پہلے مدح کہتے ہیں، پھر صلہ کی یاد دہانی کے لئے ایک نظم لکھتے ہیں،
اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکریہ لکھتے ہیں، ورنہ ہجو، ہیں ان تینوں نظموں سے

---

[1] یہ اشعار انوری کی طرف بھی منسوب ہیں،

دو لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد ہوتا ہے،

غزل کی نسبت یہ مسلم ہے کہ سب سے پہلا خاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے، جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے، خان آرزو مجمع النفائس میں فغانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں،

قدما را در غزل طرزے بود بسیار سادہ، چوں نوبت بہ کمال الدین اسمٰعیل رسید، او رنگے دیگر داد، بعد از و شیخ سعدی و خواجو نمک دیگر ریختند،

کمال نے غزل میں سادگی اور صفائی کیساتھ نگینی اور جدت مضمون بھی پیدا کی، جس کا اندازہ ان مثالوں سے ہوگا،

دوش بگذشتم و دشنام ہمید اد مرا — خدمتش کردم و پنداشت کہ من نشنیدم

کل میں ادھر سے گذرا تو وہ مجھکو گالیاں دے رہا تھا، میں نے اسکو سلام کیا، وہ سمجھا میں نے گالیاں نہیں سنیں،

گرچہ بعلش بہ سر ناخوشی، آنہا میگفت — من از اں خوشتر ازو ہیچ سخن نشنیدم

اس کے ہونٹھ اگرچہ بری طرح گالیاں دے رہے تھے لیکن میں نے اس سے زیادہ خوش مزہ کوئی بات آج تک نہیں سنی

زمستاں است اندازی ندارد چشم کس ہرگز — مگر چشمش کہ چوں شد مست ناوک بہتر اندازد

مست آدمی اچھی طرح تیر اندازی نہیں کرسکتا، لیکن اسکی آنکھیں مستی میں اور زیادہ ٹھیک نشانہ لگاتی ہیں،

جدا انداز دمن تیرے، کنم در سینہ پنہانش — بداں تا از پے ہر تیر تیرے دیگر اندازد

از چشم نیم خواب تو امروز روشن است — آں نالہ ہا کہ در غم تو دوش کردہ ایم

بود ہمیشہ جان من رسم تو بے گنہ کشی — ہیچ نمی کشی مرا من چہ گناہ کردہ ام

زبان کی سادگی دیکھو،

روئے زاں خوبتر تواند بود؟ — ہاں بگوئید اگر تواند بود

آنچناں نازک وچناں شیریں — لب بناشد، ہشکر تواند بود

دل خود طلب چو کردم بر نرگس تو گفتا — بروائے فلاں وبہاں بر من چہ کار دارد

جو بسے بگفتم اور اکرشمہ گفت بامن — سر گفتگو ندارم، کہ مرا خمار دارد

مجھے خمار ہے

چہ دہی صداع مستاں چہ کنی حدیث چیزے — کہ کمینہ ہندوے من بہ ازیں ہزار دارد

تکلیف — غلام

بخشم دل بدام اندر کشیدی — پس آنگاہم، قلم بر سر کشیدی

بقصد جاں چوں من ناتوانے — ز روم و ہند و چیں لشکر کشیدی

پراگندہ ہمہ غمہاے عالم — ز بہر من، بہ یک دیگر کشیدی

اگرچہ آستیں بر من فشاندی — دگر چہ دامن از من در کشیدی

نہ خواہد رفت از یادم کہ بامن ق — شبے تا صبحدم ساغر کشیدی

رباعی

رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدما اور متوسطین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی،

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد و نیست — چوں دلبر من برنگ وبو باشد و نیست

صد روے فراہم آورد درسالے — باشد کہ یکے چو روے او باشد و نیست

شاید

گر لاف زنم کہ یار خوشخوست نہ — با ما بہ وفا و عہد نیکوست، نہ

زیں نادرہ ترکہ از براے تو مرا — شہرے ہمہ دشمن اند و تو دوست نہ

در دیدۂ روزگار نم بایستے — یا با غم او صبر بہم بایستے

یا مایۂ غم چہ عسمر کم بایستے　　یا عمر بہ اندازۂ غسم بایستے

یار آمد دوش کردش مہمانے　　ہر چش گفتم نہ کرد، نافرمانے
مے خورد و بخفت مست در رابستم　　وانگاہ بہ او چہ کردہ باشم دانے
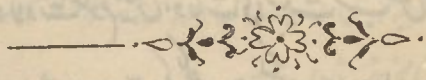
شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے، اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا۔[1]

سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی، عمر کی مدت عام تذکروں میں ۱۰۲ برس کی لکھی ہے، لیکن اس حساب سے سال ولادت ۵۸۹ھ ہوگا، شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرج ابن جوزی کے شاگرد ہیں، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا، جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں، ابن جوزی نے ۵۹۷ھ میں وفات پائی، شیخ کی ولادت اگر ۵۸۹ھ میں مانی جائے تو ابن جوزی کی وفات تک ان کی عمر کل ۹ برس کی ہوگی، اور یہ کسی طرح صحیح نہیں، بعض تذکروں میں شیخ کی عمر ۱۱۲ برس لکھی ہے، اگر یہ خارج از قیاس عمر مان لی جائے تو اور واقعات کی کڑیاں مل جائیں گی، لیکن ایک سخت دقت پھر بھی باقی رہتی ہے، وہ یہ کہ شیخ نے گلستاں میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں سلطان محمود خوارزم شاہ نے خطا سے صلح کی میں کاشغر میں آیا۔"

سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مرا ہے، اس لئے اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۸ برس کی ہوگی لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور کمالات نے کم از کم

---

[1] مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھدیا اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے، لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا، اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔ [2] تذکرۂ دولت شاہی،

۳۰-۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے، اس لئے یا تو شیخ نے غلطی سے علاء الدین تکش خوارزم شاہ کے بجائے محمود خوارزم شاہ کا نام لکھدیا ہے، یا اُن کی شاعری کی شہرت ان کے شباب ہی میں ہو چکی ہوگی،

شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلمبند نہیں کئے، لیکن خود شیخ کے بیانات سے بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں،

شیخ کے والد نے شیخ کو جب پڑھنے کے لئے بٹھایا تو لکھنے کی تختی، کاغذ اور ایک طلائی انگوٹھی خرید کردی، یہ اس وقت اس قدر کمسن تھے، کہ کسی نے مٹھائی دیکر ان سے انگوٹھی اڑالی، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

زعہد پدر یاد دارم بسے — کہ باران رحمت برو ہر دمے
کہ در طفلیم لوح و دفتر خرید — ز بہرم یکے خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکے مشتری — بخرمائے از دستم انگشتری

شیخ کے والد شیخ کو مزید محبت اور تربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے، ایک دفعہ عیدگاہ میں ان کو ساتھ لے کر چلے، ہات میں دامن پکڑا دیا تھا کہ ساتھ سے الگ نہ ہو جائیں، راستہ میں بچے کھیل رہے تھے، یہ دامن چھوڑ کر ان میں جا ملے اور باپ کا ساتھ چھوٹ گیا، کشمکش اور ہجوم میں باپ کی صورت نظر نہ آئی تو گھبرا کر رونے لگے، اتفاق سے باپ نے دیکھ لیا، کان پکڑ کر کہا احمق! تجھ سے کہا نہ تھا کہ دامن نہ چھوڑنا، اس قسم کے واقعات ہر بچہ کو پیش آتے ہیں، لیکن اس سے یہ پاکیزہ نتیجہ نکالنا کہ

تو ہم طفل راہی بسعی اے فقیر — برو دامن پیر دانا بگیر

شیخ کا کام ہے،

ان کے باپ ان کی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر ان کو ٹوکتے تھے اور ان کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، ان کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا، ایک دفعہ حسب معمول باپ کی صحبت میں رات بھر جاگے اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے، گھر کے اور آدمی غافل سو رہے تھے، ان کو خیال آیا، باپ سے کہا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں، کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لے، باپ نے کہا جانِ پدر! اگر تم بھی سو رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ لوگوں کی غیبت کر رہے ہو،

بچپن میں جب ان کو وضو کرنا نہیں آتا تھا، محلہ کے ایک مولوی صاحب سے روزہ اور نماز سیکھنی شروع کی، مولوی صاحب نے وضو کر کے سب آداب و سنن سکھا کر یہ بھی بتایا کہ روزہ میں دوپہر ڈھلنے کے بعد مسواک کرنا منع ہے، پھر کہا کہ ان فرائض کو مجھ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں جانتا ہوگا، گاؤں کا رئیس بالکل بڈھا پھوس ہو گیا ہے، رئیس نے سنا تو کہلا بھیجا کہ

نہ مسواک در روزہ گفتی خطاست　　بنی آدم مردہ خوردن رواست

یعنی تم نے خود بتایا کہ روزہ میں مسواک کرنا منع ہے، لیکن کیا مردہ کا گوشت کھانا (غیبت کرنا) جائز ہے،

شیخ کے باپ نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی، اور جس ناز و نعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے، خود کہتے ہیں،

من آنگہ سرِ تاجور داشتم　　کہ سر در کنارِ پدر داشتم

اگر بر وجود م نشستے مگس | پریشاں شدے خاطر چند کس
کنوں دشمناں گر برندم اسیر | نباشد کس از دوستانم نصیر
مرا باشد از درد طفلاں خبر | کہ در طفلی از سر برفتم پدر

لیکن ان کی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی ان کو اخلاقی سبق ملتے رہتے تھے، گلستاں میں لکھا ہے،

وقتے از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزردہ بہ کنجے نشست و گریاں ہمی گفت مگر خوردی را فراموش کردی کہ درشتی می کنی (باب ششم)

طالب علمی

شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا، سیکڑوں علما و فضلا درس و تدریس میں مشغول تھے، اس کے علاوہ آتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ موجود تھا، لیکن اس زمانہ میں تحصیل کمال کے لئے ممالک دور و دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا تھا، اس زمانہ میں سب سے بڑا مدرسہ جس کو یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں، نظامیہ بغداد تھا، شیخ نے نظامیہ میں تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ عام طریقہ تھا، مدرسہ سے کچھ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ نظامیہ میں انھوں نے کس سے تحصیل علم کی، ان قرائن سے کہ شیخ نے ابن جوزی کی شاگردی کی، ابن جوزی بغداد میں رہتے تھے، شیخ نظامیہ میں حدیث پڑھتے تھے، لوگوں نے نتیجہ نکالا ہے کہ شیخ نے نظامیہ میں ابن جوزی ہی کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا، لیکن مدرسین نظامیہ کی فہرست میں ہم ابن جوزی کا نام نہیں پاتے، بے شبہہ ابن جوزی بغداد میں حدیث کا درس دیتے تھے، لیکن اپنے مکان پر دیتے ہوں گے، نظامیہ سے ان کا

---

[1] جامع التواریخ ص۳،

تعلق ثابت نہیں ہوتا،

یہ عجیب بات ہے کہ ابن جوزی کا اثر شیخ کی تعلیم پر نہیں پڑا، ابن جوزی ان محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں جو حدیث اور روایت میں نہایت سخت احتیاط سے کام لیتے تھے اور مشتبہ اور ضعیف روایتوں کو بالکل ترک کر دیتے تھے، لیکن شیخ اتفاق سے کہیں کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو عموماً ضعیف بلکہ مصنوعی ہوتی ہے، مثلاً

سزد گر بدورش بنازم چناں — کہ سید بہ دوران نوشیرواں

یا مثلاً لی مع اللہ وقت لا یسعہ ملک مقرب الخ

یا مثلاً حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث زر غبا تزدد حبا الخ

یا مثلاً طبیب فارس کی حدیث وغیرہ وغیرہ،

شیخ کی تحصیل علمی کا وہ زمانہ ہے، جب اتابکان فارس کے سلسلہ میں سے سعد زنگی تخت حکومت پر متمکن تھا، وہ نہایت عادل اور صاحب جبروت حکمراں تھا، لیکن معلوم نہیں کیا اسباب تھے کہ شیخ کو شیراز میں امن و آسایش سے رہنا نہیں نصیب ہو سکتا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں،

سعدیا حب وطن گرچہ حدیثے است صحیح — نتواں مرد بہ سختی کہ من آنجا زادم

غرض شیخ نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر، سیر و سیاحت شروع کی اور ایک مدت دراز تک سفر کرتے رہے، جس کی مدت عام تذکرہ نویس ۳۰ برس لکھتے ہیں،

سیر و سیاحت کی غرض مختلف ہوتی ہے اور جو غرض پیش نظر ہوتی ہے، سیاح اسی حیثیت سے تمام چیزوں کو دیکھتا ہے، بلکہ تمام چیزیں اسی حیثیت سے خود اس کی نظر میں جلوہ گر ہوتی ہیں، شیخ میں کثرت سے مختلف حیثیتیں جمع تھیں، وہ

سیر و سیاحت

شاعر تھے، صوفی تھے، فقیہ تھے، واعظ تھے، حسن پرست تھے، رند تھے، شوخ طبع تھے، اس لئے اُنھوں نے تماشاگاہِ عالم کو ہر ہر پہلو سے دیکھا،

وہ کبھی زہد و ریاضت کے عالم میں حج و زیارت کے لئے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں، نہایت دشوار گذار اور چٹیل صحراؤں میں پیادہ پا سیکڑوں کوس چلے جاتے ہیں، رات رات بھر کی متصل پیادہ روی سے تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور عین راستہ میں پتھریلی زمین پر پڑ کر سو جاتے ہیں، کبھی نفس کشی کے لئے بیت المقدس میں کاندھے پر مشک رکھ کر سقائی کرتے ہیں، لوگوں کو پانی پلاتے پھرتے ہیں، کبھی صاحبِ دل درویش کا تذکرہ سن کر اس کی زیارت کے لئے روم پہنچتے ہیں، کبھی انبیاؑ کے مزارات پر اعتکاف کرتے ہیں، جمعہ کا دن ہے، نماز کو جانا چاہتے ہیں، لیکن پاؤں میں جوتی نہیں، دل میں شکایت پیدا ہوتی ہے، دفعۃً ایک شخص پر نظر پڑتی ہے، جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں، صبر آجاتا ہے، اور سمجھ جاتے ہیں کہ صبر و رضا کی تعلیم ہے،

ایک دفعہ لوگوں کی صحبت سے تنگ آکر بیت المقدس کے صحرا میں بادیہ نوردی شروع کی، اتفاق سے عیسائیوں نے پکڑ لیا اور طرابلس (ٹریپولی) میں خندق کھودنے کے کام پر لگایا، بہت پریشان ہوئے، لیکن مجبور تھے، اتفاق سے ایک قدیم دوست کا ادھر گذر ہوا، پوچھا خیر ہے؟ فرمایا،

ہمے گریختم از مردماں بکوہ و بہ دشت	کہ از خدائے بنودم بہ دیگرے پرداخت
قیاس کن کہ چہ حالت بود دریں ساعت	کہ با طویلۂ نامردم ببایدساخت

یعنی جو شخص آدمیوں سے بھاگتا پھرتا تھا، جب جانوروں میں پھنس جائے تو اس کی کیا حالت ہوگی، دوست کو رحم آیا، فدیہ دے کر ان کو چھڑایا، اور اپنے ساتھ

حلب میں لائے مزید عنایت سے سو اشرفی مہر پر اپنی بیٹی کیساتھ شادی کر دی لیکن صاحبزادی نہایت شوخ اور زباں دراز تھیں، شیخ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی، ایک دن کہنے لگیں تم اپنی ہستی بھول گئے، تم وہی تو ہو کہ میرے باپ نے دس دینار دیکر تم کو چھڑایا، شیخ نے کہا ہاں دس دینار دیکر چھڑایا، لیکن سو دینار کے عوض پھر گرفتار کرادیا،

شیخ نے تصوف و سلوک کی تعلیم شیخ شہاب الدین سہروردی المتوفی ۶۳۰ھ سے حاصل کی، اسی سیاحت کی بدولت سفر دنیا میں ان کا ساتھ ہوا، اور ان کے فیض صحبت سے شیخ نے تزکیۂ نفس کے مراتب طے کئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

مرا پیر دانائے فرخ شہاب — دو اندرز فرمود بر روے آب
یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

ایک دفعہ بعلبک کی جامع مسجد میں وعظ کہہ رہے تھے اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید کا نکتہ بیان فرما رہے تھے، کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا تاہم یہ اپنے عالم میں مست تھے اور یہ شعر زبان پر تھا،

دوست نزدیک تراز من بہ من است — ویں عجب ترکہ من ازوے دورم
چہ کنم با کہ تواں گفت کہ او — در کنار من و من مہجورم

اتفاق سے کوئی صاحب دل آنکلے، انھوں نے بیساختہ نعرہ مارا، ان کے اثر سے مجلس کی مجلس گرما گئی، شیخ کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ "دوران با بصر نزدیک و نزدیکان بے بصر دور"، ایک دفعہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے قاضی کے دربار میں گئے، اور اونچی صف میں جاکر بیٹھے، قاضی صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھا اور میر دربار نے جو لوگوں کو حسب مدارج بٹھانے پر مامور تھا، ان کے پاس آکر کہا،

ندانی کہ برتر مقام تو نیست   فروتر نشیں یا بر و یا بالیست

بیچارے وہاں سے اٹھ کر صف پائیں میں آکر بیٹھے، تھوڑی دیر کے بعد حسب معمول کسی فقہی مسئلہ پر بحث چھڑی اور ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں بلند ہوئیں، لیکن کوئی شخص کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہتا تھا کہ سب اس کے سامنے سر جھکا دیں، شیخ کو اظہار کمال کا موقع ملا، صف پائیں سے للکار کر کہا،

کہ برہان قوی باید و معنوی   نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

لوگوں نے ان کی طرف توجہ کی، انھوں نے اس خوبی سے اس مسئلہ کو سلجھا کر ادا کیا کہ سب مان گئے، یہاں تک کہ خود قاضی صاحب صدر مجلس سے اٹھے اور اپنی پگڑی اتار کر ان کے سر پر رکھدی،

اُس زمانہ میں اتنا انصاف بھی تھا، آج کا دن ہوتا تو کوئی اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا،

اسکندریہ کے مشہور قحط میں جس میں لوگ بھوک کے مارے آدمی کو زندہ بھون کر کھا جاتے تھے، ایک دولتمند مخنث نے اپنا خوان کرم اس قدر وسیع کر رکھا تھا کہ کسی شخص کے لئے روک نہ تھی، شیخ اس زمانہ میں اسکندریہ ہی میں تھے، ان کے دوستوں نے ان سے کہا کہ مخنث کی دعوت میں چلنا چاہئے، ان کی خودداری نے گوارا نہ کیا، اور کہا

نہ خوردشیر، نیم خوردۂ سگ   ور زسختی بمیرد اندر غار

شیخ کی آزادہ روی اور تجرد کے لحاظ سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اہل عیال کا جھگڑا نہیں خریدا ہوگا، لیکن تاریخی شہادتیں موجود ہیں، کہ انھوں نے اس تجربہ گاہ کی بھی سیر کی، ایک دفعہ تو وہی مجبوری کا تعلق اختیار کرنا پڑا تھا، جس کا ذکر اوپر گذر چکا، دوسری دفعہ

صنعا، (یمن کا صدر مقام) میں نکاح کا اتفاق ہوا، اور اس سے اولاد ہوئی، لیکن بچپن ہی میں جاتی رہی، باوجود آزادی کے شیخ کو اس کا بہت صدمہ ہوا چنانچہ خود بوستاں میں فرماتے ہیں،

به صنعا درم طفلے اندر گذشت　　　چه گویم کزانم چه بر سر گذشت

یہاں تک کہ حواس باختہ ہوئے کہ قبر کا ایک تختہ اکھاڑ کر لخت جگر کو دیکھنا چاہا، لیکن ہولناک منظر دیکھ کر کانپ اٹھے اور غشی سی طاری ہوگئی، ہوش میں آئے تو فرزند دلبند نے زبانِ حال سے کہا،

شب گور خواہی منور چو روز　　　ازینجا چراغِ عمل بر فروز

جس زمانہ میں سلطان خوارزم شاہ نے خطاوالوں سے صلح کرلی، شیخ کاشغر میں آئے جامع مسجد میں ایک مدرسہ تھا جس میں حسب دستور درسیات کی ابتدائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، سیر کرتے کرتے مدرسہ میں آئے، ایک خوش جمال لڑکا زمخشری کی کتاب (غالبًا مفصل ہوگی) پڑھ رہا تھا اور یہ فقرہ زبان پر تھا ضرب زید عمرا شیخ نے کہا خوارزم و خطا میں صلح ہوگئی اور زید اور عمر کا جھگڑا اب تک ختم نہیں ہوچکا، لڑکا ہنس پڑا اور اُن کا نام و نشان پوچھا، اُنھوں نے کہا شیراز، شیخ کا شہرہ عالمگیر ہوچکا تھا، شیراز کا نام سُن کر اس نے کہا سعدی کے شعر بھی کچھ آپ کو یاد ہیں؟ اُنھوں نے عربی کے دو شعر اسی وقت موزوں کرکے پڑھے، لڑکا سمجھ نہ سکا، بولا کہ ہمارے ملک میں تو اُن کے فارسی شعر مشہور ہیں، آپ فارسی شعر پڑھتے تو میں سمجھ بھی سکتا، شیخ نے برجستہ کہا،

ای دلِ عشاق بدامِ تو صید　　　ما بتو مشغول و تو با عمرو زید

دوسرے دن کسی نے لڑکے سے کہدیا کہ یہی سعدی ہیں، وہ دوڑا ہوا شیخ کے پاس گیا،

اور نہایت اخلاص و عقیدت ظاہر کی، اور کہا کہ آپ نے نام کیوں نہیں ظاہر فرمایا، کہ میں خدمت گذاری کی سعادت حاصل کر سکتا، شیخ نے جواب دیا ع

باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم
تیرے سامنے میں یہ کہہ نہ سکا کہ میں ہوں

لڑکے نے عرض کی کہ چند روز آپ کا قیام ہوتا تو سب آپ سے مستفید ہوتے، شیخ نے کہا نہیں میں نہیں ٹھہر سکتا، پھر یہ اشعار پڑھے،

بزرگے دیدم اندر کوہسارے
قناعت کردہ از دنیا بہ غارے

بدو گفتم بہ شہر اندر نیائی
کہ بارے بندے از دل برکشائی

بگفت آنجا پری رویانِ نغز اند
چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

وقت کی تہذیب دیکھو، شیخ جیسا مقدس اور صوفی منش، ایک امرد کو گلے لگاتا ہے، پیار کرتا ہے، منہ چومتا ہے اور پھر دیدہ دلیری سے کہتا ہے،

ایں بگفتیم و بوسۂ چند بر سر و روی یک دیگر دادیم و وداع کردیم،

بوسہ دادن بروی یار چہ سود
ہم دراں لحظہ کردنش بدرود

اسی عالم سیاحت میں شیخ ہندوستان میں بھی آئے، عام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ شیخ امیر خسرو سے ملے تھے، لیکن مستند تاریخوں میں اسی قدر ہے کہ امیر خسرو کے ممدوح خان شہید[1] نے دو دفعہ شیخ کو شیراز سے طلب کیا، لیکن شیخ نے بڑھاپے اور ضعف کا عذر کیا، اور گلستان و بوستاں اپنے ہاتھ سے لکھ کر تحفہ میں بھیجی،

خان شہید نے امیر خسرو کا کلام بھی بھیجا تھا، شیخ نے اس کی بہت تحسین کی اور لکھا کہ یہ جوہر قابل قدر دانی کے قابل ہے،

---

[1] خان شہید نے ۶۸۲ھ میں شہادت پائی اور شیخ سعدی کے بلانے کا واقعہ اسی سنہ کے دو چار برس قبل کا واقعہ ہے

ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے بوستان میں لکھا ہے، لیکن بیان واقعہ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہو جاتا ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ سومنات میں آئے، یہاں ایک عظیم الشان بت خانہ تھا، پوجاریوں سے راہ و رسم پیدا کی، ایک دن ایک برہمن سے کہا کہ مجھکو سخت تعجب ہے کہ ایک پتھر کو لوگ کیوں پوجتے ہیں وہ نہایت برہم ہوا اور تمام بت خانہ میں یہ چرچا پھیل گیا، سب ان پر ٹوٹ پڑے اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، انھوں نے کہا بت کے ظاہری حسن و خوبی کا میں بھی معترف ہوں، لیکن جاننا چاہتا ہوں کہ معنوی کمال کیا ہے، برہمن نے کہا ہاں یہ پوچھنے کی بات ہے، میں نے بھی بہت سفر کئے، اور ہزاروں بت دیکھے، لیکن جو معجزہ اس میں ہے کسی میں نہیں، یہ ہر روز صبح کو دعا کے لئے خود ہاتھ اٹھاتا ہے، چنانچہ دوسرے دن شیخ نے یہ شعبدہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا شیخ کو نہایت حیرت ہوئی اور اس فکر میں ہوئے کہ اصل راز کیا ہے، تقیۃً بت کے ہاتھ چومے اور بہت خشوع و خضوع ظاہر کیا اور بت خانہ میں اس عقیدت کے ساتھ رہنے لگے جیسے پوجاری مندر میں رہا کرتے ہیں، برہمنوں کو جب ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو ایک دن بت خانہ کا پھاٹک بند کر کے چاروں طرف نظر دوڑائی، دیکھا تو بت کی پشت کی طرف ایک مغرق پردہ ہے، پردہ کی اوٹ میں ایک شخص بیٹھا ہوا ہے جس کے ہاتھ میں ایک رسی ہے، رسی میں بت کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اندر سے یہ شخص رسی کو کھینچتا ہے، تو ہاتھ اٹھ جاتے ہیں، ان کو دیکھکر وہ شخص بھاگا، انھوں نے تعاقب کر کے اس کو کوئیں میں ڈھکیل دیا، اور خود بھاگ نکلے؛

ان واقعات کے بیان میں، عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بتایا ہے، حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے، اس لئے اس کا بت نہیں بنا سکتے، برہمنوں کی

لکھا ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے،

فتادند گبران پاژند خواں چو سگ با من از بہر آں استخواں

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں بلکہ پارسیوں کا صحیفہ ہے،

برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں،

پس پردہ مطران آذر پرست

حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں، پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے، ان جزئیات کے سوا اصلی واقعہ بھی نہایت دور از قیاس ہے، شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے، لیکن یہ ناممکن تھا کہ ایک ایسے عظیم الشان بتخانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے ان کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے اور ان کو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہتے کرتے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ تازہ ولایت تھے، خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے، اکثر انگریز سیاحوں کا یہی حال ہے، دو چار دن ہندوستان میں رہکر سفرنامے لکھتے ہیں، جن کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو غور کرنا پڑتا ہے، کہ یہ کس ملک کی داستان ہے،
شیخ نے اس حکایت کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ سومنات سے میں ہندوستان میں آیا، غالباً اس زمانہ میں ہندوستان خاص دہلی اور نواح دہلی کو کہتے ہونگے لیکن شیخ نے کچھ زیادہ تصریح نہیں کی اور نہ کہیں سے پتہ لگتا ہے کہ کہاں تک پہنچے تھے،

شیخ نے جب سیاحت شروع کی تو فارس میں اتابکان سعدی کی حکومت تھی یہ سلسلہ بھی اور سلسلوں کی طرح سلجوقیوں کا دست پرور تھا، اس سلسلہ کا پانچواں حکمراں سعد زنگی شیخ سعدی کا ہمعصر تھا، لیکن اس کے اخیر زمانہ تک سعدی وطن میں نہیں آئے،

صاف نہیں کھلتا کہ اس کے اسباب کیا تھے، لیکن شیخ کی بعض تلمیحات سے معلوم ہوتا ہی کہ شیخ کو اس زمانہ میں امن و امان کی طرف سے اطمینان نہ تھا، سعد زنگی نے ۶۲۳ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بیٹا اتابک ابو بکر بن سعد زنگی تخت نشین ہوا، وہ نہایت شان و شوکت کا بادشاہ تھا، فارس کی حکومت جو دو سو برس سے تاراج گاہ بن رہی تھی، اس کے زمانہ میں عروسِ رعنا بن گئی، ہر طرف نظم و نسق قائم ہو گیا، جابجا مدرسے اور درس گاہیں کھل گئیں، علماء و فضلا و شعرا دور دور سے کھنچ آئے، شیخ ہمیشہ وطن کے شوق میں بیتاب رہتے تھے اور وطن پہنچنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں،

چہ خوش سپیدہ دمے باشد آنکہ بینم باز	رسیدہ بر سر اللہ اکبر[1] شیراز
نہ لائق ظلمات ست باللہ ایں اقلیم	کہ تختگاہ سلیماں بُدست و حضرت راز

اب جو امن و امان کی طرف سے اطمینان ہوا تو شام سے عراق و عجم ہو کر شیراز میں آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں غریب الوطنی اور مراجعت کی وجہ تبصریح لکھی ہی،

ایک قطعہ میں اس سے بھی زیادہ صاف لکھا ہی،

ندانی کہ من در اقالیم غربت	چرا روزگارے بکردم درنگی
بروں رفتم از تنگ ترکاں کہ دیدم (کش مکش)	جہاں درہم افتادہ چوں موے زنگی
ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن	چو گرگاں بخونخوارگی تیز چنگی
چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم	پلنگان رہا کردہ خوے پلنگی
چناں بود در عہد اوّل کہ دیدم	جہاں پُر ز آشوب تشویش و تنگی

[1] اللہ اکبر، شیراز کے ایک چشمہ کا نام ہے،

چنیں شد در ایام سلطانِ عادل　　　اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

شیراز پہونچ کر شاہی تعلقات سے بالکل آزاد رہنا تو ممکن نہ تھا، ابوبکر بن سعد زنگی کے درباریوں میں داخل ہوئے، مدحیہ قصائد لکھے، گلستان اور بوستان اسی کے نام سے معنون کی، غالباً صلے بھی (بلا طلب) ملے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آزاد مزاجی کی وجہ سے دربار کے قابل نہ تھے اور ابوبکر بن سعد نے اس وجہ سے ان کی چنداں قدر دانی نہیں کی، چنانچہ ایک قصیدہ میں ہلکی سی شکایت بھی کی ہے،

بہ دولتت ہمہ افتادگاں بلند شدند　　　چو آفتاب کہ بر آسماں برد شبنم

مگر کمینۂ آحاد بندگان سعدی　　　کہ سعیش از ہمہ بیش است و حظش از ہمہ کم

انکیانو جو اباقاآن خاں (پسر ہلاکو خاں) کی طرف سے خاندانِ اتابک کے انقراض کے بعد شیراز کا گورنر مقرر ہوا تھا، اس کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں،

سعدیا چنداں کہ میدانی بگو　　　حق نباید گفتن الا آشکار

ہر کرا خوف و طمع در بار نیست　　　از خطا باکش نباشد وز تتار

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایشیائی درباروں میں کیونکر فروغ پا سکتے تھے،

غرض ابوبکر بن سعد نے تو ان کے رتبہ کے موافق ان کا احترام نہ کیا، لیکن جو امراء خود صاحب علم و فضل تھے وہ شیخ کی پرستش کرتے تھے،

اس زمانہ میں علم و فضل کے اصلی پشت و پناہ شمس الدین صاحب دیوان اور علاء الدین تھے،

خواجہ شمس الدین، ہلاکو خاں کا وزیر اعظم تھا، اور ہلاکو خاں کے زمانہ میں باوجود

اختلاف مذہب اور تاتاریوں کی سفاکی کے اسلام کا جو نام و نشان رہ گیا، وہ صرف خواجہ شمس الدین کا صدقہ تھا، تاتاریوں میں جو اسلام پھیلا وہ بھی خواجہ شمس الدین ہی کی بدولت تھا، سب سے پہلے اس سلسلہ میں نکودار (ہلاکو خاں کا بیٹا) اسلام لایا اور سلطان احمد کے لقب سے ملقب ہوا، نکودار نے خواجہ شمس الدین ہی کی ہدایت اور ترغیب کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا،

خواجہ شمس الدین کا دوسرا بھائی علاء الدین ہلاکو خاں کی طرف سے بغداد کا حاکم تھا اور نہایت صاحب فضل و کمال تھا، تاتاریوں کی سب سے مفصل اور مستند تاریخ جہانکشا اسی کی تصنیف ہے، یہ دونوں بھائی شیخ سعدی کے مرید اور معتقد خاص تھے، شیخ ایک دفعہ جب حج سے واپس آکر تبریز میں آئے جو ہلاکو خاں کا پایہ تخت تھا تو خواجہ شمس الدین سے ملنے گئے، اتفاق یہ کہ ادھر سے اباقاآن خان (پسر ہلاکو خاں) کی سواری آرہی تھی، خواجہ شمس الدین اور علاء الدین بھی ساتھ تھے، شیخ نے اس خیال سے کہ تعارف کا یہ موقع نہیں، چاہا کہ نظر بچا کر نکل جائیں، اتفاق سے دونوں بھائیوں نے ان کو دیکھ لیا، گھوڑوں سے اتر پڑے اور جاکر شیخ کے ہاتھ پاؤں چومے، اباقاآن خاں دیکھ رہا تھا، اس کو سخت حیرت ہوئی کہ برسوں سے یہ میرے دربار میں ہیں اور نمک خوار ہیں تاہم جو تعظیم انھوں نے اس بوڑھے کی کی، میری بھی کبھی نہیں کی، جب دونوں بھائی شیخ سے رخصت ہوکر جلوس میں شامل ہوئے تو اباقاآن نے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا؟ جس کی تم نے اس قدر تعظیم و تکریم کی، انھوں نے کہا، یہ ہمارا باپ تھا، اباقاآن نے کہا تمھارا باپ تو مر چکا ہے، بولے کہ پدر طریقت ہے، حضور نے سعدی کا نام سنا ہوگا، جن کی نظم و نثر آج تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے، وہی بزرگ ہیں، اباقاآن ملنے کا مشتاق ہوا، دوسرے دن دونوں بھائی شیخ کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور بادشاہ کا پیغام کہا، شیخ نے انکار کیا، لیکن ان لوگوں نے اس قدر اصرار کیا کہ شیخ کو چارنا چار جانا پڑا، اباقاآن سے دیر تک صحبت رہی، چلتے چلتے اس نے کہا کہ مجھکو کچھ نصیحت فرماتے جایئے، شیخ نے کہا مرنے کے بعد صرف اعمال ساتھ جائیں گے، اب تم کو اختیار ہے کہ اچھے اعمال ساتھ لے جاؤ یا بُرے، اباقاآن نے کہا اس مضمون کو نظم کر دیجئے، شیخ نے برجستہ کہا،

شہے کہ حفظِ رعیّت نگاہ می دارد   حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است

وگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد   کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

اباقاآن کے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے، اور کہا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ؟ شیخ نے کہا اگر راعی ہو تو پہلا شعر حسب حال ہے، ورنہ دوسرا، اباقاآن بار بار پوچھتا تھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ؟ لیکن شیخ ہر بار وہی شرطیہ جواب دیتے رہے، چلتے ہوئے شیخ نے یہ اشعار پڑھے،

بادشہ سایۂ خدا باشد   سایہ با ذات آشنا باشد

نہ شود نفس عامہ قابل خیر   گرنہ شمشیر بادشا باشد

ملکت او صلاح نپذیرد   گرہمہ رائے او خطا باشد

ہر صلاحے کہ در جہاں آید   اثرِ عدلِ بادشا باشد

اباقاآن پر ان اشعار کا نہایت اثر ہوا،

ایک دفعہ خواجہ شمس الدین نے چند سوالات لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے، اس کے ساتھ ایک عمامہ اور پانچسو اشرفیاں بھی بھیجیں، لیکن قاصد نے ڈیڑھ سو اشرفیاں خود اڑالیں، شیخ نے سوالات کے جواب کے ساتھ اشرفیوں کی رسید بھی لکھی اور عجیب

لطیف طریقہ سے نوکر کی خیانت ظاہر کی،

چونکہ تشریفم فرستادی ومال	مالت افزون باد وحصمت پایمال
ہر بہ دیناریت سالے عمر باد	تابمانی سیصد و پنجاہ سال

یعنی آپ کو خدا ہر اشرفی کے بدلے ایک برس عمر دے تاکہ آپ ۳۵۰ برس زندہ رہین، خواجہ شمس الدین نے نوکر سے بازپرس کی، خواجہ علاء الدین (برادر خواجہ شمس الدین) نے جلال الدین ختنی کو جو شیراز مین ایک معزز عہدہ پر مامور تھے، خط لکھا کہ دس ہزار اشرفیان شیخ کی خدمت مین پہنچا دینا، سو اتفاق یہ کہ جب نوکر شیراز مین پہنچا تو اس سے چھ دن پہلے جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا، نوکر نے جلال الدین کے نام کا خط شیخ کو لے جا کر دیا، شیخ نے علاء الدین کو جواب مین یہ قطعہ لکھا،

پیام صاحب دولت علاء دولت ودین	کہ دین ودہر بہ ایام او ہمے نازد
رسید پایۂ دولت فزود سعدی را	بسے نماند کہ سر بر فلک بر افرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین	قبول خدمت او را تعہدے سازد
ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود	چنانکہ بر سر ابنائے دہر می تازد
جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا	کہ بندگان خداوندگار بنوازد
طمع ندارم از و در سرائے عقبے نیز	کہ از مظالم مردم بما بپردازد

یعنی اس کا تو چندان رنج نہین کہ جلال الدین اب زندہ نہین ہو سکتا کہ میری حق رسی کر سکے، رونا یہ ہے کہ قیامت مین بھی اس کو اورون کی دادرسی سے اتنی فرصت کہان ہوگی کہ ہم غریبون کی طرف متوجہ ہو،

خواجہ شمس الدین نے قطعہ پڑھ کر حکم دیا کہ فوراً پچاس ہزار اشرفیان شیخ کی خدمت مین

بھیج دی جائین، شیخ قبول نہین کرتے تھے، لیکن چونکہ خواجہ موصوف نے قسمین دلائی تھین، شیخ نے اس رقم سے ایک کاروان سرا تعمیر کرادی[1]،

خواجہ شمس الدین کو ارغون خان (ہلاکو خان کا پوتا) نے ۶۸۳ھ مین قتل کرادیا، ان کے بعد بھی شیراز کے تمام حکام اور امرا، شیخ کی اسی طرح عزت اور تعظیم کرتے رہے، ملک عادل شمس الدین تازی کے زمانہ مین عمال نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سرکاری باغون کے پھل نہایت گران قیمت پر زبردستی دوکانداروں کے ہاتھ بیچتے تھے، اور بیچارون کو خواہ مخواہ مول لینا پڑتا تھا، شیخ کے بھائی بقالی کا پیشہ کرتے تھے، ان کی دوکان آتابک کے محل کے سامنے تھی، ان پر بھی چند بار یہ آفت آئی، آخر مجبور ہو کر بھائی کے پاس آئے، شیخ نے یہ قطعہ لکھ کر ملک عادل کے پاس بھیجا،

ز احوال برادرم بہ تحقیق	دانم کہ ترا خبر نہ باشد
خرمای بہ طرح می دہندش	بخت بد ازین بتر نہ باشد
اطفال برند و مرد درویش	خرما نخورند و زر نہ باشد
آنکہ تو محصلے فرستی	شخصے کہ ازو بتر نہ باشد
چندان بزنندش اے خداوند	کز خانہ رہش بدر نہ باشد
اے صاحب من بغور او رس	لطفے بہ ازین دگر نہ باشد

ملک شمس الدین نے قطعہ پڑھنے کے ساتھ منادی کرادی کہ جن لوگون سے ایسا معاملہ کیا گیا ہے، سب دربار مین حاضر ہون، چنانچہ سب کی دادرسی کی، پھر شیخ کی خدمت مین آیا اور نہایت معذرت کی، ساتھ ہی ہزار اشرفیون کی تھیلی پیش کی کہ آپ کے بھائی کے

[1] یہ تمام حالات احمد بن بیستون نے کلیات شیخ کے دیباچہ مین لکھے ہین،

نقصان کا تاوان ہے،

شیخ نے آخر زندگی میں شہر سے باہر ایک زاویہ بنوا لیا تھا، رات دن وہیں رہتے تھے اور عبادت کرتے تھے، سلاطین اور امرا، اسی آستانہ پر حاضر ہوتے اور مراتب اخلاص بجالاتے، کھانے کا یہ انتظام تھا کہ امرا خود کھانے لیجاتے یا بھجوا دیتے، شیخ جس قدر کھا سکتے کھا لیتے، باقی ایک زنبیل میں رکھ کر دیوار سے لٹکا دیتے کہ ع بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

شیخ جب شیراز میں واپس آئے تو ابوبکر بن سعد کی حکومت کا زمانہ تھا، اس کے بعد اسکا پوتا محمد بن سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ وہ نہایت صغیر سن تھا، حکومت کے سب کام اس کی ماں انجام دیتی تھی، دو برس، مہینے کے بعد وہ مرگیا، اس کے بعد محمد شاہ بن سلغر بن اتابک سعد بادشاہ ہوا لیکن چونکہ سفاک اور خونریز تھا اس لئے آٹھ مہینے کے بعد ارکانِ دولت نے اس کو گرفتار کر کے ہلاکو خاں کے پاس بھیجدیا، پھر اس کے بھائی نے برائے نام حکومت کی اور ۶۶۳ھ میں قتل کر دیا گیا، اب اس خاندان میں کوئی مرد باقی نہیں رہا تھا، آتش خاتون دختر اتابک سعد مسند حکومت پر بیٹھی، اس نے ہلاکو خاں کے بیٹے منکو تیمور سے شادی کر لی ۶۸۶ھ میں وہ بھی مرگئی، اور اب شیراز و فارس براہ راست تاتاریوں کی زیر حکومت آگیا،

یہ ارغون خاں ابا قاآن خاں بن ہلاکو خاں کا زمانہ ہے، شیخ نے اس کے عہد حکومت میں ۶۹۱ھ میں وفات پائی، تاریخ وفات "خاص" کے لفظ سے نکلتی ہے، کسی نے اسکو موزوں کر دیا ہے، ع ز خاصان بود زاں تاریخ شد خاص،

شیخ کا مزار مقام دلکشا سے کچھ فاصلہ پر پہاڑ کی تلی میں ہے، اور اب سعدیہ کے

سلہ دیباچہ کلیات،

نام سے مشہور ہے، ہفتہ میں ایک دن مقرر ہے، لوگ زیارت کو جاتے ہیں، دن بھر وہیں رہتے ہیں، چاے پیتے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں اور شام کو چلے آتے ہیں،

عام حالات اور اخلاق و عادات

شیخ نے گو اپنے سوانح نہیں لکھے، لیکن گلستاں اور بوستاں میں جستہ جستہ ضمنی موقعوں پر اس قدر حالات لکھدیئے ہیں، کہ اُن سے اخلاق اور عادات کی پوری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے،

شیخ کا شمار صوفیہ کبار میں ہے اور بے شبہہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے لیکن ان کی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے، اُن کی اصلی سرشت یہ نہ تھی، بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑپن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصہ ہیں، یعنی خود بینی، حرف گیری، مشاجرت و مخاصمت، باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق شوق پیدا ہو گیا ہے، شب بیداری اور وردو وظائف میں مصروف ہیں، لیکن ساتھ ہی اوروں پر حرف گیری بھی کرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے کسی کو نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی،

نظامیہ میں حدیث پڑھتے ہیں، کسی نے ان کے خلاف کچھ کہدیا ہے، اس پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں،

چو من داد معنی دہم در حدیث بر آید ہم اندرون خبیث

ایک درویش سے دولت مندی اور درویشی کے متعلق بحث کرتے کرتے دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور دھول دھپہ تک نوبت پہنچا دیتے ہیں،

دشنام داد سقطش گفتم گریبانم درید زنخدانش شکستم،

حج کا سفر ہے، ذوق و شوق میں احرام باندھے پا پیادہ جا رہے ہیں، اس حالت

ین بھی زبان سے ناسزا کلمات نکل رہے ہین، چنانچہ خود فرماتے ہین،

در سرو روی ہمدیگر فتادیم و داد فسق وجدال دادیم،

حسن پسندی، امرد پرستی تک پہونچ گئی ہے اور ایسے کھل کھیلے ہین کہ اس کا ذکر تک نہین کیا جا سکتا،

بے شبہہ یہ باتین ان کے عارضِ کمال کے داغ ہین لیکن ایک رفارمر اور مصلح کے لئے ان تمام مراحل سے گذرنا ضرور تھا،

مولینا روم سے کسی نے ایک بزرگ کی نسبت کہا کہ "شاہد باز بود اما پاکباز بود" مولینا نے کہا "کاوش کردی وگذاشتی"

شیخ نے چونکہ بیماریان اٹھا کر صحت پائی تھی، اس لئے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت، ماہیت، علامات اور طریقِ علاج سے جس قدر واقف ہو سکے دوسرا نہین ہو سکتا تھا، اخلاقی بیماریون مین اکثرون کو دھوکا ہوتا ہے، اور مرض کو مرض نہین سمجھتے، مثلاً ایک فقیہ فطری بدنفسی کی وجہ سے اپنے مخالف کو برا کہتا ہے اور اسکو ضرر پہنچاتا ہے، لیکن اس کا نفس اسکو یہ دھوکا دیتا ہے کہ چونکہ یہ شخص فلان مسئلہ کا قائل ہے، بدعتی اور کافر ہے، اس لئے اس کو برا کہنا اور اس کی تکفیر کرنا غیرت مذہب کا اقتضا ہے، یا مثلاً ایک صوفی صاحب امرد پرستی کرتے ہین اور سمجھتے ہین، کہ یہ مجاز حقیقت کا زینہ ہے، شیخ ان غلطیون مین نہین پڑ سکتا، چنانچہ امرد پرستی کی نسبت، نظرباز صوفیون کی اس طرح پردہ دری کرتا ہے،

گروہے نشینند باخوش پسر | کہ ماپاکبازیم واہلِ نظر
زمن پرس فرسودۂ روزگار | کہ برسفرہ حسرت خورد روزہ دار
چرا طفل یک روزہ ہوشت نبرد | کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

شیخ کے مزاج مین ظرافت حد سے زیادہ تھی، ایک دفعہ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے، ایک یہودی پڑوس مین رہتا تھا، اس نے کہا ضرور خرید یئے، مین اس مکان کی حالت سے خوب واقف ہون، اس مین کوئی عیب نہین، شیخ نے کہا بجز اس کے کہ آپ اس کے ہمسایہ ہین،

ہمام

خواجہ ہمام ایک مشہور شاعر تھے اور محقق طوسی کے شاگرد تھے، شیخ سے اور ان سے تبریز مین ایک حمام مین ملاقات ہوئی، شیخ نے دانستہ ہمام سے چھیڑ چھاڑ شروع کی، ہمام ان سے واقف نہ تھے، نام اور نشان پوچھا، شیخ نے کہا شیراز مین رہتا ہون، ہمام نے کہا عجیب بات ہے، ہمارے شہر مین شیرازی کتون سے زیادہ ہین، شیخ نے کہا ہان، لیکن شیراز مین تو تبریزی کتے سے بھی کم (رتبہ) ہین، اتفاق یہ کہ ایک خوشرو جوان ہمام کو پنکھا جھل رہا تھا، شیخ اس سے لطف نظر اٹھانا چاہتا تھا، لیکن ہمام بیچ مین حائل تھے، ہمام نے سلسلۂ سخن مین کہا کہ شیراز مین ہمام کے شعر کا بھی چرچا ہے؟ شیخ نے کہا ہان یہ شعر اکثر زبانون پر ہے،

درمیانِ من و دلدار حجاب ست ہمام   وقت آن است کہ این دہ بیک سو فگنم

ہمام کو گمان ہوا کہ یہ سعدی ہین، قسم دلا کر پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے، شیخ نے مجبوراً بتایا، ہمام نے اٹھ کر شیخ کے پاؤن پر سر رکھ دیا، گھر لے گئے، اور بڑی گرمجوشی سے مہمانیان کین[1]،

ہمگر

مجد الدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اسی دربار کے تعلق رکھتے تھے، جس سے شیخ کو تعلق تھا، آج تو کوئی ان کا نام بھی نہین جانتا، لیکن اس زمانہ مین فارس کے ملک الشعرائی کا منصب جو شیخ کا حق تھا، قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا،

---

[1] دولت شاہ ذکر سعدی،

سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم اور تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا، اسی زمانہ میں امامی ایک شاعر تھا، زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنادیا تھا، نوبت یہانتک پہونچی کہ خواجہ شمس الدین محمد اور ملک معین الدین پروانہ اور نور الدین اور افتخار الدین نے یہ قطعہ لکھ کر مجد الدین ہمکر کے پاس بھیجا،

زشمع فارس، مجد ملت و دیں — سوالے می کند پروانۂ روم
زشاگردانِ تو ہستند حاضر — رہی و افتخار و نور مظلوم
تو از اشعار سعدی و امامی — کدامی بہ پسندی اندریں بوم

مجد الدین نے جواب میں لکھا،

ما گرچہ بہ نطق طوطی خوش نفسیم — بر شکر گفتہ ہائے سعدی مگسیم
در شیوۂ شاعری باجماع امم — ہرگز من و سعدی بامامی نرسیم

شیخ کو بھی اس بے امتیازی کا رنج ہوا، چنانچہ یہ رباعی لکھی،

ہر کس کہ بہ بارگاہ سامی نرسد — از بخت سیاہ و بد کلامی نرسد
ہمکر کہ بہ عمر خود نکر دہ است نماز — شک نیست کہ ہرگز بامامی نرسد[1]

شیخ کے سیر و سفر کے ذکر میں جو واقعات ہم اوپر لکھ آئے ہیں، ان کو اس موقع پر دوبارہ پڑھنا چاہیئے، جن سے شیخ کے اخلاق و عادات کی تصویر پوری نظر میں آجائیگی،

شیخ کی تصانیف کلیات[2] شیخ کے قدیم ترین قلمی نسخہ کتب خانہ دیوان ہند (INDIA OFFICE) میں موجود ہے، جس کا نمبر ۱۱۱۷ ہے، تاریخ انتساخ اول رجب ۷۲۸ھ یعنی شیخ کی وفات

---

[1] تذکرہ دولت شاہ تذکرہ امامی مروی [2] یہ تمام مضمون شیخ عبد القادر صاحب ایم اے، پروفیسر دکن کالج پونا نے ترجمہ کرکے ہم کو عنایت کیا ہے،

کے بعد قریب ۶۳ سال ہے، کاتب کا نام ابوبکر بن علی بن محمد ہے، جس نے شیخ کے اصلی نسخہ سے نقل لی ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے "منقول من خط الشیخ العارف السعدی۔"

اس نسخہ سے شیخ کا نام شرف الدین بن مصلح الدین پایا جاتا ہے اور اس میں حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) عربی قصیدہ قافیہ میم (۲) دوسرا رسالہ (۳) بوستاں جس کا نام یہاں سعدی نامہ لکھا ہوا ہے (۴) گلستاں (۵) طیبات (۶) بدائع (۷) خواتیم (۸) قصائد فارسیہ (۹) مراثی (۱۰) ملمعات (۱۱) مثلثات (تین زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی) (۱۲) قصائد عربیہ (۱۳) ترجیعات (۱۴) مقطعات (۱۵) مجلس ہزل، ہزلیات، (۱۶) مطائبات (۱۷) رباعیات (۱۸) مفردات،

جو کتابیں کہ اس نسخہ میں داخل نہیں وہ یہ ہیں، رسائل ۱، ۳، ۴، ۵، ۶، غزلیات قدیم صاحبیہ مضحکات،

اہل یورپ نے شیخ کے کلام کے جو حصے شائع اور ترجمے کیے اس کا مختصر حال یہ ہے (ماخوذ از فہرست کتب قلمی فارسی موجودہ دیوان ہند، مرتبہ ڈاکٹر ایتھ (Dr. Ethe)

رسالہ دوم (پانچ مجلسوں میں سے تیسری اور چوتھی مجلسیں ایم اگوڈمان (M. Goodeman) صاحب نے معہ ترجمہ اور شرح کے شائع کیں بمقام بریسلا (Bresla) ۱۸۹۸ء

بوستان، نہایت نفیس اڈیشن معہ شرح فارسی کے ایچ گراف صاحب (K. H Graff) کے اہتمام سے چھپا ہے، بمقام ویانا (Vienna) ۱۸۵۰ء،

متن مع نوٹس، مرتبہ اے، راجرس (A. Rodgers)، بمقام لندن ۱۸۹۱ء،

تراجم، در زبان جرمن، کے ایچ گراف (K. H Graff) صاحب کا ترجمہ، جینا (Jena) ۱۸۵۰ء

" در زبان جرمن شیلخنا ویسٹرڈ (Schlecha wesschrd) ویانا (Vienna) ۱۸۵۲ء،

تراجم در زبان جرمن وکٹ (Ruckert) صاحب کا ترجمہ لیپزیگ (Liepzig) سنہ ۱۸۸۲ء

تراجم در زبان فرنچ، باربیر دی ینارڈ (Barbierdeoneynard) گلیارس سنہ ۱۸۸۰ء

تراجم انگریزی ایچ، ولبرفورس کلارک (H. Willeforce CLARK) صاحب کا ترجمہ بمقام لندن سنہ ۱۸۷۹ء

تراجم انگریزی جی، ایس، ڈیوی (G. S. Davie) صاحب کا ترجمہ بمقام لندن سنہ ۱۸۸۲ء

منتخبات مترجمہ رابنس (Robinson) لنڈن سنہ ۱۸۸۳ء

ایک ترکی میں بمقام قسطنطنیہ سنہ ۱۲۹۸ھ میں شائع ہوا ہے:

گلستان، اڈیشنس، گلیاڈون (Gladwin) صاحب کی متن مع انگریزی کلکتہ سنہ ۱۸۰۶ء

" ای، بی، ایسٹورک (E. B. Eastwick) صاحب کی مع فرہنگ بمقام ہرٹ فرڈ (Hertford) سنہ ۱۸۵۰ء،

" جانسن (Johnson) کی مع فرہنگ، ہرٹ فرڈ سنہ ۱۸۶۳ء،

" جے، ٹی، پلاٹس (J. T. Platts) لنڈن سنہ ۱۸۷۴ء،

تراجم اور فرنچ، اے، ڈیوراٹر (A. Du Ryer) کا ترجمہ سنہ ۱۶۳۱ء،

ڈالیگر (Dalegre) کا ترجمہ سنہ ۱۷۱۴ء

گاندان (Gaundin) کا ترجمہ سنہ ۱۷۸۹ء

سیمیلٹ (Semelet) کا ترجمہ سنہ ۱۸۵۸ء پارس

لاطینی جنٹیس (Gentius) کا ترجمہ سنہ ۱۶۵۱ء اڈیشن دوم سنہ ۱۶۵۵ء،

تراجم اور جرمن، ادم ادیاری اس (Adam Olearius) کا بمقام شلیسوگ (Schlesswig) سنہ ۱۶۵۴ء

تراجم در جرمن بی ڈارن (B. Dorn) صاحب کا، ہامبرگ ۱۸۲۲ء

" " وولف (Wolff) کا، سٹٹگارٹ (Stiuthgart) ۱۸۴۱ء

" " کے ایچ گراف (K. H. Graff) کا لیپزگ ۱۸۴۶ء

تراجم در انگریزی، گلیاڈون صاحب (Gladwin) کا، کلکتہ ۱۸۰۶ء

لندن ۱۸۳۴ء

ڈیومولن (Dumoulin) کا ۱۸۰۶ء

جیمس راس (James Ross) کا لندن ۱۸۲۳ء

نیا ایڈیشن ۱۸۹۰ء،

ای، بی، ایسٹوک (E. B. Eastwick) ہرٹ فرڈ ۱۸۵۲ء

نیا ایڈیشن، لندن ۱۸۸۰ء

جی، ٹی، پلاٹس (J. T. Platts) کا لندن ۱۸۷۳ء

تراجم در روسی، اس، نسرلینیز (S. Nuowianz) کا ماسکو ۱۸۵۷ء

تراجم در پولش، آٹونوسکی (Otwinowski) کا، وارسا ۱۸۷۹ء

تراجم در ترکی، قسطنطنیہ میں ۱۸۶۲ء ۱۸۷۶ء میں شائع ہوا اور مع شرح سودی کے

تراجم ۱۲۸۶ء اور ۱۲۹۳ء میں،

عربی میں بمقام بولاق ۱۲۶۳ء ہندوستانی میں میر شیر علی افسوس کا کلکتہ ۱۸۵۲ء

جو زیر نگرانی جان گلگرسٹ صاحب (Jhon Gilchrist) کے شائع کیا گیا

طیبات کی چودہ غزلیں گراف (K. H. Graff) صاحب نے ترجمہ کرکے جرمن میں شائع کیں

بدائع دس " " " " " "

خواتیم کی سات غزلیں گراف (H. Graff) صاحب نے ترجمہ کرکے جرمن میں شائع کیں،
قصائد فارسیہ انیس قصائد " " " " " " " "
مراثی، چند مراثی " " " " " " " " "
رباعیات چند رباعیات " " " " " " " "
مفردات کو لاٹوش (Latouche) صاحب نے ایڈٹ اور شائع کیا ہے،
صاحبیہ، کو باخر (Bacher) صاحب نے مع ترجمہ شائع کیا ہے، اسٹراسبرگ (Strassburg) ۱۸۷۹ء

شیخ کی شاعری | شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں، ان میں ایک شیخ بھی ہیں،

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را	فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر، جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے، شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے خواجہ حافظ نے غزل کو معجزہ بنا دیا تاہم کہتے ہیں، ع

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما

حضرت امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں، مثنوی نہ سپہر میں لکھتے ہیں،

تا بجائے کہ حد پارسیاں	اندریں عہد و دو تن گشت عیاں
زاں یکے سعدی ثانیش ہمام	ہر دو را در غزل آئیں تمام

لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی، امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کرکے لکھتے ہیں،

لیک اگر سوے دگر یازی دست | شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

خود شیخ کے زمانہ میں بھی اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا، اور اس کا چرچا شیخ تک بھی پہنچا، چنانچہ ایک شخص نے کہا کہ شیخ اخلاق اور وعظ کے مضامین اچھے لکھ سکتے ہیں لیکن رزم کے مرد میدان نہیں،

کہ فکرش بلیغ است و رایش بلند | دریں شیوۂ زہد و طامات و پند

نہ در خشت و گوپال و گرز گراں | کہ ایں کار ختم ست بر دیگراں

شیخ کو یہ راے ناگوار گذری، ایک رزمیہ داستان لکھ کر بوستان میں شامل کی جس میں بہت کچھ زور طبع دکھایا، نظامی کے خاص خاص مشہور مضامین اور اشعار کا جواب بھی لکھا اور اُن سے بڑھا دینا چاہا، مثلاً نظامی کا شعر تھا،

کمند اژدہاے مسلسل شکنج | دہن باز کردہ بہ تاراج گنج

شیخ اس تشبیہ کو زیادہ صاف اور صورت نما کرتے ہیں،

بہ صید ہژبران پرخاش ساز | کمند اژدہاے دہن کردہ باز

لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ سے یہ کمان زہ نہیں ہو سکی، دو چار قدم تن کر اور اکڑ کر چلتے ہیں، لیکن پھر طبعی بڑھاپے کے ضعف سے دفعۃً جھک جاتے ہیں، رزم کا آغاز کس زور و شور سے کیا ہے،

ع برانگیختم گرد ہیجا چو دود

لیکن دوسرے ہی قدم میں لڑکھڑا کر گرتے ہیں،

ع چو دولت نہ باشد تہور چہ سود،

بایںہمہ چونکہ شیخ کا یہ بھی ایک کارنامہ ہے، ہم اس رزمیہ کے چند اشعار

نقل کرتے ہیں،

ہماندم کہ دیدیم گرد سپاہ — زرہ جامہ کردیم و مغفر کلاہ
چو ابر اسپ تازی برانگیختم — چو باراں پلارک فرو ریختم
دو لشکر بہم بر زدند از کمیں — تو گفتی زدند آسماں بر زمیں
ز باریدنِ تیر ہمچوں تگرگ — ز ہر گوشہ برخاست طوفانِ مرگ
بہ صید ہژبرانِ پرخاش ساز — کمند اژدہاے دہن کردہ باز
زمیں آسماں شد ز گرد کبود — چو انجم در و برق شمشیر و خود

غرض نہ ان کا یہ دعویٰ مسلّم ہے کہ وہ رزم میں فردوسی اور نظامی کے دوش بدوش چل سکتے ہیں، نہ امیر خسرو وغیرہ کی یہ رائے صحیح ہے کہ وہ غزل کے سوا اور کچھ نہیں لکھ سکتے قصائد اور مثنوی میں انکی بلند پائگی سے کون انکار کرسکتا ہے،

ایران میں شاعری کو تین سو برس گذر چکے تھے لیکن شاعری اب تک اصلی جادہ پر نہیں آئی تھی، شاعری کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ شاعر کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہو اور وہ اس جذبہ کو اُسی جوش و خروش سے ادا کردے، جس جوش سے وہ پیدا ہوا تھا، فردوسی نظامی، فرخی، انوری کے کمال شاعری میں کس کو کلام ہے، لیکن ان میں سے اپنے دل کے جذبات کس نے لکھے ؟ فردوسی قدرتی شاعر ہے، اس لئے وہ غیروں کے جذبات بھی اُسی طرح ادا کرتا ہے کہ گویا خود اس کے دل سے اٹھے ہیں، عرب کی تحقیر اور طعن کے وقت وہ خود یزدگرد بن جاتا ہے، سہراب کی ماں کا نوحہ اس درد سے لکھا ہے کہ گویا اس کو سہراب کی ماں کی زبان ہاتھ آگئی ہے، لیکن فرض کرو یہ واقعات خود فردوسی پر پیش آتے تو کیا ان شعلوں کی شرر فشانی اور نہ بڑھ جاتی؟ جذبہ

قصائد تو بالکل ہی تصنع اور آورد تھی، غزل بھی اس وقت تک گویا قصیدہ ہی کی ایک دوسری صورت تھی عشق و محبت کے جذبات اس میں ادا نہیں کئے جاتے تھے، بلکہ جس طرح مدحیہ قصائد میں ممدوح کی شجاعت و قدرت، جود و سخا، تلوار اور گھوڑے کی مدح کرتے تھے، غزل میں معشوق کے حسن اور اعضا کے اوصاف بیان کرتے تھے، شیخ پہلا شخص ہے جس نے شاعری کا صحیح استعمال کیا، تفصیل اسکی حسب ذیل ہے،

آزادی

(۱) سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے، آزادی ہے، عرب کی شاعری کی اصلی روح یہی تھی، جو عجم میں آکر گم ہو گئی تھی، عرب کے شعرا سلاطین اور امرا کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے، متنبی سیف الدولہ کی مدح لکھ کرے جاتا ہے، اور ساتھ ہی نہایت گستاخی اور بیباکی سے اس کو صلواتیں سناتا جاتا ہے، فردوسی نے بھی محمود کی جاں خروش ہجو لکھی، لیکن رو در رو نہیں بلکہ چوری سے، پھر تمام عمر بھاگتا پھرا، شیخ کو کئی درباروں سے تعلق رہا، ابو بکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا تھا، انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو خاں کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا، اس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا، ان سب کے مقابلہ میں اُس نے اپنی آزادی قائم رکھی، ابو بکر بن سعد نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی، یہانتک کہ جب ہلاکو خاں نے بغداد پر چڑھائی کی تو ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد کو فوج دیکر اعانت کے لئے بھیجا، اور جب بغداد تاراج ہوا، تو ابو بکر نے مبارک باد کے لئے سفارت بھیجی، باایںہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے، یہ مرثیہ درحقیقت ابو بکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور

بربادی میں ہلاکو خاں کا ساتھ دیا، شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی،

خسرو صاحبقراں غوث زماں بوبکر سعد   آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و اوصافش گزیں

مصلحت بود اختیار رای روشن بین او   زیردستاں را سخن گفتن نشاید جز چنیں

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو کی مدد کی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی،

انکیانو کی مدح میں شیخ کے متعدد قصیدے ہیں، لیکن ہر قصیدہ میں نہایت دلیری سے اُس کو نصیحت کی ہے اور صاف کہدیا ہے کہ جس کو دربار کی طمع نہیں وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرسکتا،

سعدیا چندانکہ میدانی بگو   حق نباید گفتن الا آشکار

ہر کرا خوف و طمع دربار نیست   از خطا باکش نباشد و ز تتار

خسرو عادل امیر نامور   انکیانو خسرو عالی تبار

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

حرامش باد ملک پادشاہی   کہ پیشش مدح گویند از قفا ذم

جہاں سالار عادل انکیانو   سپہدار عراق و ترک و دیلم

چنیں پند از پدر نشنیدہ باشی   الا گر ہوشیاری بشنو از عم

نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ   سخن ملکے است سعدی را مسلّم

بوستاں میں لکھتے ہیں،

دلیری آمدی سعدیا در سخن   چو تیغت بدست است فتحے بکن

بگو آنچہ دانی کہ حق گفتہ بہ   نہ رشوت ستانی و نہ رشوہ دہ

طمع بندو دفتر زحکمت بشوے　　طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگوے

اس زمانہ میں شاعری کا بڑا حصہ مدح تھی اور شعرا اسی کے ذریعہ سے بسر کرتے تھے، شاعری کی بڑی اصلاح یہ تھی کہ شاعری کے چہرہ سے یہ داغ مٹا دیا جائے، شیخ نے یہ فرض نہایت نفس کشی کے ساتھ ادا کیا، وہ تنگ حال اور مفلس تھا، لوگ اس کو ترغیب دیتے تھے کہ مدحیہ قصائد لکھو تو اچھی طرح بسر ہوگی، وہ جواب دیتا تھا کہ آزاد گردن کسی کے آگے جھک نہیں سکتی،

گویند سعدیا بچہ بطال ماندۂ　　سختی مبر کہ وجہ کفافت معین است

یکچند اگر مدیح کنی کامران شوی　　صاحب ہنر کہ مال ندارد تغابن است

بی زر میسرت نشود کام دوستاں　　چوں کام دوستاں نہی کام دشمن است

آرے مثل بہ کرگس مردار خور دہند　　سیمرغ را کہ قاف قناعت نشیمن است

از من نیاید ایں کہ بہ دہقان و کدخدا　　حاجت برم کہ فعل گدایان خرمن است

عرب میں مدح کے یہ معنی تھے کہ شاعر جس شخص کا ممنون ہوتا تھا یا جو شخص قوم میں قابلِ مدح کام کرتا تھا، شاعر اس کا اظہار کرتا تھا، لیکن صلہ اور انعام سے اس کو کچھ واسطہ نہ ہوتا تھا،

زہیر بن ابی سلمٰی جب ہرم بن سنان کے دربار میں گیا، اور ہرم کو سلام کیا تو ہرم نے حکم دیا کہ زہیر جب دربار میں آئے اور سلام کرے تو اس کو صلہ دیا جائے، اس کے بعد زہیر کا معمول ہو گیا کہ جب دربار میں جاتا تو کہتا کہ تمام مجمع کو سلام کرتا ہوں، لیکن ہرم کو نہیں، عرب میں سب سے پہلے جس شاعر نے قصیدہ پر صلہ لیا وہ نابغہ ذبیانی تھا، عرب نے اس کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھا،

یشخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا اس نے سلاطین وامراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے، اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہو گئے تھے اُن کو لغو بتاتا ہی، مثلاً قصیدہ کے خاتمہ میں ممدوح کو یوں دعا دیتے تھے، کہ لاکھوں کروروں برس زندہ رہے یہاں تک کہ مرزا غالب نے قصہ ہی فیصل کر دیا، ع تا خدا باشد بہادر شاہ باد

یشخ ہزار برس کی دعا دینے پر بھی راضی نہیں،

ہزار سال نگویم بقاے عمر تو باد | کہ این مبالغہ دانم زعقل نشماری
ہمیں سعادت توفیق بر مزیدت باد | کہ حق گزاری وناحق کسے نیازاری
نہ کاہد آنچہ نوشتہ است عمر ونفزاید | پس اینچہ فائدہ گفتن کہ تابہ حشر بپای

ممدوح کو عموماً ابر گہر فشاں اور دریاے بیکراں کہا کرتے ہیں، یشخ کہتا ہے،

نہ گویمت چو زبان آورانِ رنگ آمیز | کہ ابر مشک فشانی وبحر گوہر زاے

ایک اور قصیدہ میں لکھتے ہیں،

من این غلط نہ پسندم زرای روشنِ خویش | کہ دست وطبع تو گویم بہ بحر وکاں ماند

یہ انوری کے اس شعر پر تعریض ہے،

گر دل بحر و دست کاں باشد | دل و دست خدا ئگاں باشد

مجد الدین رومی کی مدح میں کہتے ہیں،

نگویمت بہ تکلف فلاں دولت ودیں | سپہر مجد ومعالی جہاں دانش و داد

خواجہ شمس الدین محمد اور علاء الدین کا تمام دنیاے اسلام پر احسان تھا تاتاریوں کے آشوب ناک زمانہ میں اسلام کی جو کچھ حالت قائم رہ گئی، وہ انھی بھائیوں کی

بدولت تھی اس لئے شیخ ان دونوں بھائیوں کی مدح نہایت اخلاص سے کرتا ہے لیکن بالکل اسی طرح جس طرح آج کسی گورنر یا حاکم صوبہ کو سپاسنامہ پیش کیا جاتا ہے مثلاً خواجہ علاء الدین کی مدح میں کہتا ہے،

خدای خواست کہ اسلام در حمایت او ۔۔۔ زشیر حادثہ در بارۂ اماں ماند

وگرنہ فتنہ چناں کردہ بود دنداں تیز ۔۔۔ کزیں دیار نہ مرغ ونہ آشیاں ماند

تو آں جواد زمانی کز ازدحام زماں ۔۔۔ ورت بہ مشرب شیریں کارواں ماند

جذبات

(۲) شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے، وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا، وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں، اس لئے وہ اسی وقت شعر کہتا ہے، جب اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے، غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی، شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کئے جن لوگوں کا اس نے مرثیہ لکھا وہ لوگ تھے جن کے مرنے سے اسکو سخت صدمہ پہنچا تھا، اخلاقی مضامین بھی وہ اسی وقت ادا کرتا ہے، جب کسی موثر واقعہ کے پیش آجانے سے خود اس کے دل پر سخت اثر پڑتا ہے مثلاً

مناجاتِ شوریدۂ در حرم ۔۔۔ تنم ہے بلرزد چو یاد آورم

کہ می گفت وفرماندہش می فروخت ۔۔۔ یکم روز بر بندۂ دل بسوخت

کہ پاک است وخرم بہشت بریں ۔۔۔ مرا رفتہ در دل آمد بریں

گِل آلودۂ معصیت راچہ کار ۔۔۔ دراں جائے پاکان اُمید وار

امراء میں سے اس کو سب سے زیادہ محمد بن ابی بکر بن سعد زنگی سے محبت تھی، وہ نہایت ہنرور اور شوکت وشان کا شہزادہ تھا، وہ سفر میں تھا کہ باپ کے مرض الموت

کی خبر سنی اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں شیراز کو روانہ ہوا، لیکن راہ میں قضا کر گیا،
چونکہ وہ ولیعہد تھا سب لوگ منتظر تھے کہ وہ آکر تخت و تاج کا مالک ہوگا، اس بنا
پر اس کے مرنے کا عام ماتم ہوا، شیخ کو بھی سخت صدمہ ہوا، اسی حالت میں مرثیہ لکھا،
جس کے ہر شعر سے خونِ جگر کی بو آتی ہے،

بزرگان چشم و دل در انتظارند — عزیزاں وقت و ساعت می شمارند
غلامان در و گوہر می فشانند — کنیزاں دست و ساعد مے نگارند
ملک خان و سیاق و بدر و ترغاں — بہ رہوارانِ تازی بر سوارند
کہ شاہنشاہ عادل سعد بوبکر — بہ ایوانِ شہنشاہی در آرند
حرم شادی کناں بر طاق و ایواں — کہ مروارید بر تاجش ببارند
امید تاج و تخت خسروی بود — ازیں غافل کہ تابوتش در آرند
چہ شد پاکیزہ رویان حرم را — کہ بر سر کاہ و بر زیور غبارند
نمی دانم حدیثِ نامہ چون است — ہمی دانم کہ عنوانش بہ خون است

مرثیہ کی اصلاح

(۳) اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے، قومی
یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا، شیخ پہلا شخص ہے، جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا،
عباسیوں سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی، پھر بھی پانسو برس کی اسلامی یادگار تھی،
اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا، اس لئے اس کا مٹنا قوم کا مٹنا تھا، شیخ نے اس
بنا پر خلیفہ اور بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے لکھا اس کا اندازہ ان
اشعار سے خود کر سکتے ہو،

آسمان را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں — بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنیں

اے محمدؐ! گر قیامت سر بروں آری ز خاک	سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں
نازنینانِ حرم را موجِ خونِ بے دریغ	ز آستاں بگذشت و ما را خونِ دل از آستیں
دیدہ بردار اے کہ دیدی شوکتِ بیت الحرام	قیصرانِ روم سر بر خاک و خاقاں بر زمیں
خونِ فرزندانِ عمِ مصطفیٰ شد ریختہ	ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندی جبیں
باش تا فردا کہ بینی روز داد و رستخیز	کز لحد با زخم خوں آلودہ برخیزد دفیں

ان اجمالی اور سرسری خصوصیات کے بعد ہم ان انواعِ شاعری سے مفصل بحث کرتے ہیں، جن کو شیخ نے ترقی دی یا اس کا رنگ بدل دیا،

اخلاقی شاعری (۴) اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی، خیام، اوحدی، عطار نے اس زمین کو آسمان تک پہونچا دیا تھا، تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کر دیا، اخلاقی شاعری پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے،

(۱) کس قسم کے اخلاق کی تعلیم کی، اور ان میں کس حد تک فلسفیت اور نکتہ سنجی پائی جاتی ہے،

(۲) فلسفۂ اخلاق کو کس طرح شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اخلاقی مسائل اگر محض سادہ طریقہ پر نظم میں ادا کر دیئے جائیں تو وہ فلسفہ ہوگا شاعری نہ ہوگی،

شیخ نے اخلاقی عنوان جو اختیار کئے وہ حسبِ ذیل ہیں،

عدل و تدبیر، احسان عام، عشق و محبت، تواضع، رضا بالقضا، قناعت، تربیت، شکر، توبہ، مناجات،

عدل و تدبیر اصل میں پالیٹکس اور سیاست سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن چونکہ ان کو اخلاق سے نہایت قوی تعلق ہے، شیخ نے اس کو بھی اخلاق میں شامل کر لیا، ایشیائی ملکوں میں

سلطنت کی بنیاد بادشاہ پرستی پر قائم ہوتی ہے، اور وہ حاکم علی الاطلاق سمجھا جاتا ہے اگر وہ عدل و انصاف کرے تو اس کی عنایت ہے، اور نہ کرے تو اس کو کوئی ٹوک نہیں سکتا،

اگر شہ روز را گوید شب است ایں   بباید گفت اینک ماہ و پرویں

لیکن شیخ نے مختلف حکایتوں کے پیرایہ میں بتایا کہ ہر شخص کو نہایت آزادی کیساتھ بادشاہ پر نکتہ چینی کا حق ہے، شیخ نے آزادانہ اعتراض کو جس پیرایہ میں ادا کیا، آزادی، بیباکی اور جانبازی کی اس سے بڑھکر تعلیم نہیں ہوسکتی،

ایک ظالم بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ لوگوں کے جانور زبردستی پکڑ کر ان سے کام لیتا تھا، اتفاق سے ایک دن شکار کے پیچھے فوج کا ساتھ چھوٹ گیا، اور ایک گاؤں میں رات بسر کرنی پڑی، ایک شخص کو دیکھا کہ اپنے گدھے کو اس طرح مار رہا ہے کہ اس کے ہات، پاؤں بیکار ہوئے جاتے ہیں، بادشاہ نے روکا، اس نے کہا میں اس لئے اسکو بیکار کئے دیتا ہوں کہ ہمارے ملک کا بادشاہ بیگار میں نہ پکڑے، یہ کہکر بادشاہ کو خوب بُرا بھلا کہا، صبح کو اہل فوج ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گاؤں میں پہنچے، اور بادشاہ تخت گاہ میں واپس آیا، یہاں پہونچ کر اس نے اس شخص کو پکڑ بلایا اور رات کی گستاخی کی سزا دینی چاہی، اس نے کہا

نہ تنہا منت گفتم اے شہریار   کہ برگشتہ بختی و بدروزگار

چرا خشم بر من گرفتی و بس   منت پیش گفتم ہمہ خلق پس

یعنی مجھ ہی پر کیوں غصہ ہے، تجکو تو سب برا کہتے ہیں، فرق یہ ہے کہ لوگ پیچھے بُرا کہتے ہیں، میں نے سامنے کہا،

چو بیداد کردی توقع مدار | کہ نامت بہ نیکی رود در دیار
ترا چارہ از ظلم برگشتن است | نہ بیچارۂ بے گنہ کشتن است

یعنی تجھ کو یہ مناسب ہے کہ ظلم سے باز آئے یہ نہیں کہ ایک بے گناہ کو قتل کر دے،

زنا مہربانی کہ در دور تست | ہمہ عالم آوازۂ جور تست
عجب گر زمنت بر دل آمد درشت | بکش گر توانی ہمہ خلق کشت
بداں کے ستودہ شود بادشاہ | کہ خلقش ستایند در بارگاہ
چہ سود آفریں بر سر انجمن | پسِ پردہ نفریں کناں مرد و زن
ہمی گفت و شمشیر بالائے سر | سپر کردہ جاں پیش تیر قدر

ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش کی حق گوئی سے بادشاہ ناراض ہوا اور اسکو قید کر دیا اس کے دوستوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کے سامنے یہ آزادی خلافِ مصلحت تھی، درویش نے جواب دیا،

رسانیدنِ امر حق طاعت است | نہ زنداں نہ ترسم کہ یک ساعت است

کسی نے یہ خبر بادشاہ کو پہنچائی، بولا کہ یہ اس کی حماقت ہے، ایک ساعت نہیں، تمام عمر اس کو قید خانہ میں رہنا ہوگا، درویش نے کہا،

کہ دنیا ہمی ساعتے بیش نیست | غم و خورمی پیشِ درویش نیست

بادشاہ نے حکم دیا کہ اسکی زبان گدی سے کھینچ لی جائے، درویش نے کہا مجھ کو اسکی بھی پروا نہیں، مجھ کو جس سے کہنا سننا ہے، وہ بولے بغیر میری بات سمجھ سکتا ہے،

من از بیزبانی ندارم غمے | کہ دانم کہ ناگفتہ داند ہمے

اس قسم کی متعدد حکایتیں نہایت پر اثر طریقہ سے لکھی ہیں جن سے اس نے اپنے تمام

ابنائے زمانہ کے خلاف لوگوں کو آزادی اور بیباکانہ حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور جب یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیخ کا یہ قول نہ تھا، بلکہ عمل بھی تھا اُس کی تعلیم کا دل پر نہایت قوی اثر ہوتا ہے، شیخ نے یہ بھی بتایا کہ ملک کی آمدنی میں بادشاہ کا صرف اس قدر حق ہے کہ بقدر ضرورت اس سے تمتع اٹھائے، اس سے زیادہ اس کو کوئی حق نہیں، ایک سادہ وضع بادشاہ کی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ حضور دیبائے چینی کی قبا زیب تن فرماتے تو زیادہ موزوں تھا، بادشاہ نے کہا،

نہ از بہرآں می ستانم خراج — کہ زینت کنم بر خود و تخت و تاج

مرا ہم ز صد گونہ آزد ہوا است — و لیکن نہ تنہا خزینہ مرا است

خزائن پُر از بہر لشکر بود — نہ از بہر آئین و زیور بود،

چو دشمن خر روستائی برد — ملک باج و دہ یک چرا ئی خورد

یہ خود شیخ کے خیالات ہیں لیکن بلاغت کے اصول کے لحاظ سے بادشاہ کی زبان سے ادا کیا ہے کہ بادشاہوں پر اس کا اثر زیادہ ہوگا،

احسان عام | احسان کا مضمون ایشیا کا مرغوب عام مضمون ہے، اور شیخ نے اس مضمون کو اسی عام طریقہ پر لکھا ہے جو ایشیائی طبائع کا عام انداز ہے، حاتم طائی کی فیاضیوں کی جھوٹی حکایتیں بڑی آب و تاب سے لکھی ہیں اور یہ نہ سمجھے،

بیا بہ ملک قناعت کہ در وسر نہ کشی — ز قصہ ہا کہ بہ ہمت فروش طے بستند

یہ بھی ہدایت کی ہے کہ مستحق اور غیر مستحق کی تمیز کی کوئی ضرورت نہیں،

گرہ بر سر بند احسان مزن — کہ ایں کرو شید است و آں زرق و فن

اخیر میں بڑا دل کر کے یہ تفریق کی ہے کہ ظالموں کے ساتھ احسان نہ کرنا چاہیئے،

تاہم اس باب میں بھی شیخ نے بعض نکتے اپنے زمانہ کی عام سطح سے بالاتر لکھے ہیں، مثلاً دینداروں کے نزدیک محاسنِ اخلاق جس قدر ہیں، مثلاً عفو حلم، مروت، جود و کرم سب مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں، غیر مذہب والوں کے ساتھ عموماً "اشداء علی الکفار" کا برتاؤ کرنا چاہیئے، لیکن شیخ کے احسانِ عام کا بادل، ویرانہ و چمن دونوں پر یکساں برستا ہے۔

اس نے ایک حکایت لکھی ہے، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر کو مومن سمجھ کر مہمان کیا، جب اس کا گبر ہونا ظاہر ہوا تو دسترخوان پر سے اٹھا دیا، اس پر وحی آئی کہ

منش دادہ صد سال روزی و جاں — ترا نفرت آمد از و یک زماں

عشق — یعنی میں نے تو اس کو سو برس تک کھلایا پلایا، تم دم بھر بھی اس کے ساتھ بسر نہ کرسکے، عشق شیخ کے زمانہ میں مسلمانوں کی قوتوں میں یک لخت زوال آچکا تھا، اسلئے عشق و محبت کے سوا اور کیا کام باقی رہا تھا، شیخ نے عام مذاق کے لحاظ سے اس راگ کا چھیڑنا بھی ضروری سمجھا اور اپنی دانست میں اس میں بھی اصلاح کی، یعنی عشق مجازی کو برا کہا، اور عشق حقیقی کے محاسن بیان کئے، لیکن سچ یہ ہے کہ اگر ایک اخلاقی کتاب سرے سے اس فتنہ انگیز مضمون سے پاک رہتی تو بہت اچھا ہوتا، ع

اہل زکام را مدہ ایں گل کہ بو کند

قناعت — قناعت، تواضع، اور رضا وغیرہ کو جادو اثر طریقہ سے بیان کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین کے بار بار اعادہ کرنے سے قوم میں افسردگی، بیکاری، پست ہمتی پیدا ہوتی ہے، اس لئے یہ مضامین ہمارے اخلاقی دفتر سے چند روز کے لئے نکال دینے کے قابل ہیں،

قناعت بظاہر پست ہمتی کا دوسرا نام ہے، اور اس میں شک نہیں کہ قناعت کے جو غلط معنی عموماً علما، اور زہاد نے دلوں میں بٹھادیے ہیں، اس نے قوم کے اپاہج بنانے میں بہت مدد دی ہے، لیکن انصاف یہ ہے کہ شیخ نے قناعت کے جو معنی قرار دئے وہ انسان کی خودداری اور عزتِ نفس کا سب سے ضروری مرحلہ ہے، ایشیائی حکومتوں میں ہر قسم کے بیہودہ اخلاق مثلاً خوشامد، ذلتِ نفس، نفاق، ریا، زمانہ سازی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ ان باتوں کے بغیر کوئی شخص دولت اور عزت نہیں حاصل کرسکتا، اس لئے دولت وعزت کی پروانہ کرنا، ان عیوب سے بچنے کا سب سے پہلا مرحلہ ہے، شیخ اسی بنا پر قناعت کی تعلیم دیتا ہے،

قناعت کن اے نفس براند کے	کہ سلطان و درویش بینی یکے
چرا پیش سلطاں بہ خواہش روی	چو یکسو نہادی طمع، خسروی
وگر خود پرستی شکم طبلہ کن	درِ خانۂ این و آں قبلہ کن
قناعت سرافرازد ای مرد ہوش	سرِ پُر طمع بر نیاید ز دوش
کسے را کہ درج طمع در نوشت	نباید بہ کس عبد و چاکر نوشت
کند مرد را نفسِ امّارہ خوار	اگر ہوشمندی، عزیزش بدار
گر آزادہ بر زمیں خسپ و بس	مکن بہر قالی، زمیں بوس کس
چو بینی کہ از سعی بازو خورم	بہ از میدہ بر خوان اہلِ کرم

یعنی اگر تم قناعت اختیار کروگے تو تم کو بادشاہ اور فقیر یکساں نظر آئیں گے، تم بادشاہ کے آگے کیوں سر جھکاتے ہو، طمع چھوڑ دو، تم خود بادشاہ ہو، جو شخص طمع چھوڑ دیگا وہ اپنے آپ کو غلام اور خانہ زاد نہیں لکھ سکتا، نفسِ امارہ انسان کو ذلیل

کرتا ہے، اگر تم کو عقل ہے تو تم نفس کی عزت کرو، تم کو زمین پر پڑ کر سو رہنا چاہئے، لیکن قالین کے لیے کسی کے آگے زمین نہیں چومنی چاہئے، اس سے بڑھ کر کیا شریفانہ تعلیم ہو سکتی ہے؟

اس سے ظاہر ہے کہ اگر عزتِ نفس کے قائم رہنے کے ساتھ دولت و ثروت، نام و نمود، جاہ و اعزاز حاصل ہو سکتا ہو تو شیخ اس سے باز رکھنے کی تعلیم نہیں دیتا،

ایک حکایت میں شیخ نے اس نکتہ کو صاف اور واضح کر دیا ہے، اور بتایا ہے کہ کسب اور جہد کو توکل پر ترجیح ہے، حکایت یہ ہے، کہ ایک شخص نے ایک لومڑی کو دیکھا جس کے ہات پاؤں کٹے ہوئے تھے، اس کو تعجب ہوا کہ یہ کھاتی پیتی کہاں سے ہے؟ اتفاق سے ایک شیر آنکلا اس کے منہ میں شکار تھا، جب وہ کھا کر چلا گیا تو لومڑی نے اس کا بچا ہوا جھوٹا کھالیا، یہ دیکھ کر اس شخص کو خیال ہوا کہ ہات پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں، میں بھی اسی طرح پاشکستہ بن کر بیٹھ رہوں خدا کہیں سے روزی بھیجدیگا، لیکن کئی دن گزر گئے یہ یوں ہی فاقے کیا کئے، آخر ہاتف غیب پکارا،

برو شیر غرندہ باش اے دغل	مپندار خود را چو روباہ شل

یعنی شیر ہو کر لومڑی کیوں بنتے ہو،

بہ چنگ آر و با دیگراں نوش کن	نہ بر فضلۂ دیگراں گوش کن
چو مرداں بہ تن رنج و راحت رساں	مخنث خورد دست رنج کساں
بگیر اے جواں دست درویش پیر	نہ خود را بیفگن کہ دستم بگیر

تربیت تربیت پر تفصیل سے گفتگو کی ہے، اور بہت سے نکتے ایسے لکھے ہیں، جو اس زمانہ کی سطح سے بالاتر ہیں، مثلاً قدیم تربیت میں لڑکوں کو زجر و توبیخ بلکہ جسمانی سزا دینی ایک ضروری چیز تھی، اور آج تک وہ خیال قائم ہے، خود شیخ نے ایک معلّم کی زبان سے کہا ہے

ع جورِ استاد بہ زمہرِ پدر

لیکن شیخ کی خود تعلیم یہ ہے،

نوآموز را ذکر و تحسین و زہ — ز توبیخ و تہدید استاد بہ

صنعت و حرفت کی تعلیم (تعریف) امراء کے بچوں کے لئے بھی لازمی قرار دی ہے، حالانکہ آج یورپ کی مثالیں دیکھکر بھی ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگاتے،

بیاموز پرورده را دست رنج (صنعت) — دگر دست داری چو قارون بگنج

بپایاں رسد کیسۂ سیم و زر — نگردد تہی کیسۂ پیشہ ور

چہ دانی کہ گردیدن روزگار — بہ غربت بگرداندش در دیار

چو بر پیشۂ باشدش دسترس (توانا بود) — کجا دستِ حاجت برد پیش کس

عام خیال یہ ہے کہ بچوں کو کم درجہ کی خوراک اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنانا چاہئے تاکہ آرام طلب اور عیش پسند نہ ہو جائیں، لیکن شیخ فرماتے ہیں،

پسر را نکو دار و راحت رساں — کہ چشمش نماند بہ دستِ کساں

یعنی بچے کو سیر و سامان سے رکھنا چاہئے تاکہ اس میں بلند نظری پیدا ہو اور لوگوں کی طرف اس کی نگاہیں حسرت سے نہ اٹھیں،

اس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا، صوفیہ اور اہل نظر اسکو عشقِ حقیقی کی منزل اوّلین قرار دیتے تھے، اور ارباب ذوق کے لئے تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا، شیخ چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا، اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا، اس لئے اس نے نہایت سختی سے اس کی برائیاں بیان کیں.

مراز مغزو دست، از درم کن تہی — بہ چو خاطر بہ فرزند مردم نہی

مکن بد بہ فرزند مردم نگاہ — کہ فرزند خویشت بر آید تباہ

صوفیہ کا پردہ کھولتے ہیں،

گروہے نشینند با خوش پسر — کہ ما پاک بازیم و اہلِ نظر

زمن پرس فرسودۂ روزگار — کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار

ازاں برگِ خرما خورد گوسفند — کہ قفل است بر تنگ خرما و بند

صوفیوں کے اس دعوی کو کہ جمال سے ہم کو صنعتِ ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے، اس طرح رد کرتے ہیں،

چرا طفل یک روزہ ہوشش نہ برد — کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خرد

محقق ہماں بیند اندر ابل — کہ در خوبرویانِ چین و چگل

یعنی اگر صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو وہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے، خوش جمال اور پریجمال کی کیا تخصیص ہے، ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں، جو چین اور چگل کے معشوقوں میں ہیں،

شیخ حسن پرستی سے منع نہیں کرتا لیکن بتاتا ہے کہ اس کا صحیح مصرف کیا ہے،

زنِ خوب و خوشخوے آراستہ — چہ ماند بہ نادانِ نو ساختہ

دو دم چو غنچہ دمے از وفا — کہ از خندہ افتد چو گل بر قفا

خرابت کند شاہد خانہ کن — برو خانہ آباد گرداں بہ زن

افسوس ہے کہ عورتوں کا رتبہ شیخ کے زمانہ میں مردوں سے بہت کم سمجھا جاتا تھا، اس لئے جو لوگ اپنی بیوی سے زیادہ محبت رکھتے تھے زن پرست کہلاتے تھے، اور لوگ

ان کو طعنہ دیتے تھے،

شیخ نے اگرچہ ان لوگوں کی طرف سے یہ معذرت کی ہے،

کسے را کہ بینی گرفتار زن | مکن سعدیا طعنہ بروی مزن
تو ہم جور بینی و بارش کشی | اگر یک شبے در کنارش کشی
زناں شوخ و فرماندہ و سرکش اند | ولیکن بدیدم کہ در برخوش اند

لیکن افسوس ہے کہ اس قدسی پیکر کی غرض و غایت لوگوں نے صرف نفس پرستی سمجھی، یہ نہ سمجھے کہ یہ جنس لطیف چہرۂ کائنات کا آب و رنگ ہے،

شیخ نے عورتوں کے متعلق ایک اور ہدایت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ کا معیار اخلاق کس قدر پست ہو گیا تھا،

زن نو کن اے دوست ہر بہار | کہ تقویم پارینہ ناید بکار

لیکن اگر عورت بھی اس فلسفہ پر عمل کرے تو کیا جواب ہوگا؟

شیخ ہمہ تن مذہبی آدمی تھا، اس لئے اس نے تعلیم و اخلاق کی بنیاد بھی مذہب پر رکھی ہے، مذہبی غلو میں حقیقت شناسی بہت کم قائم رہتی ہے، فرض کرو ایک شہر میں ہزاروں مسجدیں ہیں اور نمازیوں کی ضرورت سے زیادہ ہیں، باوجود اس کے ایک شخص پھر نئی مسجد بنائے تو مذہبی آدمی کبھی اس کام کو عبث اور بے فائدہ نہیں کہہ سکتا، حالانکہ قرون اولیٰ میں ایسے کام سے علانیہ روک دیا جاتا تھا حضرت عمرؓ نے حکم بھیجدیا تھا کہ کسی شہر میں (بجز کوفہ و بصرہ کے) ایک سے زیادہ مسجد نہ بننے پائے، ولید نے جامع مسجد کی تعمیر میں شاہانہ حوصلہ مندی کی تو قوم نے علانیہ کہدیا کہ بیت المال کا روپیہ اس طرح ضائع نہیں کیا جاسکتا،

فرض کرو ایک شہر میں بہت سی مسجدیں موجود ہیں، لیکن انگریزی تعلیم (جو تحصیل معاش کا ذریعہ ہے) اس کا سامان بالکل نہ ہو، اب ایک شخص ایک مسجد اور دوسرا شخص انگریزی مدرسہ بنائے تو تم کس کام کو ترجیح دو گے؟

شیخ کی نکتہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے جب نظر آتا ہے کہ وہ مذہبی جوش اور غلو کے حالت میں حقیقت شناسی سے کبھی الگ نہیں ہوتا، ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک بادشاہ نے روزہ رکھا، باورچی کی بیوی نے کہا سلطان کو اس روزہ سے کیا ثواب ہوگا کہ ہم سب بھوکے مریں گے۔

کہ سلطاں ازیں روزہ گوئی چہ خواست	کہ افطار او عید طفلان ماست

شیخ اس مسئلہ کو زیادہ روشن کرنے کے لئے خود اپنی زبان سے کہتا ہے،

خورندہ کہ خیرش برآید ز دست	بہ از صائم الدہر دنیا پرست
مسلّم کسے را بود روزہ داشت	کہ درماندۂ (روزہ دار) راہ دہد نان چاشت
وگرنہ چہ حاجت کہ زحمت بری	ز خود باز داری و ہم خود خوری
خیالات نادانِ خلوت نشیں	بہم بر کند عاقبت کفر و دیں

اخیر شعر میں کہتا ہے کہ سادہ دل خلوت نشیں مذہب کو خراب کر دیتا ہے،

ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک درویش نے حج کا سفر کیا اور ہر ہر قدم پر دو دو رکعتیں نماز پڑھتا جاتا تھا، اس ریاضتِ شاقہ پر اس کو دل میں غرور پیدا ہوا، ہاتفِ غیب نے آواز دی کہ ایک دل کو خوش کرنا ہزار رکعت سے بہتر ہے،

بہ احسانے آسودہ کردن دلے	بہ از الف رکعت بہر منزلے

ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے، لیکن صوفیہ کا گروہ کثیر جو ہمہ تن ریاکار ہے، ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر

نہیں کرسکتا، شیخ اس راز سے خوب واقف تھا اس لئے اس نے نہایت دلیری سے اس طلسم کو توڑا، غزلوں میں نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے،

برون نمیروداز خانقہ یکے ہشیار | کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند
محتسب در قفاے رندان است | غافل از صوفیان شاہد باز

بوستان میں ایک شخص کی زبان سے ان لوگوں کی پوری تصویر کھینچی ہے،

کہ زنہار ازیں مردمانِ خموش | پلنگانِ درندۂ صوف پوش
کہ چوں گربہ زانو بہم بر زنند | وگر صیدے افتد چو سگ در جہند
سوے مسجد آوردہ دکانِ شید | کہ در خانہ کمتر تواں یافت صید
سپید و سیہ پارہ بر دوختہ | بہ سالوس پنہاں زر اندوختہ
زہے جو فروشانِ گندم نمائے | جہاں گرد و سالوس و خرمن گدائے
مبیں در عبادت کہ پیرند وسست | کہ در رقص و حالت جوانند و چست
عصای کلیم اند بسیار خوار | بہ ظاہر چنیں زرد روے و نزار
ز سنت نہ بینی در ایشاں اثر | بجز خواب پیشیں و نانِ سحر

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شیخ نے اخلاق کی بنیاد بے تعصبی پر قائم کی، اس نے مختلف طریقوں سے بے تعصبی کی تعلیم دی ہے، اور جتایا ہے کہ تعصب کے ساتھ اخلاق کا لطیف اور نازک حاسہ قائم نہیں رہ سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک گبر سے جو برتاو کیا تھا، اسکی نسبت وحی کے ذریعہ سے ان کو خدا نے تنبیہ کی کہ ہمارا یہ طریقہ نہیں، اس حکایت سے شیخ کو یہ جتانا تھا کہ معاشرت اور حسن اخلاق میں کافر و مسلم کی تمیز نہیں، شیخ عموماً ہر مذہب و ملت کے بڑے لوگوں کا نام جب لیتا ہے تو ادب

سے لیتا ہے، دارا آتش پرست تھا، تاہم شیخ کہتا ہی،

شنیدم کہ دارائے فرخ تبار ز لشکر جدا ماند روز شکار

نوشیرواں کے زمانہ میں پیدا ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ناز کرنا ثابت کرتا ہے،

سزد گر بدورش بنازم چناں کہ سید بہ دوران نوشیرواں

خود سنّی اور پکا سنّی تھا (علی رغم انف قاضی نور اللہ) لیکن فردوسی کا نام (جو قطعاً شیعہ تھا) اس طرح لیتا ہے،

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد کہ رحمت برآں تربت پاک باد

کیا آج کوئی روشن خیال سنی عالم، کسی شیعہ کی تربت کو پاک اور اُس کی نسبت رحمت کی دعا کر سکتا ہے،

باریک نکتے

شیخ نے اگرچہ فلسفۂ اخلاق کو شاعرانہ انداز میں لکھا، لیکن مسائلِ اخلاق کے متعلق بہت سے ایسے نازک، دقیق اور لطیف دلائل اور وجوہ بیان کئے کہ اخلاق کی فلسفیانہ تصنیفات میں بھی نہیں مل سکتے، کبر، حسد، غیبت وغیرہ خباثت نفسانی کی برائیوں کے وجوہ تمام کتابوں میں مذکور ہیں، لیکن شیخ ان سب سے الگ دقیق باتیں پیدا کرتا ہے، بدگوئی کی برائی کی نسبت کہتا ہے،

بداند رحق مردم نیک و بد مگوئے جوان مرد صاحب خرد

کہ بدمرد را خصم خود می کنی وگر نیک مرد است بد میکنی

یعنی بدگوئی نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ جس کی بدگوئی کروگے دو صورت سے خالی نہیں، اگر وہ اچھا آدمی ہے تو اچھے آدمی کو برا کہنا مناسب نہیں، اور برا ہے تو برے آدمی کو اپنا

دشمن بنا لینا اچھا نہیں، یہ ظاہر ہے کہ برا آدمی کسی کی دشمنی کرتا ہے تو جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتا، اس لئے برے آدمی کو اپنا دشمن بنانا اپنے آپ کو بلا میں پھنسانا ہے، یہ تقسیم اور استدلال جس قدر فلسفیانہ ہے، اسی قدر واقعی اور عملی ہے،

یا مثلاً خاموشی کی خوبیاں تمام اخلاقی کتابوں میں مختلف طریقوں سے بیان کی ہیں، لیکن شیخ سب سے الگ فلسفیانہ طریقہ سے اس کو ثابت کرتا ہے،

ترا خامشی اے خداوند ہوش　　وقارست و نااہل را پردہ پوش
اگر عالمی ہیبت خود مبر　　وگر جاہلی پردۂ خود مدر

یعنی خاموشی، عالم و جاہل دونوں کے لئے مفید ہے، عالم کا تو وقار بڑھتا ہے اور جاہل کا پردہ ڈھکا رہتا ہے،

یا مثلاً دوسروں کے اعتراض اور نکتہ چینی کا برا نہ ماننا اور اس کو گوارا کرنا اسکو شیخ اس طرح دلنشین کرتا ہے،

گر آنی کہ دشمنت گوید مرنج　　ور آں نیستی گو، برو باد سنج

یعنی دو حال سے خالی نہیں، یا جو اعتراض دشمن کرتا ہے، واقعی ہے تو واقعی اور سچی بات کا برا ماننا کیا؟ اور جھوٹ اور غلط کہتا ہے تو جھوٹ بات کا کیا رنج، اسکو بکنے دو،

یا مثلاً بدمزاج اور بد اخلاق زاہد کی نسبت لکھتا ہے،

نہ خورد از عبادت برآں بیخرد　　کہ با حق نکو بود و با خلق بد

یعنی اس شخص نے عبادت کا پھل نہیں چکھا جو خدا کے ساتھ بھلائی سے پیش آیا اور مخلوقات کے ساتھ برائی سے، یہاں یہ دقیق نکتہ بتایا ہے کہ کج خلق عابد جو عبادت کرتے ہیں، ان کی عبادت، اصلی نیکی اور دل کے اقتضا سے نہیں ہوتی، بلکہ سزا اور عقاب کے

ڈر سے ہوتی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس سے ان کو اس قسم کا اندیشہ نہیں (بندگانِ خدا سے)
اس سے وہ کج اخلاقی اور بدمزاجی اور دل آزاری کا برتاؤ کرتے ہیں،

شیخ نہایت سرسری اور معمولی واقعات سے جورات دن لوگوں کو پیش آتے
رہتے ہیں، نہایت دقیق نکتے پیدا کرتا ہے، مثلاً چھوٹے بچوں کو لوگ میلے ٹھیلے میں ساتھ
لیجاتے ہیں تو اس کے ہات میں دامن دیدیتے ہیں کہ ہجوم میں کہیں بھٹک نہ جائے، شیخ
کو بچپن میں یہ واقعہ پیش آیا تھا،

شیخ نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا،

همے یاد دارم ز عهدِ صغر — که عیدے برون آمدم باپدر
ببازیچه مشغولِ مردم شدم — در آشوب خلق از پدر گم شدم
بر آوردم از بیقراری خروش — پدر ناگهانم بمالید گوش
که اے شوخ چشم، آخرت چند بار — نگفتم که دستت ز دامن مدار
تو هم طفل راهی به سعی اے فقیر — برو دامنِ نیک مرداں بگیر

یعنی جو شخص، راہ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں ہو وہ بچہ ہے، اسلئے اس کو مرشد کا
دامن نہیں چھوڑنا چاہئے،

تم نے دیکھا ہوگا کہ بلی اپنے فضلہ کو خاک میں چھپا دیتی ہو تم کو کچھ خیال بھی نہ آیا ہوگا
لیکن شیخ اس مبتذل واقعہ سے کس قدر پر اثر اخلاقی نتیجہ استنباط کرتا ہے،

پلیدی کند گربه بر جاے خاک — چو زشتش نماید بپوشد به خاک
تو آزادی از ناپسندیده ها — نه ترسی که بروے فتد دیده ها

یعنی بلی کو اتنا خیال ہو کہ وہ اپنے فضلہ کو جو بدنما معلوم ہوتا ہے، چھپا دیتی ہے اتم

ہزاروں برائیاں کرتے ہو اور لوگ دیکھتے ہیں اور تم کو شرم نہیں آتی،

ایک شخص کیچڑ میں لتھڑا ہوا مسجد میں جانے لگا، موذن نے ڈانٹا کہ نجاست کے ساتھ ایسی پاک جگہ میں جاتا ہے، شیخ پر اس کا اثر جو ہوا وہ یہ تھا،

گل آلودۂ راہ مسجد گرفت — ز بخت نگوں طالع اندر شگفت

یکے زجر کردش کہ تبت یداک — مرو دامن آلودہ در جای پاک

مرا رقتے در دل آمد بریں — کہ پاک است و خرم بہشت بریں

دراں جای پاکاں امیدوار — گل آلودۂ معصیت را چہ کار

بچپن میں شیخ کے والد نے شیخ کو انگوٹھی خرید کر دی کسی عیار نے مٹھائی کا لالچ دیا، ان کو انگوٹھی کی کیا قدر تھی، مٹھائی لے کر انگوٹھی دیدی، یہ واقعے عموماً پیش آتے ہیں، شیخ اس سے کس قدر عظیم الشان نتیجہ پیدا کرتا ہی،

بدر کرد ناگہ یکے مشتری — بہ شیرینی از دستم انگشتری

چو نشناسد انگشتری طفل خرد — بہ شیرینی از وے توانند برد

تو ہم قیمت عمر نشناختی — کہ در عیش شیرینی برانداختی

لطف و احسان کا اثر ایک معمولی واقعہ سے اس طرح ثابت کرتے ہیں،

بہ رہ بر یکے پیشم آمد جواں — بہ تگ در پیش گوسفندے دواں

بدو گفتم ایں ریسمان است و بند — کہ می آید اندر پیت گوسفند

سبک طوق و زنجیر ازو باز کرد — چپ و راست پوئیدن آغاز کرد

چو باز آمد از عیش و شادی بجاے — مرا دید و گفت اے خداوند راے

نہ ایں ریسماں می برد با منش — کہ احسان کمندیست در گردنش

ایک درویش کو کتے نے پاؤں میں کاٹ لیا، زخم کی تکلیف سے رات بھر وہ کراہا کیا، اس کے ایک کمسن لڑکی تھی، اُس نے کہا ابا! پھر آپ نے کیوں نہیں کتے کو کاٹ کے برابر سرابر ہو جاتے، درویش نے کہ جانِ من! میرے دانت کتے کے قابل نہ تھے، شیخ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے، کہ تم کو اگر کوئی نا اہل بُرا کہے اور تم بھی اُس کو بُرا کہو تو اسکی یہی مثال ہو گی کہ آدمی کتے کو کاٹنا چاہے،

محال است اگر تیغ بر سر خورم | کہ دندان بپائے سگ اندر برم
تواں کرد با ناکساں بدرگی | ولیکن نیاید ز مردم سگی

شیخ کی انتہائے قوت تخیل کا اندازہ، ان فرضی حکایتوں سے ہو سکتا ہے جو محض اسکی قوت تخیل کا نتیجہ ہوتی ہیں، اور جن کو وہ واقعیت اور حسنِ استدلال کا مجموعہ بنا دیتا ہے مثلاً

یکے قطرہ باراں ز ابرے چکید | خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم | گر او ہست، حقا کہ من نیستم
چو خود را بہ چشم حقارت بدید | صدف در کنارش بجاں پرورید
سپہرش بہ جائے رسانید کار | کہ شد نامور لولوئے شاہوار

یعنی بادل سے ایک قطرہ ٹپکا، دریا کا پاٹ دیکھ کر شرمایا کہ اس کے آگے میری کیا حقیقت ہے، چونکہ اُس نے اپنے آپ کو حقیر سمجھا، سیپ نے اس کو اپنی گود میں لیا، چند روز کے بعد دیکھا تو وہی قطرہ گوہر شاہوار تھا، یا مثلاً

گلے خوشبوے در حمام روزے | رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری | کہ از بوی دل آویز تو مستم
بگفتا من گلِ ناچیز بودم | ولیکن مدتے با گل نشستم

جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد | دگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یا مثلاً

زدم تیشہ یک روز بر تلِ خاک | بگوش آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردی آہستہ تر | کہ چشم و بنا گوش و روی ست و سر

یعنی میں نے ایک دن ایک خاک کے ٹیلہ پر پھاوڑا مارا، اس سے آواز آئی کہ میاں اگر تم میں آدمیت اور غیرت ہے تو ذرا آہستہ، کیونکہ یہ سب آنکھیں اور کان اور چہرے اور سر ہیں،

(یعنی آج جو خاک ہے یہ پہلے انسان کی اعضا تھے جو بوسیدہ ہو کر خاک ہو گئے)

یا مثلاً

مگر دیدہ باشی کہ در باغ و راغ | بتابد بہ شب کرمکے چوں چراغ

یکے گفتش اے مرغکِ شب فروز | چہ بودت؟ کہ بیروں نیائی بروز

بہ بیں کاتشیں کرمکِ خاک زاد | جواب از سر روشنائی چہ داد

کہ من روز و شب جز بہ صحرا نیم | ولے پیش خورشید پیدا نیم

یا مثلاً

شبے یاد دارم کہ چشمم نہ خفت | شنیدم کہ پروانہ با شمع گفت

کہ من عاشقم گر بسوزم رواست | ترا گریہ و سوز بارے چراست

بگفت اے ہوا دار مسکین من | برفت از برم یار شیرین من

تو بگریزی از پیش یک شعلہ خام | من استادہ ام تا بسوزم تمام

ترا آتش عشق اگر پر بسوخت | مرا بیں کہ از پائے تا سر بسوخت

پیرایۂ ادا

شیخ کی کمال شاعری کا اصلی معیار، اس کا پیرایۂ ادا ہے، اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا، کہ کس مضمون کے موثر کرنے کا سب سے بڑھکر کونسا

طریقہ ہے، جن جن مضامین کو اس نے لیا ہے، ان کو جس پیرایہ میں ادا کیا ہے، متقدمین اور متاخرین میں اس کی نظیر مطلق نہیں مل سکتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، صرف ایک مخزن الاسرار نظامی کے طرز پر ۷۰ مثنویاں لکھی گئیں، اور سب کی سب اخلاق و تصوف میں ہیں، لیکن بوستان اور گلستان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا، چند مثالوں سے تم اس کا اندازہ کر سکتے ہو،

مثلاً دولت و حکومت کی تنقیص ایک پامال مضمون ہے، جو سیکڑوں دفعہ لوگ مختلف پیرایوں میں ادا کر چکے ہیں، لیکن شیخ کا صرف ایک شعر سب پر بھاری ہے،

گدا را کند یک درم سیم سیر　　فریدوں بہ ملک عجم نیم سیر

شیخ نے اس کے ساتھ فلسفیانہ طریقہ سے ثابت کر دیا ہے کہ دولت مندی در حقیقت محتاجی ہے،

خبر دہ بہ درویش سلطاں پرست　　کہ سلطان ز درویش مسکیں ترست

نگہبانی ملک و دولت بلا است　　گدا بادشاہ است و نامش گدا ست

بخسپند خوش، روستائی و جفت　　بہ ذوقے کہ سلطان در ایوں نہ خفت
(دہقان . بیوی)

اسی مضمون کو ایک مصرع میں ادا کیا ہے، ع

آنانکہ غنی تر اند محتاج تر اند

یہ ظاہر ہے کہ انسان جس قدر دولت مند اور امیر ہو جاتا ہے، اس کی ضرورتیں اور حاجتیں بڑھتی جاتی ہیں، اس لئے زیادہ دولت مندی در حقیقت زیادہ محتاجی ہے، یا مثلاً یہ تلقین کرنا تھا کہ دولت مندوں کو غریبوں پر رحم کرنا چاہئے، اسکو شیخ نے اس حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا،

ملک صالح از پادشاہانِ شام | بروں آمدے صبحدم با غلام
بگشتے در اطرافِ بازار و کوی | بہ رسمِ عرب نیمہ بربستہ روی
دو درویش در مسجدے خفتہ یافت | پریشاں دل و خاطر آشفتہ یافت
یکے زاں دو می گفت با دیگرے | کہ ہم روزِ محشر بود داورے
گر ایں پادشاہانِ گردن فراز | کہ با لہو و عیش اند و با کام و ناز
درآیند با عاجزاں در بہشت | من از گور سر بر نگیرم ز خشت
بہشتِ بریں ملک و ماوی ما است | کہ بندِ غم امروز بر پای ما است
اگر صالح آں جا بہ دیوارِ باغ | درآید، بہ کفشش بدرّم دماغ

حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ ملک صالح (شام کا بادشاہ اور سلطان صلاح الدین کے خاندان سے تھا) ایک دن شہر کے گشت کو نکلا، دو فقیر ایک مسجد میں لیٹے تھے، اور جاڑے، اور بھوک کی تکلیف سے بیتاب تھے، ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ آخر قیامت میں بھی کوئی حاکم ہوگا، اگر یہ بادشاہ لوگ جو دنیا میں مزے اڑاتے پھرتے ہیں، ہم غریبوں کے ساتھ بہشت میں داخل ہونگے تو میں قبر سے سر نہ اُٹھاؤں گا، بہشت ہمارا حصہ ہے کہ ہم آج مصیبتیں بھر رہے ہیں، صالح اگر وہاں بہشت کی دیوار کے پاس بھی آیا تو اُس کا سر توڑ دونگا،

دولت مندوں کو غریبوں پر رحم دلانے کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ تکلیف کی حالت میں غریبوں کو امیروں کی ناز و نعمت پر جو رشک، جلن، اور غصہ پیدا ہوتا ہے، اسکو دکھایا جائے، شیخ نے اُس کی نہایت صحیح تصویر کھینچی ہے، شعر باوجود اس کے کہ تہذیب کی حد سے بڑھا ہوا ہے، واقعیت اور اصلیت کی اصلی تصویر ہے، لیکن شیخ نے اسی پر

اکتفا نہیں کی، بلکہ بادشاہ کے فیاضانہ طرزِ عمل کو بھی دکھایا،

روان ہر دو کس را فرستاد و خواند | بہ ہیبت نشست و بہ حرمت نشاند
برایشان ببارید باران جود | فروشست شان گرد ذلّ از وجود
شہنشہ ز شادی چو گل برشگفت | بخندید و در روی درویش گفت
من آں کس نیم کز غرور و حشم | ز بیچارگاں روی درہم کشم
من امروز کردم، در صلح باز | تو فردا مکن، در بر ویم فراز

یعنی بادشاہ نے اُن فقیروں کی مہمانی اور حاجت روائی کر کے کہا کہ آج میں آپ لوگوں کے ساتھ عاجزی اور دوستی کا برتاؤ کرتا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ قیامت میں مہربانی کیجئے گا، اور مجھ کو بہشت میں آنے سے نہ روکئے گا،

سننے والے پر فقیروں کے غم اور غصہ سے جو اثر پیدا ہوا تھا، وہ بادشاہ کے شریفانہ طرزِ عمل اور حکیمانہ جواب سے کس قدر اور زیادہ قوی ہوگیا ممکن نہیں کہ ایک دردمند دل اس کو پڑھے اور اس کے آنسو نکل نہ آئیں،

یا مثلاً غیبت کی بُرائی کو، لوگوں نے مختلف پیرایوں میں ادا کیا تھا، شیخ نے سب سے زیادہ اچھوتے لیکن نہایت موثر طریقہ سے اس حکایت کے پیرایہ میں اس مضمون کو ادا کیا،

طریقت شناسانِ ثابت قدم | بہ خلوت نشستند چندے بہم
یکے زاں میان غیبت آغاز کرد | در ذکر بیچارہ باز کرد
کسے گفتش اے یار شوریدہ رنگ | تو ہرگز غزا کردۂ در فرنگ
بگفت از پس چار دیوار خویش | ہمہ عمر ننہادہ ام پاے پیش

(بھی)

چنیں گفت درویشِ صادق نفس | ندیدم چنیں بخت برگشتہ کس
که کافر ز پیکارش ایمن نشست | مسلماں ز جورِ زبانش نہ رست

یعنی چند آدمی ایک صحبت میں شریک تھے، ایک شخص نے کسی کی غیبت شروع کی، ایک نیک نفس نے کہا کیوں یار! کبھی تم نے کافروں سے لڑائی بھی کی ہے، اس نے کہا میں نے تو کبھی گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالا، نیک نفس نے کہا سبحان اللہ! کافر تو آپ کے حملہ سے محفوظ رہا، لیکن مسلمان آپ کی تیغِ زبان سے نہ بچ سکا، ایک اور طریقہ سے اسی مضمون کو ادا کیا ہے،

زباں کرد شخصے زغیبت دراز | بدو گفت دانندۂ سرفراز
کہ یادِ کساں، پیشِ من بد مکن | مرا بدگماں در حقِ خود مکن

زیادہ گوئی کی بُرائی نہایت پامال مضمون ہے لیکن شیخ اس مضمون کو کس قدر عجیب اسلوب سے ادا کرتا ہے،

کمال است در نفسِ انساں سخن | تو خود را بہ گفتار ناقص مکن

یعنی قوت ناطقہ ہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے، ایسا نہ کرو کہ یہی وصف (زیادہ گوئی کی وجہ سے) تمھارے نقصان کا سبب قرار پائے،

کم آواز ہرگز نہ بینی خجل | جوی مشک بہتر کہ یک تودہ گل
حذر کن ز نادان دہ مردہ گوی | چو دانا یکے گوی و پروردہ گوی
صد انداختی تیر و ہر صد خطا است | اگر ہوشمندی یک انداز و راست

(حاشیہ: لغو؛ معقول)

یعنی سیکڑوں تیر تم نے نشانہ پر لگائے اور سب خالی گئے، اگر عقلمند ہو تو ایک تیر لگاؤ لیکن ٹھیک نشانہ پر لگاؤ،

مناجات، تضرع، استغفار اور توبہ فی نفسہ ایک موثر مضمون ہے، لیکن شیخ نے اسکو ایک حکایت کے پیرایہ میں کس قدر اور زیادہ موثر کر دیا ہے،

شنیدم کہ مستے ز تاب نبید — بہ مقصورۂ عابدے بر دوید

نشہ — شراب

بنالید بر آستانِ کرم — کہ یارب بہ فردوسِ اعلیٰ برم

موذن گریبان گرفتش کہ ہین — سگ و مسجد اے فارغ از عقل و دیں

چہ شایستہ کردی کہ خواہی بہشت — نمی زیبدت ناز با روی زشت

بگفت این سخن پیر و بگریست مست — کہ مستم بدار از من اے خواجہ دست

عجب داری از لطفِ پروردگار — کہ باشد گنہگارے اُمیدوار

ترا می نگویم کہ عذرم پذیر — در توبہ باز است و حق دستگیر

ہمی شرم دارم ز لطفِ کریم — کہ خوانم گنہ پیشِ عفوش عظیم

یعنی ایک مست نشہ کے زور میں مسجد میں گھس گیا اور رو کر پکارا کہ اے خدا مجھ کو بہشت میں لیجانا، موذن نے اس کا گریبان پکڑ کہا کہ او سگ نجس! مسجد میں تیرا کیا کام، تو نے کون سا اچھا عمل کیا ہے کہ بہشت کا دعویٰ ہے، مست رو پڑا، اور بولا کہ کیا آپ کو خدا کے لطفِ عمیم سے یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ایک گنہگار اس کی مغفرت کا امیدوار ہو، میں نے آپ سے تو مغفرت کی خواہش نہیں کی، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور خدا دستگیر ہے، مجھ کو تو شرم آتی ہے کہ میں خدا کے عفو کے مقابلہ میں اپنے گناہ کو زیادہ سمجھوں،

غور کرو شیخ نے اس مضمون کے موثر کرنے کے لئے بلاغت کے کن نکتوں کو ملحوظ رکھا ہے، سب سے پہلے یہ کہ مناجات میں براہ راست خدا کو مخاطب نہیں کیا، کیونکہ انسان کسی شخص کو جب مخاطب کر کے اس کی مدح، یا اس کی نسبت حسن ظن ظاہر کرتا ہے تو اس

میں ظاہرداری اور خوشامد کے شائبہ کا احتمال ہوتا ہے، یہی نکتہ ہے کہ سورۂ الحمد میں خدا کی حمد، صیغۂ غائب سے ادا کی ہے، موذن کی ڈانٹ بتانے سے، مناجات مانگنے والے کی نسبت دل میں رحم کا اثر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس سے اسکی نہایت مظلومی اور موذن کی بے رحمی ظاہر ہوتی ہے، اب اس کا یہ جواب کہ میں آپ سے تو رحم کا خواستگار نہیں مجھ کو جس سے امید ہے، وہ اور ہی کریم النفس ذات ہے، مناجات کے قبول کے لئے کس قدر موثر ہے، یہ قاعدہ ہے، کہ کوئی شخص اگر کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی مہربانی اور رحم پر اپنا بھروسہ ظاہر کرے تو اس شخص کو خواہ مخواہ اس کی شرم اور اس کا پاس ہوگا، ان باتوں کی مجموعی ترتیب نے مناجات اور طلب مغفرت کے مضمون کو نہایت موثر کردیا ہے،

ہم نے اطناب کے ڈر سے صرف چند مثالوں پر قناعت کی، عموماً جن مضامین کو شیخ نے ادا کیا ہے، ان کا مقابلہ اور شعراء اور مصنفین سے کرو تو صاف نظر آئیگا کہ شیخ کو اس خصوصیت میں کیا ترجیح حاصل ہے،

مناظر قدرت اس قسم کے مضامین میں بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے، اور اب تک پامال ہوتا آتا ہے، لیکن شیخ کے قصیدہ کا اب تک جواب نہ ہو سکا،

بامدادان کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار
یعنی دن اور رات برابر ہوگئے،
خوش بود دامن صحرا و تماشائے بہار

آدمی زادہ اگر در طرب آید چہ عجب
سرو در باغ برقص آمدہ و بید و چنار

باش تا غنچۂ سیراب دہن باز کند
بامدادان چو سر نافۂ آہوئے تتار

باد گیسوئے عروسان چمن شانہ کند
بوئے نسرین و قرنفل برود در اقطار

ژالہ بر لالہ فرود آمدہ ہنگام سحر
راست چون عارض گلبوی عرق کردۂ یار

شبنم
ارغوان ریختہ بر در گہ خضرائے چمن
ہم چنان است کہ بر تختۂ دیبا دینار

این ہنوز اول آثار جہان افروزیست   باش تا خیمہ زند دولت نیسان و ایار
(بہار کے مہینے ہیں)

شاخہا دختر دوشیزۂ باغ اند ہنوز   باش تا حاملہ گردند بہ الوان ثمار
(رنگ برنگ کے پھل)

تا نہ تاریک شود سایۂ انبوہ درخت   زیر ہر برگ چراغے بنہند از گل نار

سیب را ہر طرفے دادہ طبیعت رنگے   ہم بداں گونہ کہ گلگونہ کند روے نگار

گو نظر باز کن و خلقت نارنج ببیں   ایکہ باور نہ کنی فی الشجر الاخضر نار

آب دریای ترنج و بہ و بادام روان   ہم چو در زیر درختان بہشتی انہار

غزل | یہ عموماً مسلم ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآبا ہیں، قدما، تو سرے سے غزل کہتے ہی نہ تھے، قصائد کے ابتدا میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے، یہی اُس زمانہ کی غزل تھی، متاخرین قدما، مثلاً انوری، ظہیر وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کرکے غزلیں لکھیں لیکن ان میں کسی قسم کا اثر، اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی، البتہ چونکہ زمانہ کے امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود روز بروز سادہ اور صاف ہوتی جاتی تھی، اس لئے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، کمال اسمٰعیل کی غزل کا نمونہ اوپر گذر چکا، اس زمانہ کے اور شعرار کی سادگی کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا،

غزل (از محمد بن نصیر)

گل کہ شایان بادہ بود، رسید   آمدن وعدہ دادہ بود رسید

جنگ لالہ گذشت و لشکر گل   گرچہ بستر فتادہ بود رسید

سرو آزاد، بہر سوسن راست   منتظر، ایستادہ بود رسید

لالہ رفت، ارچہ بارے نہ گل بود   گل اگرچہ پیادہ بود رسید

دیگر (از صفی)

چه درد است این که عشقش نام کردند	وز و آشوب، خاص و عام کردند
هر آنچه اندر زمانه درد و دل بود	یکے کردند و عشقش، نام کردند
خراباتے است اندر عشق کاں جا	ز خونِ دل، می اندر جام کردند
بیکٹ ساغر دراں بت خانہ مارا	چنیں سرمست و بے آرام کردند

دیگر

فتنہ ہا بر دلم انبار مکن، گو نہ کنم	بارہا کردہ انیکار مکن، گو نہ کنم

شیخ کو سادگی اور صفائی کے متعلق کچھ کوشش نہیں کرنی پڑی جو زبان اُن کے زمانہ میں موجود تھی پہلے ہی منجھ چکی تھی، شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں حسب ذیل ہیں،

(۱) شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شعرا گذرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے، ان میں سے بعضوں نے تو سرے سے عشق کو ہات بھی نہیں لگایا تھا، بعضوں نے حسن سخن کے لئے اس سے کام لیا، لیکن وہ نرے الفاظ ہی الفاظ تھے، اندر کچھ نہ تھا، شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے، اس لئے زندگی کا جو کچھ سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی، حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مستقل رہی، اسی آگ کے شعلے ہیں جو اسکی زبان سے نکلتے ہیں، اُس نے معشوقوں کے جور و ستم اور بے مہری اور بیوفائی کے، جاں گداز صدمے اٹھائے ہیں، اس لئے اس کا سینہ، درد اور سوز و گداز کا آتشکدہ ہے، اشعار ذیل سے اس کا اندازہ کرو،

خبر ما برسانید بہ مرغانِ چمن	کہ ہم آواز شما در قفسے افتادہ است
گردے داری بہ دلدارے بیار	ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرائے عقل پرسیدم ز عشق　　　گفت معزول است و فرمانیش نیست

گفتم کہ عشق را بہ صبوری دوا کنم　　　ہر روز عشق بیشتر و صبر کمتر است

بہ خشم رفتۂ ما را کہ می برد پیغام؟　　　بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

ہمہ از دستِ غیر نالہ کنند　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

در سوختہ پنہاں نتواں داشتن آتش　　　ما ہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

گفتمش سیر بہ بینم مگر از دل برود　　　آں چناں جائے گرفتست کہ مشکل برود

ولے از سنگ بباید بر سرِ راہ وداع　　　کہ تحمل کند آن لحظہ کہ محمل برود

ندانمت ز کجا آں سپر بدست آری　　　کہ تیر آہ مرا ز آسمان بگذرانی

حدیث عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر　　　بہ سر نہ کوفتہ باشد درِ سرائے را

سعدیا! ایں ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست　　　آتشے ہست کہ دود از سرِ آں مے آید

سعدیا! نوبتی امشب دہلِ صبح نہ کوفت　　　یا مگر صبح نباشد شبِ تنہائی را

دو دوست قدر شناسند روز صحبت را　　　کہ مدتے ببریدند و باز پیوستند

ایکہ گفتی مرو اندر پے خونخوارۂ خویش　　　با کسے گوی کہ در دست عنانے دارد

۲۔ شیخ سے پہلے عشق کے واردات اور معاملات نہیں بیان کرتے تھے، شیخ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی، خسرو، شرف جہاں قزوینی نے اُسکو ترقی دی اور وحشی یزدی پر اس طرز کا خاتمہ ہوگیا،

بوسۂ از لبِ جاں بخش بدہ یا بستاں　　　کایں متاعی است کہ بخشند و بہا نیز کنند

امشب مگر بہ وقت نمی خواند ایں خروس　　　عشاق بس نہ کردہ ہنوز از کنار و بوس

شب وصل

تا نشنوی ز مسجدِ آدینہ بانگِ صبح　　　یا از درِ سرائے اتابک غریو کوس

لب از لبِ چو چشمِ خروس ابلہی بود   برداشتن بہ گفتنِ بیہودہ خروس

مرا راحت از زندگی دوش بود   کہ آں ماہ رویم در آغوش بود

ندانستم از غایتِ لطف و حسن   کہ سیم و سمن یا بر و دوش بود

بہ دیدار و گفتارِ جاں پرورش   سراپاے من دیدہ و گوش بود

مؤذن غلط گفت بانگ نماز   مگر ہمچو من مست و مدہوش بود
اذان

سرمست بتے لطیف و سادہ   در دست گرفتہ جامِ بادہ

در مجلس بزم بادہ نوشاں   بستہ کمر و قبا کشادہ

لعلش چو عقیق گوہر آگیں   زلفش چو کمند، تاب دادہ

بنشستہ زمیں بہ حضرت شے   گردونش بہ خدمت ایستادہ

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست   تا ندانند حریفاں کہ تو منظورِ منی

۳۔ شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اس بنا پر جب اس مذاق کے لوگ ان اشعار کو سنتے ہیں تو ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی شخص ان ہی کے خیالات کی سفارت کر رہا ہے، اور ایسے دلنشین اور مؤثر طریقہ سے کر رہا ہے کہ وہ خود نہیں کر سکتے تھے، مثلاً عشق پر ملامت کرنے کے وقت عاشق کے دل میں عموماً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی بدعت نہیں سبھی اس مرض میں مبتلا ہیں، اور اچھی صورت کی طرف دل کا نہ کھچنا ہو بھی تو نہیں ہو سکتا، شیخ اسی خیال کو نہایت برجستگی اور صفائی سے ادا کرتا ہے،

عشق بازی نہ من آخر بہ جہاں آوردم   یا گناہی است کہ اول من مسکیں کردم

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر　　　کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

رفیق و مہربان و یار ہمدم　　　ہمہ کس دوست می دارند و من ہم

نظر بر نیکوان رسمے است معہود　　　نہ ایں بدعت من آوردم بہ عالم

تو گر دعوئ کنی پرہیز گاری　　　مصدق دانمت واللہ اعلم

دگر گوئی کہ میں خاطرم نیست　　　من ایں دعوئ نمی دارم مسلّم

حدیثِ عشق اگر گوئی گناہ است　　　گناہ اوّل ز حوّا بود و آدم

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　　باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اس شعر کی بلاغت پر لحاظ کرو، کہنا یہ تھا کہ لوگ مجھکو عاشقی سے منع کرتے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ معشوق کا حسن ہی ایسا دلفریب ہے کہ دل قابو میں نہیں رہ سکتا، اس بات کو کہ معشوق کا حسن نظر فریب ہے، یوں ادا کیا کہ یہ معشوق سے پوچھنا چاہیئے کہ وہ اس قدر حسین کیوں ہے؟ اس طرزِ ادا میں پھر یہ جدت کہ خود معشوق کو مخاطب بنایا، اور یہ کہا کہ یہ تو تجھ سے پوچھنا چاہیئے، کہ تو اس قدر حسین کیوں ہے؟ معشوق کے حسن کی تعریف خود اس کے منھ پر، اس کا پہلو اس سے بڑھ کر کیا لطیف اور دلآویز ہو سکتا ہے،

۴۔ شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں، زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے، خیام نے رباعیوں میں اس مضمون کو ادا کیا تھا، لیکن صاف صاف اور کھلے کھلے لفظوں میں شیخ کی طرح چھپی اور چھبتی ہوئی چوٹیں نہ تھیں جن سے ریاکاروں کے دل برما جائیں،

محتسب در قفائے رندان ست　　　غافل از صوفیانِ شاہد باز

یعنی محتسب رندوں کا تعاقب کرتا پھرتا ہے، لیکن شاہد باز صوفیوں کی اس کو خبر تک نہیں کہ یہ چھپ چھپ کر کیا کرتے ہیں،

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار که پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

اس مضمون کو خواجہ حافظ نے اس قدر پھیلایا کہ خاص ان کا ہو گیا، لیکن اصل بنیاد شیخ نے قائم کی،

اے محتسب از جواں چہ پرسی من توبہ نمے کنم کہ پیرم

اس شعر میں اوروں کے بجائے خود اپنے آپ کو ملزم قرار دیا ہے، اور یہ بلاغت کا خاص پہلو ہے،

ہیچ کس بے دامنِ تر نیست اما دیگراں بازی پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم

۵۔ مدح، ذم، رزم، مرثیہ، غرض جس قدر انواع مضامین ہیں، اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں، اشعار مل سکتے ہیں، لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں، ان ہی کو سو طرح الٹ پلٹ کر بیان کرتے ہیں، اس لئے اصلی شاعری کا حقدار وہی ہے، جس نے یہ بنیادیں قائم کی ہوں، شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کر دیا کہ طائرِ خیال بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرزِ خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی، مثلاً

سعدی	حافظ
اے بلبل اگر نالی، من با تو ہم آوازم	بنال بلبل، اگر با منت سر یاری است
تو عشق گلے داری من عشقِ گل اندامے	کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

سعدی

فریاد دوستاں ہمہ از دستِ دشمن است
فریاد سعدی از دلِ نامہربانِ دوست

حافظ

من از بیگانگاں ہرگز ننالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد

"

گر کند میل بہ خوباں دلِ من خردہ مگیر
کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

من ارچہ عاشقم و رند و می کش و قلاش
ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند

خواجہ حافظ نے نہایت لطیف طریقہ سے اس مضمون کو ادا کیا ہے، لیکن اصل خیال کی بنیاد وہی شیخ کا شعر ہے،

اے قافلہ سالار چنیں تند چہ رانی
آہستہ کہ در کوہ دگر باز پسانند

تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من
پیادہ میروم و ہمرہاں سوارانند

سجدہ کایزد را بود، گو سجدہ در بتخانہ باش

ہمہ جا جلوۂ یار است چہ مسجد چہ کنشت

اے گنجِ نوشدارو بر خستگاں گذر کن
مرہم بدستِ وما را مجروح می گذاری

چہ عذر از بختِ خود جویم کہ آں عیارِ شہر آشوب
بتلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

سعدی

شبے و جمعے و گویندۂ زیبائے
ندارم از ہمہ عالم جز ایں تمنائے

"

اے برادر ما بہ گرداب اندریم
واں کہ شنیعت می زند بر ساحل است
طعنہ

حافظ

دو یارِ زیرک و از بادہ کہن دو منے
فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے
من ایں مقام بدنیا و آخرت ندہم
اگرچہ درپیم افتند خلق انجمنے

"

وے از سنگ بباید بسر راہ وداع
کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

قمی

قمی آں صبر و تحمل کہ با ومی نازی
می نمایم بتو چوں یک دو سہ منزل برود

"

گر تو خواہی کہ بجوئی دلم، امروز بجوے
ورنہ بسیار بجوئی و نیابی بازم

یہ شعر گویا واسوخت کی بنیاد ہے،

۶۔ شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کردیتے تھے، شیخ نے طرز ادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے، وہ ایک معمولی سی بات کو لیتے ہیں اور طرز ادا سے اس میں اعجوبگی پیدا کردیتے ہیں، مثلاً ان کو کہنا یہ تھا کہ گناہ سب کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ اور لوگ پردہ میں کرتے ہیں اور ہم ریاکاری سے چھپاتے نہیں، اس مضمون کو شیخ اس طرح ادا کرتا ہے،

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں
باز می پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

دامن تر گناہ کو کہتے ہیں، بر آفتاب افگندن، دھوپ میں ڈالنا، اور کسی کام کے علانیہ کرنے کو بھی کہتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کون نہیں کرتا، فرق یہ ہے کہ اور لوگ چھپاتے ہیں، اور ہم علانیہ کرتے ہیں، دامن تر اور "بر آفتاب افگندن" کے محاورہ اور اس طرز ادا نے کس قدر خوبی پیدا کردی ہے، دھوپ میں ڈال دینے سے چیز خشک ہوجاتی ہے، اسلئے یہ بھی کنایہ ہے کہ ریاکاری سے بچنا کسی نہ کسی دن ہمکو گناہ سے مجتنب بھی کردیگا، یا یہ کہ خدا ایسا گناہ معاف بھی کردیگا، لیکن ریاکاری کا گناہ نہ چھوٹ سکتا ہے نہ معافی کے قابل ہے،

کشتہ ہبینندم و قاتل نشناسند کہ کیست   کیں خدنگ از نظر خلق نہاں می آید

خواستم تا نظرے افگنم و بازآیم   گفت از یں کوچہ ما راہ بدر می نرود

جمال در نظر و شوق ہمچناں باقی   گدا اگر ہمہ عالم بہ او دہند گدا است

بعض جگہ معمولی واقعات اور حالات کو اس پیرایہ میں دکھاتے ہیں کہ نہایت عجیب ہو جاتا ہے مثلاً معشوق کی بیوفائی کو جو ایک عام بات ہے، اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں

فریاد دوستان ہمہ از دستِ دشمن است   فریادِ سعدی از دلِ نامہربانِ دوست

یعنی اور لوگ تو دشمن کے ہاتھ سے نالاں ہوتے ہیں سعدی کی بدقسمتی دیکھو کہ اسکو دوست اور معشوق کے ہاتھ سے فریاد کرنی پڑتی ہے، یا مثلاً یہ شعر،

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند   سعدی از دستِ خویشتن فریاد

ہر شخص اپنے کئے کو بھگتتا ہے اور یہ ایک معمولی بات ہے، شیخ نے اسی بات کو طرز ادا سے ایک اعجوبہ بنا دیا یعنی اور لوگ تو غیروں سے فریاد کرتے ہیں، سعدی خود اپنے آپ سے فریاد کرتا ہے، یا مثلاً یہ شعر

مبارزانِ جہاں، قلبِ دشمناں شکنند   تراچہ شد کہ ہمہ قلبِ دوستاں شکنی

بعض جگہ ایک دعویٰ کرتے ہیں، جو نہایت مستبعد ہوتا ہے پھر اس کو شاعرانہ توجیہ سے معمولی واقعہ ثابت کر دیتے ہیں، مثلاً

یادت نمی کنم ہمہ عمر زاں کہ یاد   آں کس کند کہ دلبرش از یاد می رود

پہلے مصرع میں دعویٰ کیا کہ میں کبھی معشوق کو یاد نہیں کرتا، یہ امر عاشقی کے مذہب سے نہایت مستبعد تھا، اس کو اس طرح ثابت کیا کہ یاد وہ کرے جو کبھی بھولتا بھی ہو، میں کبھی بھولتا ہی نہیں تو یاد کیا کروں، بعض جگہ ایک ممکن اور معمولی واقعہ کو شاعرانہ تخیل سے ناممکن

یا مستبعد بنا دیتے ہیں، مثلاً

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من　　وین عجب کان دم که میگریم کسی بیدار نیست

من از دست تو در عالم نهم روی　　و لیکن چون تو در عالم نباشد

به لطف دلبر من در جهان نبینی کس　　که دوستی کند و دشمنی بیفزاید

گفته بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم　　چه بگویم که غم از دل برود چون تو بیائی

اسی طرح جدتِ ادا کے سینکڑوں اسلوب پیدا کئے، جن کی الگ الگ تشریح نہیں ہو سکتی، اشعار ذیل سے ایک عام اندازہ ہوگا،

دنبال تو بودن گنه از جانب ما نیست　　با غمزہ بگو تا دل مردم نه رباید

ز من مپرس که از دست او دلم چون است　　از و بپرس که انگشتهاش پر خون است

توبه کنند از گناه خلق به شعبان　　در رمضان نیز چشم های تو مست است

امیر خسرو کی ایک غزل ہے،

ای مسلمانان کس روزه بدینسان دارد

یہ خیال یہیں سے لیا ہے،

من آن نیم که حلال از حرام نشناسم　　شراب با تو حلال است آب بے تو حرام

به خشم رفتهٔ ما را که می برد پیغام　　بیا که ما سپر انداختیم اگر جنگ است

دی زمانے بر سعدی بے تکلف بنشست　　فتنه بنشست و چو برخاست قیامت برخاست

ما نامه به او سپرده بودیم　　او نافه مشک از فرآورد،

ای تماشاگاه عالم روے تو　　تو کجا بهر تماشا می روی

اے مسلمانان به فریادم رسید　　کان فلانے بے وفائی می کند

یار من اوباش و قلاش است ورنہ ـــ ییک بر من پارسائی می کند

قاضی شہر عاشقاں باید ـــ کہ بیک شاہد اختصار کند

شاہد معشوق کو کہتے ہیں اور گواہ کو بھی، مقدمات کے ثبوت میں عموماً دو گواہ ضرور ہیں، شاعر کہتا ہے کہ گو عام قاعدہ یہی ہے کہ مقدمہ کے ثبوت میں دو گواہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عاشقوں کے ملک میں قاضی کو ایک ہی شاہد (معشوق) پر اکتفا کرنا چاہئے شاہد کے ذو معنیں ہونے نے جو لطف پیدا کیا ہے وہ مخفی نہیں،

برخیز کہ چشم ہائے مستت ـــ خفتہ است و ہزار فتنہ بیدار

اے محتسب از جواں چہ پرسی ـــ من توبہ نے کنم کہ پیرم

حضرت امیر خسرو[1] دہلوی

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے، امیر خسرو اسی قبیلے سے ہیں، ان کے والد کا نام سیف الدین محمود ہے، ترکستان میں ایک شہر کش ہے، وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے، فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ بلخ کے امرا میں سے تھے، چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کرکے ہندوستان میں آئے، اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر مامور ہوئے، محمد تغلق ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا، ایک مہم میں کفار سے لڑکر شہید ہوئے،

لیکن صاحبِ بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کرکے لکھتے ہیں :-

"پس انچہ دولت شاہ در تذکرہ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسرو در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق وے قصائد غرا است خلاف صریح و محض غلط است' غالباً شاہزادہ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود بہ علت اشتراک اسمی سلطان محمد تغلق خیال کردہ"

[1] امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے، تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں لیکن خود امیر موصوف نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب سے زیادہ قابل اعتبار ہیں، اور جہاں تک اسمیں مذکور ہیں، میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے، امیر کی دیگر تصنیفات سے بھی اون کے واقعات معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ موقع بموقع ان کے حوالے دئے جائیں گے ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اسمیں امیر خسرو کی تصنیفات سے انکے حالات مرتب کئے ہیں کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے، اعزالدین علی شاہ، حسام الدین اور امیر خسرو،

سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر خسرو کی عمر ۷ برس کی تھی، امیر خسرو کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے، اور دس ہزار فوج کے افسر تھے، امیر خسرو ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے[1]، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لے گئے، مجذوب نے دور ہی سے دیکھکر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے جائیگا، مجذوب صاحب کے کمالات معنوی کا ہم انکار نہیں کرتے لیکن اون کے شاعرانہ مذاق کا تسلیم کرنا مشکل ہے، خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت،

جب اُنھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے ان کو مکتب میں بٹھایا، اور خوشنویسی کی مشق کے لئے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا، لیکن امیر کو پڑھنے لکھنے کے بجائے شعر گوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزوں ناموزوں کہہ سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کیا کرتے تھے، خواجہ اصیل کوتوال کے نائب تھے وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کے لئے بلا لیا کرتے تھے، ایک دن بلایا تو امیر خسرو بھی ساتھ گئے، خواجہ اصیل کے مکان پر خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے، سعد الدین نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ غوں غاں کرتا ہے معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا نہیں؟ آپ ذرا

---

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں، خسرو دلی میں پیدا ہوئے، لیکن پہلی روایت بنا بر صحیح ہے تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان زا ہیں، لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔ [2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، ایٹہ ہے، کسی زمانہ میں دریائے گنگ اس کے نیچے بہتا تھا، لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے، یہاں اب اسٹیشن بھی ہے،

اس کے کلام کو سن لیجئے، خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض تھی، امیر خسرو کو دی کہ کوئی شعر پڑھو امیر نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی لوگوں پر اثر ہوا سب کی آنکھیں بھر آئیں، اور سب نے بے اختیار تحسین کی، ان کے استاد نے کہا شعر گوئی کا امتحان لیجئے، خواجہ عزیزالدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ ان کو ملا کر شعر کہو، مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر نے برجستہ کہا،

ہر موے کہ در دو زلف[1] آں صنم (بت) است	صد بیضۂ عنبریں بر آں موے صنم است
چوں تیر بداں راس دلش را زیراکہ	چوں خربزہ دندانش زدوں شکم است

خواجہ عزیزالدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا کیا نام ہے؟ انھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا، اُنھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی چین نہیں،، پھر کہا "ترک خطا است"، یعنی ان کو ترک کہنا خطا ہے" اُنھوں نے اسی لفظ کو الٹ کر کہا "بے خطا ترک است" یعنی قطعاً وہ ترک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تم کو دربار سلطانی سے تعلق ہے، اس لئے تم کو سلطانی تخلص رکھنا چاہئے، چنانچہ تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں[2] میں یہی تخلص ہے،

امیر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی، لیکن تذکرہ نویسوں نے اس کے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی، تاہم یہ قطعی ہے کہ ۱۵-۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے،

درباری تعلقات امیر خسرو جب سن رشد کو پہونچے تو دلی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا، اس کے امرائے دربار میں سے

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا، میں نے اسی طرح نقل کر دیا [2] یہ تمام حالات اپنے امیر خسرو نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں

کشلو خاں معروف بہ چھجو[1] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا، وہ سلطان کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے پر مامور تھا، فرشتہ میں لکھا ہے "کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا، اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اس کے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے، بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا، یہاں تک کہ خود اس کے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ نہ رہا"،

امیر خسرو کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے، سب سے پہلے اس کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اس کے دربار میں ملازم رہے، چنانچہ اکثر قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں،

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح	ہمدمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجا است	آسماں روے ملک چھجو نمود

[1] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب اور خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کشلو خاں عرف چھجو کے دربار میں پہنچا، اس سے اس قدر ثابت ہوا کہ کشلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۱۵۱ جلد اول) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانکپور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور سلطان معز الدین کیقباد نے اسکی بیٹی سے شادی کی تھی،

فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد بن عز الدین، سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا سلطان نے اسکو باربک مقرر کر کے خان اعظم کو کشلی خاں خطاب دیا، بدایونی (صفحہ ۱۶۴) میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھ کر لکھا ہے کہ اسکو کشلو خاں خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین، کشلو خاں، چھجو ایک ہی شخص ہیں،

امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

معز الدنیا بود شہ کیقباد ز شاہاں کسے کاو کرم کرد یاد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کشلو خاں امرا میں سے تھا، بادشاہ نہ تھا، بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر کی قدردانی کی وہ معز الدین کیقباد تھا، امیر خسرو اکثر کشلو خاں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لیجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے، ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) بھی موجود تھا، اور شعروشاعری کے چرچے ہورہے تھے، شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے، امیر خسرو نے اپنی زمزمہ سنجی سے یہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا، اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپیے دیئے، کشلو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اس کا وابستہ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے، چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوئے، امیر خسرو نے اس کے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اس کی تلافی کرنی چاہی، لیکن کشلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی،

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا، امیر خسرو نے ملک چھجو سے مایوس ہوکر سامانہ کا قصد کیا، بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم[1] خاص بنایا، اسی زمانہ میں یعنی ۶۷۸ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی، اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی تیاریاں کیں اور بغرا خاں کو ساتھ لیا، امیر خسرو بھی اس سفر میں ساتھ گئے، سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کرکے دلی واپس

[1] یہ تمام حالات خود امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں [2] تاریخ فرشتہ [3] امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے، لیکن اس قدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور (بقیہ حاشیہ ص ۱۰۱) پر

آیا اور بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی، امیر خسرو کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا، دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ان کے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ رخصت لے کر دلی میں آئے اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل، صاحب علم، فیاض اور قدردان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گذر جاتا تھا لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے، ایک بیاض تیار کی تھی، جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کئے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے،

یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر خسرو کے ہاتھ آئی ارباب ذوق اس کی نقلیں لیتے تھے، اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا، سلطان محمد نے ان کو بلا کر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہو کر گیا تو ان کو اور ان کے ساتھ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اس کے دربار میں رہے، اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغون خاں ایران کا حکمراں تھا، اس کے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لے کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ) تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے، ایک وقت سخت تر یہ ہے کہ غرۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے، [1] تاریخ فرشتہ،

لاہور اور دیپال پور کو فتح اور غارت کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا، سلطان محمد قاآن نے ملتان سے نکل کر تیمور خاں کو شکست دی، لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی ایک تالاب کے کنارے پانچسو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، یہ موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا، سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہوکر تاتاریوں کا مقابلہ کیا اور گو بار بار ان کو شکستیں دیں، لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا اور زخم کھاکر مرگیا،[1] امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے، چنانچہ تاتاری ان کو گرفتار کرکے بلخ لے گئے، یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا،[1] امیر خسرو نے نہایت پراثر مرثیے لکھے، اور دلی بھیجے، مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے، چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

واقعہ است ایں یا بلا از آسمان آمدپدید　　آفت است ایں یا قیامت درجہان آمدپدید

راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ را　　رخنۂ کامسال در ہندوستان آمدپدید

مجلس یاران پریشان شد چو برگ گل زباد　　برگ ریزی گوئی اندر بوستان آمدپدید

بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چارسو　　پنج آبے دیگر اندر مولتان آمدپدید

جمع شد سیارہ در چشم مگر طوفاں شود　　چوں بہ برج آبی انجم را قرآں آمدپدید

من نخواہم جز ہماں جمعیت وایں کے شود

خود محال ست ایں بنات النعش پرویں کے شود

تاچہ ساعت بد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید　　تیغ کافر کش برائے کشتن کافر کشید

آنچہ حاضر بود لشکر، لشکر دیگر نہ جست　　زاں کہ رستم را نشاید منت لشکر کشید

---

[1] تاریخ فرشتہ ص۷۳ بدایونی ص۱۳۱،

چوں خبر کردندش از دشمن بداں قوت کہ داشت | بے محابا خشم در سر کرد و رایت بر کشید
یک کشش از مولتانش تا بہ لاہور اوفتاد | یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خونِ شاں | کز زمین باید شفق را گونۂ احمر کشید
او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک | صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

تا چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
جوق جوق از آب بگزشتند ناگہ در رسید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہاں شہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پُر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہات سے رہائی پائی، اور دلی میں آئے خان شہید کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا تھا غیاث الدین بلبن کے دربار میں جا کر پڑھا دربار میں کہرام پڑ گیا، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا،

امیر دلی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلافِ وصیت، اس کے پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا، تخت نشین کیا،

کیقباد نے امیر خسرو کو دربار میں طلب کیا، لیکن چونکہ عنان سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی، اور وہ امیر سے صاف نہ تھا، امیر نے تعلق پسند نہ کیا، اور خان جہاں جو امرائے شاہی میں تھا، اس کی ملازمت اختیار کی،

خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا، اور امیر کو ساتھ لے گیا، چنانچہ خود قران السعدین

میں فرماتے ہیں،

خان جہاں حاتم مفلس نواز | گشت بہ اقطاع اودھ سرفراز
من کہ بُدم چاکر او پیش ازاں | کردکرم آنچہ کہ بد بیش ازاں
تا زچناں بخشش خاطر فریب | بندہ شدہ لازمۂ آں رکیب
مدا دوم بروز لطف چناں | کیست کہ از لطف بتابد عناں
در اودھ از بخشش او تا دو سال | ہیچ غم و نالہ نبود از منال

دو برس تک اودھ میں رہے، ان کی والدہ کو اُن سے حد سے زیادہ محبت تھی، وہ دلی میں تھیں، اور ان کے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی، امیر کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے سے لگا لیا اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے،

مادرم آں خستۂ تیمار من | چوں نظر افگند بہ دیدار من
پردہ ز روے شفقت برگرفت | اشک فشاناں بہ برم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی، اس کا باپ بغرا خاں، بنگال میں تھا، یہ حالت سُن کر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا، چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کر کے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے، آخر صلح پر خاتمہ ہوا، اور کیقباد دلی کو واپس آگیا،

امیر خسرو نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

زہے ملک خوش چوں دو سلطاں یکے شد | زہے عہد خوش چوں دو پیماں یکے شد
پسر بادشاہ ہے، پدر نیز سلطاں | کنوں ملک بیں چوں دو سلطاں یکے شد

ز ہر جہانداری و بادشاہی	جہاں آدو شاہ جہانبان یکے شد
یکے ناصر عہد محمود سلطاں	کہ فرمانش در چار ارکان یکے شد
دگر شہ معز جہاں کیقبادے	کہ در ضبطش ایران و توران یکے شد

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات نظم کے پیرایہ میں آئیں، امیر خسرو کو بلا کر یہ خواہش ظاہر[1] کی، چنانچہ امیر نے چھ مہینے کی مدت میں قرآن السعدین لکھی، جس میں باپ بیٹے کے مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس وقت امیر کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از روش خامہ	از پسِ شش ماہ چنیں نامہ
در رمضان شد بہ سعادت تمام	یافت قرآں نامہ سعدین نام
انچہ بہ تاریخ ز ہجرت گذشت	بود سن ششصد وہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بر رسی	راست بگویم ہمہ شش بود وسی ۳۶

کیقباد عیاشی میں بیمار ہو کر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مرگیا یا مارا گیا، اس کے بعد اس کا خرد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا، تین مہینے کے بعد امراے دربار نے تخت سے اتار کر قید کر دیا، اب اس خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا، اس لئے ترکی امراے دربار میں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تختِ سلطنت پر بیٹھا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا، وہ بڑے عظمت اور اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا، اس کے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع، خوش صحبت تھا، شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ

---

[1] بدایونی،

بدایونی نے اس کے دو شعر بھی نقل کئے ہیں،

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمے خواہم | واں روی چو گلنارت تفیدہ نمے خواہم
بے پیرمنت خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں بانگ بلندست ایں پوشیدہ نمے خواہم

احباب و شریک صحبت بھی جس قدر تھے، سب قابل، اہل فن، موزون طبع اور رنگیں مزاج تھے، مثلاً ملک تاج الدین کرچی، ملک فخر الدین، ملک اعز الدین، ملک قرابیگ ملک نصرت، ملک حبیب، ملک کمال الدین، ابو المعانی، ملک نصیر الدین کرانی، ملک سعد الدین انیس اور ہم صحبت تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لئے انتخاب کئے تھے، چنانچہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی اور مطرب بھی وہ لوگ تھے جو زمانہ میں انتخاب تھے، مثلاً امیر خاصہ حمید، راجہ، نظام، محمد شاہ، نصیر خاں، بہروزؔ،

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لئے امیر خسرو سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا، وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی اور شاعر تو تھے ہی، معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان جلال الدین عارض تھا، اسی وقت اس نے امیر خسرو کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کرکے خاص اپنا باس عنایت کیا تھا، تخت پر بیٹھا تو امیر کو ندیم خاص بنایا، اور مصحف[۱] داری اور امارت کا عہدہ دیا، اس کے ساتھ جامہ اور کمر بند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا، ان کے لئے مقرر کیا، امیر خسرو جو "امیرؔ" کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے،

---

[۱] فرشتہ ص ۵۲ جس کو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی، اسکو مصحف دار کہتے تھے،

امیر نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کئے اور تاج الفتوح نام رکھا، اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئے گی، جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے سنہ ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرادیا، اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اس کی طینت کا جوہر تھا، تاہم بہت بڑے عزم و استقلال اور شوکت و شان کا فرماں روا گذرا ہے، تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑ کر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں ہیں، اس کا دربار فقراء علماء فضلاء و شعراء سے ہر وقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں[1]

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرمانی، مولانا نصیر الدین غنی، مولانا تاج الدین مقدم، قاضی ضیاء الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا شہر کتی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر شریف، مولانا میران بابک کلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین، مولانا علاء الدین لاہوری، قاضی شمس الدین کازرونی، مولانا شمس الدین تحشی، مولانا شمس الدین، مولانا صدر الدین یاد، مولانا معین الدین لولی، مولانا افتخار الدین رازی، مولانا معیز الدین اندپتی، مولانا نجم الدین مولانا حمید الدین ملوری، مولانا علاء الدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی مولنا کمال الدین کوہی، مولانا وجیہ الدین کابلی، مولنا منہاج الدین، مولانا نظام الدین کلاتی، مولانا نصیر الدین کری، مولانا نصیر الدین لوبی، مولانا علاء الدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری، مولانا محب ملتانی، مولانا حمید الدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخار الدین مولانا حمید الدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرمہ، مولانا شہاب الدین

---

[1] یہ فہرست بدایونی سے ماخوذ ہیں،

ملتانی، مولانا فخرالدین نسوی، مولانا فخرالدین شقاقلی، مولانا علیم الدین،

قراء، مولانا فسناطلی، مولانا علاءالدین سفری، خواجہ زکی،

واعظین، مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم،

شعراء، خواجہ حسن دہلوی، صدرالدین عالی، فخرالدین قواس، حمیدالدین راجہ،

مولانا عارف عبدالحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں

کو بے نور کر دیا تھا،

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے، ان کے

بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ وہ بھی امیر ہی کا فیض ہے،

علاءالدین نے امیر خسرو کا ایک ہزار سالانہ تنکہ مقرر کیا تھا[ع]، امیر نے سلطان علاءالدین کی

تمام فتوحات کو نہایت تفصیل سے لکھا، جس کا نام خزائن الفتوح ہے، تفصیل اس کی

آگے آئے گی،

۶۹۸ھ میں امیر کی والدہ اور ان کے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ

لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے،

نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاءالدین کے

نام سے معنون ہے، سب سے آخری مثنوی ہشت بہشت ہے، جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی،

اسی زمانہ میں امیر نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ

تفصیل آگے آئے گی، سلطان علاءالدین نے ۲۰ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں

وفات کی، اس کے بعد اس کا بیٹا شہاب الدین (حکومت ۳ ماہ) اور اس کے بعد ۷۱۶ھ

میں قطب الدین مبارک بن علاءالدین خلجی بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز،

[ع] تاریخ فرشتہ، غالباً طلائی سکہ ہوگا،

اور سبک سر تھا، لیکن امیر کی قدردانی سب سے بڑھ کر کی، چنانچہ امیر نے جب ۷۱۸ھ میں اس کے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپئے دئے، چنانچہ خود امیر قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

به تاریخ همچون من اسکندرے　　کند هر که آرایشِ دفترے
زِ گنجِ گران مایهٔ بے شمار　　دهم بار بیتش نہ آں پیلبار
مرا خود دریں ره پدر شہ دلیل　　که میداد زر، هم ترازوے پیل
شناسد کسے کش خرد رهنموں　　که از پیلبار است وزنش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم　　نه زیبا است زیں سهل تر دادنم
شها! گنج بخشا! کرم گسترا　　معانی شناسا، سخن داورا
چنیں بخششے کز تو جم یافتم　　در ایامِ پیشینه کم یافتم
کنوں لا مد از سحر سنج چو من　　به اندازهٔ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دے کر قلمدانِ وزارت عطا کیا تھا، اس نے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کر کے، خود تختِ حکومت پر جلوس کیا، چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کئے، امرا نے بغاوت کی، چنانچہ ۴ مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۲ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا،

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اور امرا نے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اس کی ہندنی تھی، دربار میں پکار کر کہا کہ مجھ کو تختِ سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے، لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا، اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا،

اس نے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا، وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا، اس نے نہایت عدل و احسان سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں،

تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے، امیر خسرو کی اس نے نہایت قدردانی کی اور ان کو دولت اور مال سے نہال کر دیا، امیر نے بھی اس کے احسانات کا حق ادا کیا، چنانچہ اس کے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت کی مفصل تاریخ ہے،

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر خسرو ساتھ گئے، تغلق واپس آیا، لیکن امیر خسرو وہیں رہ گئے، اسی اثنار میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیار نے انتقال کیا، امیر یلغار کرتے ہوئے دلّی میں آئے، اور جو کچھ زر و مال پاس تھا، خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا، خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا، لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنا چاہی، لیکن ایک خواجہ سرانے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ صاحب کے پائنتی دفن کیا، اور اس سے بڑھ کر ان کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی[۱]، ان کا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امرار میں سے تھا، تعمیر کرایا، اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ کہہ کر لوح پر کندہ کرائی،

شد "عدیم المثل" یک تاریخ او   واں دگر شد "طوطی شکر مقال"

خاندان اور آل و اولاد — امیر کو خدا نے فرزندانِ معنوی کے علاوہ اولادِ ظاہری بھی عنایت کی تھی[۲]، ان کے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے، اور سلطان فیروز شاہ

وفات

---

[۱] خزانہ عامرہ [۲] فرشتہ حالات خسرو،

کے دربار میں ندیم تھے، ان کی شاعری نے چنداں فروغ حاصل نہیں کیا، لیکن شعر و شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے، اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے، چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اسکو تسلیم کرتے ہیں، ظہیر کا شعر ہے،

کلاہِ گوشۂ حکم تو از طریقِ نفاذ — ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا، جس سے مصرع کی ترکیب چست ہو گئی، بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے،

این سہل بود کہ گوگرد سرخ خواست — گر نانِ خواجہ خواستی آں را چہ کردے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی،

این سہل بود کہ آب حیات خواست — گر نانِ خواجہ خواستی آں را چہ کردے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کر دیا،

ایک اور شعر تھا،

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرنج — نرخ گہر بہ طعن خریدار نشکند

ملک موصوف نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا،

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر خسرو کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے، بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ "ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے، اس لئے بادشاہ اور درباری اس کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے، اور غنیمت جانتے تھے"

امیر خسرو کی ایک صاحبزادی تھیں، لیکن سخت افسوس ہے کہ اُس زمانہ میں عورتیں

کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر نے لیلی مجنوں لکھی، اس میں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں،

اے زعفت فگندہ بر قع نور | ہم عفیفہ بنام و ہم مستور
کاش ماہ تو ہم بہ چہ بودے | در رحم طفل ہشت مہ بودے
لیک چوں دادہ خدای رواست | با خداوادگاں ستیزہ خطاست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد | کانچہ او داد بازنتواں داد
پدرم ہم ز مادر است آخر | مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم نہ پیدا ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں، پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیئے کو کون ٹال سکتا ہے، اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی،

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی، امیر خسرو اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے، لیکن بیٹی سے کہتے ہیں کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر اودھر نہ جھانکنا،

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است | کالت پردہ پوشی بدن است
یا بہ دامان عافیت سرکن | رو بہ دیوار و پشت بر در کن
در تماشائے روزنت ہوس است | روزنت چشم سوزن تو بس است

امیر کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی پہنچ کر وہ اس جوش محبت سے ملتے تھے، جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں، اور وہ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلی میں تھیں، اور ان کو یاد کیا کرتی تھیں، اودھ سے جب

دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے،

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں، اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے، چنانچہ دو نہریں دودھ کی اُس میں جاری ہیں، ۶۹۸ھ میں اُنھوں نے انتقال کیا، اسی سال ان کے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا، لیلی مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے،

امسال دو نور زاخترم رفت	ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من	گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم	چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غم دو افتاد	فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چوں منے را	یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار بر نگیرد	یک سر دو خمار بر نگیرد
چوں مادر من بزیر خاک است	گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر	روی از چہ نمی نمائی آخر
خنداں ز دل زمین بروں آئی	بر گریۂ زار من بہ بخشائے،
ہر جا کہ ز پای تو غباری است	ما را ز بہشت یادگاری است
ذاتِ تو کہ حفظ جانِ من بود	پشتِ من و پشتبانِ من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود	پند تو صلاحِ کارِ من بود

امروز منم بہ مہر پیوند　　خاموشی تو ہمی دہد پند

اڑتالیس برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں، جس طرح کمسن بچہ ماں کے لئے بلکتا ہے، اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خونِ جگر سے رنگین ہیں،

امیر خسرو اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے، جو عام دنیاداروں کا طریقہ ہے، لیکن یہ امر ان کی اصل فطرت کے خلاف تھا، دربارداری، خوشامد اور شخص پرستی سے ان کو طبعی نفرت تھی، اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار ان کی زبان سے نکل جاتے تھے، لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی، جب ان کو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں،

شب تا سحر و ز صبح تا شام　　در گوشہ غم نگیرم آرام

با شم ز برائے نفس خود رائے　　پیش چو خودے، ستادہ بر پائے

اس پر مزید یہ ہوا کہ ان کے والد نے ان کو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر ڈال دیا تھا، اور برکت کے لئے بیعت کرا دی تھی، خواجہ صاحب کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی، امیر خسرو کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا، وہ سرتاپا عشق تھے، اور یہ بجلی ان کی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی، آخر یہ نوبت پہنچی کہ ۷۱۳ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے، خواجہ صاحب کے ہاتھ پر دوبارہ بیعت کی، خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی اور مریدانِ خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعراء میں لکھا ہے، کہ امیر نے جب خواجہ صاحب سے بیعت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا کر دربار بدامن ہو کے بیٹھ گئے،

خواجہ صاحب سے امیر کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجہ تک پہنچ گئی تھی ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا ان کا جمال دیکھ کر جیتے تھے، خواجہ صاحب کو بھی ان کے ساتھ یہ تعلق تھا، کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کر دوں گا، دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے،

الٰہی بہ سوز سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش،

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر، ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے، امیر خسرو بھی حاضر تھے، خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو،

ع ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی، امیر نے اس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا، ع

ما قبلہ راست کردیم برطرف کجکلاہے

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اس کا شان نزول پوچھا، ملا علی احمد مہر کن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی، یہاں تک کہ غش کھا کر گرے، دیکھا تو دم نہ تھا،

خواجہ صاحب نے امیر خسرو کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا اور اسی لقب سے پکارتے تھے، امیر نے جابجا اس پر فخر کیا ہے، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

بر زبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت	دست ترک اللہ گیر و ہم بہ اللّٰہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا یہ بھی فرمایا

تزک جہانگیری ص مطبوعۂ علی گڈہ

کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں ان کو بھی دفن کراتا،

امیر نے تصوف میں جو مدارج حاصل کیے، ان کو ہم نہ جان سکتے اور نہ بیان کر سکتے ہیں، یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے، وہ اسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں، حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے، امیر کا عین شباب تھا کہ ایک دن اتفاق سے ان کی دوکان کے سامنے سے گذرے، آفتاب حسن کی شعاعیں اُن پر بھی پڑیں، وہیں ٹھہر گئے، اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو، حسن نے کہا کہ ایک پلڑے میں روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے پلڑے میں سونا رکھے، سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کر دیتا ہوں، امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد اور نیاز لیتا ہوں، اس اندازِ گفتگو نے امیر کو اور بھی بے اختیار کر دیا، فوراً نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا، حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی، لیکن خود بھی شکار ہو گئے، اسی وقت دوکان بند کر کے خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے والدادہ (امیر خسرو) سے ملے، اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے،[۱]

---

[۱] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے، لیکن صاحب بہارستان سخن نے اس کی معقول بنا پر تکذیب کی ہے، اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "بہ قیاس چناں در می آید کہ حسن را بہ نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد، چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن، قصائد غرا است و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے میتواں یافت"

امیر سے اس قدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لئے بھی جدا نہیں ہوتے تھے، امیر نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوئے، چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو خسرو کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے، دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی، امیر نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

زبس دلِ خود کام، کارمن بہ سوائی کشید	خسروا فرمانِ دل بردن ہمیں بار آورد

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر کے ملنے سے منع کر دیا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا، خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہاتھ پر کوڑے لگوائے، حسن سیدھے خسرو کے پاس گئے، خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا، نہایت متحیر ہوا، اور امیر کو بلوا بھیجا، آئے تو کہا کیا حالت ہی؟ امیر نے آستین سے ہات نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں خسرو کے ہاتھ پر بھی کوڑے کے نشان تھے[1]

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنف غزل پر ان کا خاص احسان ہی اس لئے ان کے شیدائی، امیر خسرو ہی کے تذکرہ میں ان کے اشعار نقل کرتے ہیں،

خلق گوید، دل از صبر بجا آور بائے	ایدل از صبر نشانے وہ اگر جائے ہست
ایکہ نظارہٴ دیوانہ نہ کردی ہرگز	قدمے رنجہ کن ایں سو کہ رسوائے ہست

---

[1] یہ تمام واقعات فرشتہ نے امیر خسرو کے تذکرہ میں لکھے ہیں، لیکن اخیر کا واقعہ آج کل کون تسلیم کریگا،

بر چون تو، کسے دگر گزیدن — کارے دگرست، کار من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من — ایں از فلک ست از حسن نیست

باز ایں دلم بہ سوی دلارام می رود — از دام جستہ، بار سوے دام می رود
ایام در بیامدہ با ما بہ دوستی — واں شوخ ہم بہ سیرت ایام می رود

اے خواجہ! در محلۂ تقوی اقیام گیر — در کوی عاشقی نتواں نیکنام شد
عقلم کہ زیں بر ابلق ایام می نہاد — آخر بتازیانۂ عشق تو رام شد

طرفہ سرد کارے است کہ با وعدۂ معشوق — صابر نتواں بود و تقاضا نتواں کرد
از حسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست — ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم می دانی
دو سہ بار، با تو گفتم کہ مرا بہ بیچ بستاں — نہ شد اتفاق، شاید کہ بہ ایں بہا گرانم

تلخ کردم جہانیاں را خواب — زاں دعاہا کہ مستجاب نبود
اے حسن یار گر خطاے کرد — ہم شکایت ازو، صواب نبود

بہ تقوی نام نیکو بردہ بودم — نکورویاں، مرا بدنام کردند
گفتی کہ چرا حال دل خویش نہ گوئی — من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز، اور جذبہ و اثر، ان کے کلام میں موجود ہے، ان کے کشتۂ محبت (امیر خسرو) میں بھی نہیں،

جامعیت اور کمالات — ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہو نگے، صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ

عرفی، نظیری بے شبہہ اقلیم سخن کے جم وکے ہیں، لیکن ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتے، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہای سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے، صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے، لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں، اکثر تذکروں میں خود امیر خسرو کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور چار لاکھ سے کم ہے، لیکن اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے، امیر نے ابیات کا لفظ لکھا ہے، اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں، چنانچہ نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جا بجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اس قدر بیتیں ہیں،

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے، اسی قدر برج بھاکا میں ہے، کس قدر افسوس ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام و نشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے، عربی میں ادبای عرب کے ہمسر ہیں،

سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اس کا ذکر کیا ہے، ع من قدرے بر سرایں کار شدم،

انواع شاعری

اشعار کی تعداد

سنسکرت دانی

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے، اس وقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول اور قاعدے نہیں مرتب کئے تھے، اُنھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی تین جلدوں میں لکھی اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور، صنائع و بدائع پر بیکار گیا، لیکن انکی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کرسکتا ہے،

موسیقی | موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب، ان کے بعد آج تک پھر کوئی شخص حاصل نہ کرسکا، چنانچہ اسکی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے،

فقر و تصوف | ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیاے فانی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، چنانچہ اس کا ذکر بھی الگ عنوان میں آئیگا۔

عدیم الفرصتی | ان سب باتوں کے ساتھ جب اس پر نظر کی جاتی ہے کہ اون کو، ان کاموں میں مشغول ہونے کے لئے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے، وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور درباروں میں تمام تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی، کام جو سپرد تھا وہ شاعری نہ تھی بلکہ اور اور اشغال تھے، لیلیٰ مجنون کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

مسکین من مستمند مدہوش | از سوختگی چو دیگ پر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نہ گیرم آرام
باشم ز برای نفس خود رای | پیش چو خودی ستادہ بر پای

یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے، صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں

تا خون نہ رود ز پاے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صانع قدرت ان کے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں

ناموزوں نہ ہو گا

موسیقی امیر کی ہمہ گیر طبیعت نے اُس نازک اور لطیف فن پر بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، ان کے زمانہ کا مشہور جگت استاد جو تمام ہندوستان کا استاد تھا، نایک گوپال تھا۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لے کر چلتے تھے، سلطان علاء الدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا، امیر خسرو نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں، نایک گوپال سے گانے کی فرمایش کیجائے، نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے، گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمایش کی، امیر نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا کچھ یوں ہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں، پھر خود اس کو ادا کیا، گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں، غرض گوپال جو راگ، راگنی اور سر ادا کرتا تھا امیر اس کو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے، اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گایا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا[1]

---

[1] عالمگیری امرا میں فقیر اللہ جس کا لقب سیف خاں تھا ایک مشہور امیر تھا، ناصر علی سرہندی کی شان میں کہتا ہے

گر بنا شد سیف خاں از الفتش در کار نیست
گفتگو ے طوطی از آئینہ می خیزد علی

وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک کتوہل تھی، فقیر اللہ نے اس کا فارسی ترجمہ کیا، اور اپنے سے فوائد اضافہ کیے اور اُس کا نام راگ درپن رکھا، چنانچہ مآثر الامرا جلد دوم ۲۶۰ مطبوعہ کلکتہ

امیر خسرو چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے، اس لئے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دیکر ایک نیا عالم پیدا کر دیا چنانچہ انکے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[۵]،

نام راگہائے مخترع امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہیں
مجیر	غارا اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
سازگری	پوربی، گورا، کنگلی، اور ایک فارسی راگ قرآن السعدین میں اس کا ذکر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں زمزمۂ سازگری در عراق کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق
ایمن	ہنڈول اور نیریز
عشاق	سارنگ اور بسنت اور نوا
موافق	توڑی و مالڑی و دوگاہ و حسینی
غنم	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے،
زیلف	کھٹ راگ میں شہ ناز کو ملایا ہے،
فرغنہ	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے،
سرپردہ	سارنگ، بلاول اور راست کو ترکیب دیا ہے،
باخزر	دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) میں یہ تفصیل مذکور ہے، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے، ایک ندوہ کے کتب خانہ میں ہے گویا کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات ہم نے اسی کتاب سے لئے ہیں،

[۵] ہم کو افسوس ہے کہ دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں، اس لئے راگوں کے نام ابھی صحیح نہیں پڑھے گئے، اس لئے کہیں کہیں ہم نے صرف صورت نویسی کر دی ہے،

فردوست (یا) پھردوست	کانہڑا، گوری، پوربی، اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے،

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کرکے دوسرا نام رکھدیا ہے، قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ، یہ سب بھی امیرخسرو کی ایجاد ہیں، ان میں سے بعض خاص اُن کی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے، امیر نے ان میں کچھ تصرف کرکے نام بدل دیا،

تصانیف: جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیرخسرو نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں یہ بھی مشہور ہے کہ امیر نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں، اوحدی نے عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اس سے زیادہ ہندی میں ہے

امیر کی کثرتِ تصنیف سے کس کو انکار ہوسکتا ہے، لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر ان کی ہر قسم کی تصانیف کی ۴، ۵ لاکھ سطریں ہوں، تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھ کر بیت کی جگہ شعر لکھدیا، ہندی کلام مدون نہیں ہوا، اس لئے مبالغہ کے لئے کافی موقع ہے، بہرحال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

دیوان[1] تحفۃ الصغر	اس کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے، جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،
دیوان وسط الحیات	اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس کا کلام ہے، اس میں جو قصائد ہیں سلطان شہید، کشلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں،
غرۃ الکمال	یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنی ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۵ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانحعمری لکھی ہے، سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد ہیں،
بقیہ نقیہ	دو ہفتہ میں اسکی ترتیب کی اور دیباچہ لکھا، بڑھاپے کا کلام ہے، تاریخ تالیف مذکور نہیں، لیکن سلطان علاؤ الدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے، اس لئے کم از کم

[1] امیر نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ کچھ حالات بھی لکھے ہیں، تحفۃ الصغر، اور غرۃ الکمال کا دیباچہ اس وقت میرے پیش نظر ہے، اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گذرے ہیں، لیکن اسوقت سامنے نہیں، اسلئے انکی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر، آئی، ای، دی) کے اس ریویو سے ماخوذ ہے، جو انھوں نے برٹش میوزیم کے کتبخانہ کی فہرست میں لکھے ہیں اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبدالقادر پروفیسر پونہ کالج کا ممنون ہوں

	سنہ ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے،
نہایۃ الکمال	پانچواں دیوان ہے، اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی سنہ ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی مدحیں ہیں، ایک قصیدہ میں سنہ ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے، اور اسی سنہ میں خسرو نے انتقال کیا ہے،
قران السعدین	سب سے پہلی مثنوی ہے، سنہ ۶۸۸ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی، کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال ہے،
مطلع الانوار	مخزن الاسرار کا جواب ہے، سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی، ۳۳۱۰ شعر ہیں، دو ہفتہ میں تمام ہوئی، سال اختتام سنہ ۶۹۸ھ ہے، تصوف کے مضامین ہیں، اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے،
شیریں خسرو	رجب سنہ ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی، ۴۱۲۴ شعر ہیں،
آئینہ اسکندری	سکندر نامہ کا جواب ہے، سال اختتام سنہ ۶۹۹ھ ہے، اشعار کی تعداد ۴۴۵۰ ہے۔

لیلی مجنوں	۲۶۶۰ شعر ہیں، ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی،
ہشت بہشت	سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے، ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں، پورا خمسہ سلطان علاءالدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں، خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں، یہ پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں،
تاج الفتوح	سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر تک کے حالات ہیں، اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی، مطلع یہ ہے سخن بر نام شاہے کردم آغاز
نہ سپہر	قطب الدین خلجی کے نام پر ہے، نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے، اس مناسبت سے نہ سپہر نام رکھا ہے، اس وقت امیر خسرو کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی ۷۱۸ھ میں تمام ہوئی،
دول رانی	گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خاں

	سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دول رانی پر عاشق ہو گیا تھا، اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، اس کی فرمایش سے امیر خسرو نے اس کو نظم کا پاس پہنایا، اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے، ان کو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا، ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی،
افضل الفوائد	خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ہیں
اعجاز خسروی	نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کئے ہیں، اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی تین جلدوں میں ہے
تغلق نامہ	غیاث الدین تغلق کے حالات وفتوحات ہیں،
خزائن الفتوح	سلطان علاء الدین کی فتوحات ہیں،
مناقب ہند، تاریخ دہلی	ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے،

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان تصنیفات کے علاوہ فن حساب اور فن موسیقی میں بھی ان کی تصنیفیں ہیں"،

شاعری امیر خسرو اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعرار کو بھی ان کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا، طوطی ہند جو اُن کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے ان کو یاد کرتے ہیں،

عرفی — بہ روح خسرو ازیں پارسی شکر دادم | کہ کام طوطی ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ — شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند | زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دلی میں آئے، اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں، اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے، تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا، اور اس قدر تو تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا، اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں، ان کی تربیت کی جائے، اس وقت خسرو کی عمر تیس برس سے زائد نہ تھی،

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک شاعر جو امیر خسرو کا معاصر ہے کہتا ہے[۱]،

غلط افتاد خسرو را زخامی | کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

امیر کی شاعری قدرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے، ان کے باپ دادا، شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے

[۱] بدایونی جلد اول ص ۲۲۲ و ۲۲۳،

تھے، تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُن کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے، دیباچۂ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

درآں صغر سن کہ دندان می۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افتاد، سخن می گفتم دگوہر از دہانم میریخت،

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"چوں مرا استادے سرآمدہ برسر نیامدہ بود کہ برسر دقائق دال شدے و آہوئے مشکبار قلم را از سواد خطا باز آوردے"

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے، استاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے، جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے، اسی انداز پر کہنا شروع کرتے، خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا، اس کے الفاظ حل کئے، لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہوسکا، پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے، امیر اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہوگئے،

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے، ہشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے، شہاب کی پہلے نہایت تعریف کی ہے پھر لکھتے ہیں،

من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش	او بہ اصلاح راندہ خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقسم بہ رقم	رنج برخود نہادہ منت ہم
نظرے تیز کردہ موے شگاف	نے بہ عمیا نظارۂ بگذاف
ایں دقائق کہ شد ز مغز ش پوست	ہمہ ہمو شہر بیز کردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے	مسِ من گشتہ کیمیا از وے

ہر چہ او گفت من نہادم گوش | برکشیدم نگس ز شربت نوشش
وانچہ بخود و من نہ جستم پے | عیب آں بر من است نہ بر وے
یا رب او چوں ز پیچ نامۂ من | برد بیروں خطاے خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد | در قیامت خط امانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر نرے مقلد نہ تھے، جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہاں استاد کی راے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے، ع عیب آں بر من است نہ بر وے

کیا عجیب بات ہے وہ استاد جس کے دامنِ تربیت میں خسرو جیسا شخص پل کر بڑا ہو، آج اُس کا نام و نشان تک معلوم نہیں،

معاصر استادوں کے علاوہ خسرو نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے، وہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے، اور اُسی طرح اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے، اسی بنا پر لیلی مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی اوستادم | در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں،

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت | شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ خسرو جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسرویم شد بلند | زلزلہ در گور نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی، اور خسرو کی طرف بڑھی خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، کا نام لیا، دفعۃً ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس نے آستین تلوار کے سامنے کردی، تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی، یہ واقعہ جس قدر عقل کے خلاف ہے اسی قدر تاریخ کے بھی مخالف ہے، خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے، اس وقت ان کی عمر ۴۷ برس کی ہو چکی تھی یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں اُنھوں نے غرۃ الکمال مرتب کی ہے، اُس کے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں نظامی کا پیرو اور شاگرد ہوں،

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی، اُس میں لکھتے ہیں،

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر	وز در او سر بسر آفاق پر
پختہ از و شد چو معانی تمام	خام بود پختنِ سودائے خام
بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست	دیں رہ باریک بپای تو نیست
کالبدی داری و جاں اندرو ست	ہرچہ توودانی بہ ازاں اندر وست
تا بود ایں سکہ بہ عالم درست	بر تن تو کے بود ایں شقہ چست
مثنوی او راست ثنائے بگوے	بشنوش از دور دعائے بگوے
ایں ہمہ زانصاف نگر زور نیست	گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں،

زندہ است بہ معنی استادم	در نیست منش حیات دادم

غرض امیر نے کبھی اساتذہ کی استادی سے انکار نہیں کیا، وہ تمام استادوں کا

نہایت ادب کرتے تھے، مطلع الانوار میں جو کہدیا ہے، وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا، جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی،

امیر کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ راے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ راے نہیں دے سکتا، قران السعدین میں انھوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے، اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے، اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں،

وصف براں گونہ فرو راندہ ام	کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام	کانچہ بگو یند ہمہ گفتہ ام
چوں منم اندر قلب کان خویش	معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکے نیست کہ جو یند باز	چوں ہمہ عیب است چگو یند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعر کی تین قسمیں ہیں،

استاد تمام[۱]، جو کسی طرز خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی،
استاد نیم تمام[۲]، خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے، اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے،

سارق[۳]، جو اوروں کے مضامین چراتا ہے، پھر لکھتے ہیں کہ استادی کی چار شرطیں ہیں، طرز خاص کا موجد ہو[۱]، اس کا کلام شعرا کے انداز پر ہو[۲]، صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو[۳]، غلطیاں[۴] اور لغزشیں نہ کرتا ہو،

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت استاد نہیں، اس لئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں، اول تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں، دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا، خود ان کے الفاظ یہ ہیں،

بندۂ ازاں چہار شرط استادی کہ گفتہ شد، اول شرطے کہ مالک طرز است بر حکم ماجرائے کہ در مجرائے قلم جریاں یافت، کہ چندیں استاد را متابع کلمات بودہ ام،

چوں پس رو طرز ہر سوادم   بس شاگردم نہ او ستادم

د شرط دوم آنکہ در نامۂ سواد، بوی خطانہ باشد ازاں نیز نتوانم زد کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر روان است، اما جابجا در غزل و نغز لغزیدنی ہم است، دریں دو شرط معترفم کہ از لاف اُستادی قرعہ بر فال نتوانم غلطایند"

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے

امیر کے کلام پر ریویو کرنے کے لئے اس سے زیادہ بڑھ کر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے، امیر نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ اصناف سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں، تفصیل اس کی یہ ہے،

غزل   سعدی

مثنوی   نظامی

مواعظ و حکم   سنائی و خاقانی،

قصائد   رضی الدین نیشاپوری و کمال اسمٰعیل خلاق المعانی،

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منھ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قرآن السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت سے جو ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے،

امیر نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے، فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے، اور اس کی یہ دلیلیں لکھی ہیں،

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی کی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد و مترادف الفاظ ہیں، اسلئے شاعری آسان ہے، ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا، تو دوسرا موجود ہے بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں، باوجود اس کے فارسی شعرا پر میدانِ شاعری تنگ نہیں،

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے، ردیف نہیں،

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے، وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں، لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا، اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے، ردیف کی سرے سے ضرورت نہیں، نرے قافیہ پر مدار ہے، جس قدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ، ان سب وسعتوں

کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی،

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا، لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کر سکتا ہے، زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے، لیکن زباندانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے، فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں، کہ "اور بہت سے وجوہ ہیں، لیکن میں اس لئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہو جائے "،

امیر خسرو فن شاعری میں، جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے،

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں، خاص خاص اصنافِ شاعری میں کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی و نظامی، مثنوی میں، انوری اور کمال قصائد میں سعدی اور حافظ غزل میں، یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں، تو پھیکے پڑ جاتے ہیں، بخلاف اس کے امیر، قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا، غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کر کے دیکھ لو، کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اس کی آگے آتی ہے،

(۲) ایشیائی شاعری پر یہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں لکھی گئیں، مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے ان کی تصویر، آنکھوں میں پھر جائے،

امیر خسرو نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا ہے، انھوں نے قران السعدین

میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اور اس کتاب سے اُن کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں،

بود در اندیشۂ من چند گاہ کز دلِ دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشِ نو دہم سکہ ایں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فنِ اندیشہ زائے تا بنشانم نہ نشینم زپائے
وصف نہ زاں گونہ شد از دل بروں کاں دگرے را بدل آید کہ چوں

اس قسم کی شاعری کا نام امیرؔ نے وصف نگاری رکھا اور یہ نہایت موزوں نام ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھایا ہے، تاہم جس قدر ہے، غنیمت ہے،

کاغذ کی تعریف

کاغذ شامی[1] نسب و صبح دام آنکہ شد آرایش صبحش ز شام
سادہ حریرے و لے اصلش زخویش باقصب[2] و خز شدہ پیوند خویش
تا بے حریر آمدہ اندر نورد طرفہ حریرے کہ تواں جز و کرد
آمدہ اجزائش فراہم ز آب لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبش بسیار بیست پشت دوتا گر دوش از یک شکست
گہ بود از دستۂ تیغش گزر گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا [2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا،

گہ فلک سوزن مسطر کشد | گہ کششِ رشتۂ دفتر کشد
حرف بحرف از قلم آرد سخن | لیک بہ پیچد ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دیئے،

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمت کار آگہاں | خانۂ گردندہ بہ گرد جہاں
نادرۂ حکم خدائے حکیم | خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہل سفر را ہمہ بر وے گذر | ہمرہ او ساکن و او در سفر
جاریۂ ہند زبانش سلیم | حامل چندیں بچہ، لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پر و در گشاد | بیشتر از بادرود، روز باد
رفتہ دو منزل بہ دمے، بل دو چند | بارسن و سلسلۂ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سرفراز | پرچو حواصل زدہ و سو کردہ باز
ہر طرفش رہ بہ شتاب دگر | ہر قدمش بر سرِ آب دگر
گرچہ بدریا گذرد بیش و کم | آب بنا شد مگرش تا شکم
دست چو در آب فراز افگند | آب بدست آرد و باز افگند
لطمہ زدہ بر رخِ دریا بہ زور | آب ازاں لطمہ بہ فریاد و شور
در رہ بے آب نداند شدن | کیست کہ بے آب تواند شدن

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں،

امیرنے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

"تشبیہات نو بسیار است ایں مجمل جملہ را تحمل نتواند کرد، اما دو سہ نظیر برائے

یادکردن گردشدہ"

اس کے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں،

بزیرہر مو دارم چو دام ماہی گیر	ز انتظار دو ماہی ساق تو صد چشم
کرتہ ہائے دکان قصاب است	مژہ ہائے کرتہ دل آویزت
کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری	زہے خرامش آں نازنیں بہ عیاری

امیر چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے، اس لئے تشبیہات میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی، اخیر شعرا نے اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے، فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے، لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے، وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے،

قصیدہ، مثنوی، غزل میں اُنھوں نے جو جدتیں پیدا کیں، اُن کی تفصیل علیحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے،

مثنوی | مثنوی میں جیساکہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، خسرو نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے، اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے،

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص ان کے سوانح نگار کا کام ہے، البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے،

قران السعدین یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی، اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے، لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند، رواں اور برجستہ ہے، مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا، یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط وکتابت اور حملہ کی تیاری، بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحبِ تخت تھا اور اسی کی فرمایش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے، تختِ سلطنت کا مستحق بیٹا ہے، اس جھوٹی منطق کو امیر نے جہانتک ہوسکا، خوب نباہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں،

گر بہ گہر تاج ستانِ توام | عیب مکن گوہر کانِ توام
ور ہوس تاج ترا در سر است | من گہرم تاج مرا درخور است
چوں سرم از تخت سرافراز گشت | تاجِ تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہاں بہر تو برپاے کرد | لیک بداں تخت مرا جاے کرد
ملک بہ میراث نیابد کسے | تا نزند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نامِ پدر روشن است | خطبۂ جد بیں کہ بنامِ من است
ہر دو جوانیم من و بخت من | یا دو جواں پنجہ بہم در مزن
گرچہ بروبت نہ کشم در ستیز | از پے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کین آورم | شیر فلک را بزمیں آورم
جز تو کسے گر دم ازیں در زدے | سرزنش تیغ منش سر زدے
لیک توئی چوں پدر ایں سر بہ | من ندہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح حرف حرف، پدرانہ محبت کے نشے سے چور ہے،

اے ز نسب گشتہ سرآمد سریر — وز پسری ہمچو پدر بے نظیر

گرچہ غبار است ز کار توام — سرمۂ چشم است غبار توام

تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے — از پے ملک است مرا گفتگوے

گرچہ توانم ز تو ایں پایہ برد — از تو ستانم بکہ خواہم سپرد

شکر کہ شد زندہ در ایام تو — من ز تو و نام من از نام تو

باش بکامم کہ بہ کام توام — زندہ و تا زندہ بنام توام

خواہمت از جان کہ بپائے مرا — در تو بخواہی و نخواہی مرا

جز بہ تمنائے تو سودام نیست — بہتر ازیں ہیچ تمنام نیست

گرچہ کہ سلطان جہانم بہ ملک — تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک

لیک چو دورم ز تو اے نیک بخت — نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت

بخت من ار پائے بر افلاک سود — با تو چو یک دم نہ نشینم چہ سود

ان خار اگداز الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اس کا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوش محبت میں کہتا ہے،

من کہ گلے رستہ باغ توام — پرتوے از نور چراغ توام

گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم — ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم

زابرو خود کن تو اشارت بہ چیں — من سر خاقان فگنم بر زمیں

تاج ز من، سر ز تو افراختن — عاج ز تو، تخت ز من ساختن

در بہ ملاقات رہی رائے تست — افسر من خدمت پائے تست

نیست مرا آں محل و آں شکوہ   کز سر خود سایہ فتانم بہ کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھ کر بے اختیار تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا، باپ نے چھاتی سے لگا لیا، دیر تک دونوں جوشِ محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فروجست ز تخت بلند   کرد بہ آغوش تنِ ارجمند

داشت بہ آغوش خودش تا بدیر   سیر نہ شد چوں نشود از عمر سیر

با خودش از فرش بہ اورنگ برد   تختِ کیاں باز کیاں را سپرد

گاہ زدیدہ بہ نثارش گرفت   گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت

گاہ نظر بر رخ زیباش کرد   گاہ دل از مہر شکیباش کرد

پرسش از اندازہ زغایت گذشت   عد نوازش زعنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائفِ نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں، اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا،

خمسہ | خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں، یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینہ سکندری، ہشت بہشت،

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں، یہی ان کی تصنیف کی ترتیب ہے، چنانچہ امیر نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتاب کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے، اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا

حیرت انگیز اعجاز ہے،

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے، ان میں نسبۃً امیر کا خمسہ سب سے بہتر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں بعض، نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں، مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینۂ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے، معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر کے دل میں بھی بے اطمینانی تھی آئینۂ اسکندری میں لکھتے ہیں،

دگر بازگیری تو پیوند خویش | مرا خود عزیز است فرزند خویش

سزد گرچہ آواز خر خندہ را | بود ار غنوں گوش خربندہ را

بود باد بخشایش داد گر | کہ برمن بہ بخشش گمارد نظر

ہنر جوی و در عیب جوئی مکوش | ترا نیز عیبے است برخود بپوش

نظامی کے پرزور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں اُن کی زورِ طبع کا یہ نمونہ ہے،

بہ گردوں شد از نای زریں خروش | بہ دریاے لشکر در افتاد جوش

ہزا ہز در آمد بہ ہر دو سپاہ | رد دارو در آمد بہ خورشید و ماہ

علم سر ز عیوق برتر کشید | سنان چشم سیارہ بر سر کشید

بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت | جہانے پُر از شیر و شمشیر گشت

غبار زمیں کلہ بر ماہ بست | نفس را درونِ گلو راہ بست

چناں گشت روی ہوا گرد ناک | کہ سیارہ گم کرد خود را بہ خاک

سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج | چو دریا کہ بادش در آرد بہ موج

بدریاے آہن جہاں گشتہ غرق | ہوا پُر ز تیغ و زمیں پُر ز برق

زبانگِ ہیونانِ گیتی نورد شدہ پُر صدا گنبد لاجورد

عرق کردنِ توسناں در شتاب ز دریای آتش برانگیخت آب

شرارہ کہ زد نعل ہنگام رو ستارہ بردن ریخت از ماہ نو

نفیر زہ از چاشنی کمان شدہ چاشنی بخش جان ہر زماں

گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں زرہ بر زرہ پشت روئیں تناں

بزیر سپر تیغ رخشاں زتاب چناں کز تہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر کا اصلی مذاق نہیں، سلطان کی فرمائش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے، اور گویا بیگار ٹالتے تھے، چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے، اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے،

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا، اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے، تب روٹی ملتی ہے،

مسکین من مستمند بیہوش از سوختگی چو دیگ در جوش

شب تا سحر و ز صبح تا شام در گوشۂ غم نگیرم آرام

باشم ز برائے نفس خود رائے پیش چو خودے ستادہ بر پائے

تا خون نہ رود ز پائے تا سر دستم نشود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب اون کے خاص مذاق کی ہے، یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی اُنھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے

می داد چو نظم نامہ را پیچ   باقی نگذاشت بہرما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کی لیلیٰ مجنوں اور نظامی کی لیلیٰ مجنوں میں اگر کچھ فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں،

اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کئے ہیں، اور ان کا کمال دکھلایا ہے، مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں،

آتش زدہ گشتہ کوہ و کان ہم   تفسیدہ زمین و آسماں ہم

جاے نہ کہ دیدہ را برد خواب   ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب

مرغانِ چمن خزیدہ را در شاخ   در رفتہ چرندگان بہ سوراخ

ریگ از تف پختہ در گرانی   چوں تابۂ روز میہمانی

از گرمی ریگہاے گرداں   پُر آبلہ پاے رہ نورداں

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھکر کون سا موقع مل سکتا تھا، اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے، سگ لیلیٰ کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرانے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے، امیر خسرو نے اس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے، مجنوں کتے سے خطاب کرتا ہے،

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد   لیکن تو بنالہ و من از درد

چوں باز گذر کنی دراں کوے   برخاک درش زمن نہی روے

ہر خس کہ برو گذاشت گامے   از من برسانیش سلامے

ہر جا کہ نہاد پاے رد شن   زنہار ضرورہ بہ بوسی از لب من

خواہد چو ترا درون دہلیز   یادش دہی از سگِ گریز

زنجیر خودت نہد چو بر دوش | از گردن من مکن فراموش

اس پیرایہ ادا کو دیکھو، کہتے ہیں کہ جب لیلیٰ تجھکو ڈیوڑھی کے اندر بلائے تو ایک اور سگ در کو یاد دلا دینا جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول جانا عاشق کا پیغام وسلام سب لکھتے ہیں لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہی اور کیونکر لکھتا ہی نہایت نازک مقام ہے، دیکھو امیر خسرو اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں لیلیٰ مجنوں کو لکھتی ہے،

اے عاشق دور مادہ چونی	وے شمع ز نور مادہ چونی
روزت دانم کہ شب نشانست	شبہائے سیاہ بر چہ سانست
از من بیکے می بری حکایت	با خود ز کہ می کنی شکایت
در گوش کہ ؟ نالہ می رسانی	دریائے کہ قطرہ می فشانی
بازار تو در کدام سوی است	سیلاب تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، اب اس کی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے ؟ کس سے درد دل کہتا ہے، کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں تو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں، ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہی

آئینہ سکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی ان کے مذاق کا جو میدان آتا ہی اس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں، نظامی نے سکندر اور بت چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب وتاب سے لکھا ہے، خاص اس موقع پر خوب زور طبع دکھایا ہی، جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے،

خسرو نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے، اور اسی طرح بت چینی کا فخریہ لکھا ہے، نظامی
کے فخریہ سے ملا کر دیکھو معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ
میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے،

مشبد کہ داند جہاں سوختن	زمن بایدش بازی آموختن
ہمہ خون خوبان کش (نام شہر) می خورم	دے نوش بادم کہ خوش می خورم
رخ ہر صنم ناپدید از من است	صنم خانہ ہا را کلید از من است
سپہر آفتاب زمین خواندم	دگر ماہ بیند ہمیں خواندم
سکندر کہ کرد آب حیوان ہوس	نظیر منش بود مقصود و بس
گر او ہست کیخسرو جام جوے	مرا جام گیتی نمای است روے
گر از مجلس او سمن می دمد	مرا لالہ و گل ز تن می دمد
گر او راست بر تخت پایہ نشست	مرا در دل اوست جاے نشست
گر او تاج خواہد ز شاہان خراج	من از سروران سرستانم نہ تاج
گر اقبال و دولت درآیا ورند	مرا ہر دو چون کمترین چاکراند
گر او دشمنان را بخون خوردن است	مرا خون صد دوست در گردن است
گر او را یک آئینہ بر کف نشست	دو آئینہ دارم من از پشت و دست
کمان وے ار صد شکار افگند	یک ابروے من صد ہزار افگند
کمند وے ار صید بند و بدام	من آنم کہ صیاد گیرم بدام
گر او را کلاہے است بر آسمان	مرا صد کلاہ است بر آستان

ہشت بہشت | یہ سب سے آخری مثنوی ہے اور امیر کی شاعری اس میں پختگی اور پرکاری

کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں لیکن التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا جائے، اس کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے، ادا کئے جائیں، تمام کتاب کا یہی انداز ہے، اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتی،

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اس کو بادشاہ نے ایک جرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا، حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا، جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منھ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے، اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے، چیونٹی تار کو لئے ہوئے اوپر بڑھتی چلی گئی، حسن کے قریب پہونچی تو حسن نے تار کو لے کر اس سے رسی بٹی، اور پھر ایک خاص تدبیر سے اُسی کے سہارے نیچے اترا، تمام قصہ بہت لمبا ہے ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چون نگہ کرد خوابہ از بالا	کہ زنش در رسید با کالا
دادش آواز گفت بر سر تار	پارۂ قند کن بزود بیار
دہ بہ مورے کہ می رود بہ میل	تا بہ بالائش می رود تعجیل
رشتہ را زود زود می کن باز (لاٹ)	کز نشیب آورد بہ سوے فراز
ہمچناں کرد زن کہ او فرمود	داد رشتہ بہ مور و مور ربود
راند بالاے میل تار کشاں	ریسمن فتنہ بہ حصار کشاں
[illegible] بنزدیک رشتہ نشستہ برزد	ریسمان را ربود خواہد ولے

قصائد | قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے، کمال اسمٰعیل، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں، اس کا تتبع کرتے ہیں، خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے،

مجلس دو آتش دادہ، بر این از شجر و ان زجر | این کرد منقل را مقرون جام را جلوا داشتہ

اس کے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں، وہی استعارے ہیں، اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اس لئے ۱۰۰ شعر کہہ کر دم لیا ہے، اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے، عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں کھایا ہے

ہر سو جوانان تو سنب ہر سو عروسان در قصب لباس | طفلان نہ خفتہ از طرب دیدہ بہ فردا داشتہ

از شیر و خرما مرد و زن در شیر خواری تن بہ تن | چوں شیر خواراں در دہن پستان خرما داشتہ

خورشید چوں سر بر زدہ، ہر کس بہ اسپے در شدہ | این رو بہ سوی میکدہ، او در مصلا داشتہ

فاسق کہ می ناخوردہ گہ، در عید گہ بیہودہ شد | سر بر بساط سجدہ گہ، دل سوی صہبا داشتہ

داروی معلول ست می بل جان مخلول ست مے | خورشید مخلول ست می، قرطاس مینا داشتہ

ان کے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے ان کو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اس لئے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں، اور ان میں زور طبع دکھاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت، ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے، اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے،

ابر بارید و ہمہ روی زمیں تر کرد | خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرمود | بساط خاک زدیبا و پرنیاں فرمود

چو روی نازکِ گل تابِ آفتاب نداشت
زمانہ بر سرش از ابر، سایہ بان فرمود

ز لالہ خواست چمن ساغر و سبک بخشید
ز ابر خواست زمین شربت و رواں[5] فرمود

ہر آنچہ در ورقِ خویش، غنچہ مشکل داشت
بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہاں داد
نسیم، غالیہ در دامنِ گلستاں داد

چو چرخ پیر بہ رخ ز سپیدی و سرخی
بدستش آئینہ داد آفتابِ خنداں داد

درستِ مغربیِ آفتاب را کہ فلک
نہاد زیرِ زمیں بامداد تاباں داد

ستارہ را ز چہ شد دیدہ خیرہ از خورشید
چو شب ز حقّہ میناش سرمہ چنداں داد

غلامِ بادِ صبا ام کہ بامداد و پگاہ
صلای عیش بہ عشرت سرای مستاں داد

باغ

نو بہارست و چمن جلوہ چو حورا کردہ
ابر ہا ریختنی لؤلؤ لالا کردہ

گرہ طرۂ سنبل کہ صبا باز شدہ
دامنِ لالہ پر از عنبر سارا کردہ

برگل و لالہ چناں میرود آنگہ قمری
پای آلودہ بہ خوں پاچہ بالا کردہ

عاشقاں رفتہ بہ گلزار و دل سوختہ را
بہ تکلف ز گل و لالہ شکیبا کردہ

نو بہار امسال مارا روزہ فرماید ہمے
گل چناں تر دامن از می لب نیالاید ہمے

بر دہانِ غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم
کاں شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نگشاید ہمے

باد در کہسار جامِ لالہ را بر سنگ زد
گل بہ خندہ گفت: آری این چنیں باید ہمے

نرگسِ رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا
گوئیا میخوارہ ماہِ عید را پاید ہمے

گویا شراب خوار، ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے

[5] رواں فرمودن، نقداً حاضر کرنا،

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد (برسات) نگویم قطرہ کز بالا گلِ ریحاں ہمی بارد

نگوں سر، شاخہای سبز گوئی و ہمی چیند ‏ ‏ زبس کابر دُر افشاں لوء لوء غلطاں ہمی بارد

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ ان کے رولنے کو جھکی ہیں،

چکاں قطرہ ز سر ہائے انار تر تو پنداری ‏ ‏ کہ ہر دانہ کہ بودہ است اندرو پنہاں ہمی بارد

خوش آں وقتے کہ مطرب با سماعِ نیکواں سرخوش ‏ ‏ خراماں در میان سبزہ و بالاں ہمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں، ان میں بحر الابرار جو بڑا سیر حاصل قصیدہ ہے مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعویٰ اور اس کے ساتھ دلیل ہو،

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش در د سراست ‏ ‏ ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است

عاشقی رنج است و مرداں را بسینہ راحت است ‏ ‏ سلسلہ بند است شیراں را بہ گردن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلف ہی لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے، جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اس کا زیور ہے،

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہے عالم است ‏ ‏ تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است

راہرو چوں در ریا کو شد مرید شہوت است ‏ ‏ بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہر است

نفس خاک تست ہر گہ نور بالا بر تو تافت ‏ ‏ سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تاک خور است

کار ایں جا کن کہ تشویش است در محشر بسے ‏ ‏ آب زیں جا بر کہ در دریا بسے شور و تر است

ناکس کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است ‏ ‏ عود و سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستر است

اے برادر مادر و پدر را خورد خونت مرنج ‏ ‏ چوں ترا خونِ برادر بہ ز شیر مادر است

دہر خاکے را نمونہ می کند کیں مردم است ‏ ‏ بحر آبے را غلولہ می کند کیں گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدتِ طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے، اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام ہمعصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، انکے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد

برآمد ابر درخشش وگرزان پایہ در غلطہ — نگیرد ہیچ کس دستش مگر شاہ جہان گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل ار کم عمر شد گو باش دانی — کہ در خور نیست عمر جاوداں را

نہالِ باغ شاہی رکن حق آنکہ — ز بزم اوست رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ ماہے شدم بروے زمین — در ملک بنمودم کہ آسماں این است

طلوع صبح کا بیان کرکے،

صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست — آسماں روے ملک بجہچو نمود

ندارد روی آں نازک زگرما ہیچ آسیبے — مگر در سایۂ رایاتِ شاہ کامگار آمد

طلوع آفتاب کے بیان کے بعد،

خورشید جہانگیر مپندار کہ در بزم — شمشیر کشیدہ ملک المشرق برآمد

قصائد میں امیر نے جس قدر جدید مضامین، لطیف استعارات، نئی نئی تشبیہیں گوناگوں اسلوب پیدا کئے، اس کا احاطہ نہیں ہو سکتا، ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر اس میں بھی سب سے الگ ہیں،

بوستاں بشگفت و روی لالہ خنداں گشت باز — بر رخِ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہر خواندن بلبل نوشت — بلبل آنگہ از خط خوبان غزل خواں گشت باز

خون لالہ گو نیا خواہد چکید از تیغ کوہ　　یا چکید آں خون کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل | اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی، سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا، امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانۂ سعدی کی شراب ہے، جو دوبارہ کھینچکر تیز ہو گئی ہے،

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز، اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے، کہ یہ جذبات اور معاملات، جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے، یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، اس کے لئے یہ بھی ضرور ہے، کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں، جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں، لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں، اُنھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں، اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلادئے، یہ سب اجمال تھا تفصیل ذیل میں ہے،

بحروں کی موزونی | وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں، جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً

سرے دارم کہ ساماں نیست اُورا　　بہ دل دردے کہ درماں نیست اُورا

فرامش کردعمر روز را زانکہ　　شبے دارم کہ پایاں نیست اورا

بہ راہ انتظارم ہست چشمے　　کہ خوابے ہم پریشاں نیست اورا

یار من دل ز دوستاں بر داشت　　مہر دیرینہ از میاں بر داشت

درد دل اونہ کرد کارا چہ　　سنگ از نالہ ام فغاں بر داشت

دی بہ تندی بلند کرد ابرو — از پئے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بود برکراں شد — واں صبر کہ داشتم نہاں شد

گفتم کہ اسیر گردی اے دل — دیدی کہ بہ عاقبت ہماں شد

دل بر دگرے نہم ولیکن — عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ باز کنید — نام من بر سرش طراز کنید

گر شما دین عاشقاں دارید — بعد ازیں پیش بت نماز کنید

گاہ مردن، شنیدہ ام محمود — گفت رو دیم سوے ایاز کنید

داد من آں بت طرازنہ داد — با سخنے نیز دل نوازنہ داد

خواب ما را بہ بست و باز نہ کرد — دل ما را بہ برد و باز نہ داد

تو چہ دانی نیاز مندی چیست — چوں خدایت بہ کس نیاز نہ داد

سوز و گداز سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں، کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں، کبھی خود اپنے آپ پر اُن کو رحم آتا ہے،

ماجرائے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال — اے سرت گردم چہ می پرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہو تو تھوڑا سا کہہ کر اس کو رونا آتا ہے، ٹھہر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے، اس کی تصویر کھینچتے ہیں،

خسرو است و شب فسانہ دیار دہربا — قدرے گرید و پس بر سر افسانہ رود

زانوشس خسرو بزیر سر نیافت — سر نہادہ بر سر زانو بخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں پند می دہی آب از برون مریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہئے، پھر دل پر غصہ آتا ہے،
اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات ہو نہیں سکتی اس کے کہنے سے کیا فائدہ، اس مضمون
کو باندھتے ہیں،

غصہ ام می کشد، اے دل سخن صبر مگو وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی ای دشمن بہ عقل و دانش خسرو بیا تا بر مراد خاطر خود بینی اکنونش

رنج اور غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جاسکتی، عاشق (جس کا
فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلم ہے) عاشق ہو کر تمام دولت کو کھو چکا ہے،
وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی، اس کو کس مؤثر
طریقہ سے ادا کیا ہے،

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روی خود بنمایمت ایں سخن بیگانہ را گو، کا شنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند ورنہ رنجے بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے اور برا نہ مان تو فقیروں پر بھی،
"ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے،

کشتم از تیغ جفایت خویش را بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریاد من شب نمی خسپد کسے در کوی تو

صبر طلب می کنند از دل عاشق ہمچو خراجے کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول

لگایا جائے،

ای دیدہ چہ ریزی از برون آب — کیں شعلہ بہ جاں گرفت مارا

ای خواب! برو کہ باز امشب — سودای فلاں گرفت مارا

ای عشق کار تو بہ چو من ناکسے افتاد — گویا کسے نماند جہانِ خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ بتوانم خورد — بیش ازیں گرچہ غمے بود وے ہم بودہ است

کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بہ من — از شبِ تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا بر دوستاں جاناں قضا کن — ہراں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوی آں بت بدخو چہ میرود — آں خو گرفتہ باز دراں کوچہ میرود

جاں میرود ز تن چو گرہ می زند بہ زلف — مردن مرا است از گرہ او چہ میرود

گر بہ بینی دل ویرانِ مرا — گوئیا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے رخت دلم غارت کرد — شہر اسلام و مرا داد نہ بود

میرا انصاف نہ کیا گیا

کرشمہ چند کنی بر من آخر این جان است — نمی دمد نہ زمین و صبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی،

کرشمہ چند کنی با من آخر این جان است — نمی دمد ز زمین ز آسماں نمی بارد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازانکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدت اسلوب | غزل کی ترقی کا فوروز لطف ادا و جدتِ اسلوب ہے، جس کے موجد شیخ سعدی ہیں، لیکن پھر وہ نقش اولین تھا، امیر کی بوقلموں طبیعت نے جدتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیئے، جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کرنے کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں،

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز　　دردہا دادی و درمانی ہنوز

مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایے میں ادا کرتے ہیں،

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر نے کس انداز سے کہا ہے،

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشم تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بے خبر ہونا، عام مضمون ہے، اس کو کس لطف سے ادا کیا ہے،

گل چہ داند کہ درد بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اس کو یوں باز رکھتے ہیں،

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نا مسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھہراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

می روی و گریہ مے آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی　　از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

سعدی کا شعر ہے،

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجہ کا تھا کہ اس پر ترقی نہیں ہو سکتی تھی، لیکن امیر نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی　　ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے،

نظر کہیں نہ لگے ان کے دست بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں،

بے وآفت تقویٰ و آخر ایں نمیدانی　　کہ در شہر مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقویٰ میں فرق آتا ہے، بجائے اس کے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے، گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی حالت خراب نہ ہو جائے،

معشوق کی زیادتیِ لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

جاں ز نظارہ خرابِ ناز او ز اندازہ بیش　　ما بہ بوی مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا،

شرابِ لطف پُر در جام میریزی و می ترسم　　کہ زود آخر شود ایں بادہ و من در خمار افتم

اکثر جگہ صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کرتے ہیں،

چشم بد دور از چناں روئے　　کہ از و چشم دور نتواں کرد

مردماں در من و بیہوشی من حیرانند　　من در آں کس کہ ترا بیند و حیراں نشود

گفتیم ناخوشش چرا ای خسرو　　چوں کنم؟ آں قد و آں بالا خوش است

گفتم کہ ہمیں ترا غلامم　　گر ہست گناہ من ہمین است

دہنت ذرۂ کم از ذرہ است　　رخ ز خورشید ذرۂ کم نیست

ایہام یعنی ذومعنیین الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں،

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم — چه خوش بودی اگر بودی زبانش در دہان من

پیش ازیں بر خودم یقینے بود — کہ دلم ہیچ دلستاں نبرد

ق

تو بہ بردی ہمہ یقین مرا — بہ طریقے کہ کس گماں نبرد

دی روی تو دیدم و نہ مردم — شرمندہ بماندہ ام ز رویت

دیگر سر آں نیست کہ من زہد فروشم — ساقی قدحے بادہ کہ بر روی تو نوشم

اکثر جگہ جملہ معترضہ یا شرطیہ جملہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں، اور یہ ان کا خاص مذاق ہے،

بروائے باد! بوسے زن برآں پائے — وگر چیزے نگوید بردہاں ہم

غمزۂ تو بر صف سلطاں زند — ورنہ ریجے بر دل درویش ہم

رشکم آید کہ برم پیش تو نام دگراں — وگر انصاف بود پیش تو ہم نتواں گفت

کشتم از تیغ جفایت خویش را — بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

غمے دارم کہ باد از دوستاں دور — بحق دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی اور معاملہ بندی | مولوی غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں[1]،

مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن طرازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم دارد مثل ایں بیت،

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست — تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

امانا تیغ نقوش مانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی وقوع گوئی گردید

[1] خزانہ عامرہ ص۲۵،

و اساس آں را بلند ساخت "

عشق و ہوسبازی میں جو حالات پیش آتے ہیں، ان کے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں، اہل لکھنؤ نے اس کا نام معاملہ بندی رکھا ہے، بہر حال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے، امیر خسرو ہیں،

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اس کو ترقی کی حد تک پہنچا دیا، آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کئے ہیں،

خوش آں زماں کہ بہ پیش نظر نہفتہ کنم — چو سوی من نگرد او، نظر بگردانم

غلام آں نفسم کا مدم چو خانہ او — بہ خشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر درش بسیار، درباں گفت ایں مسکیں — گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر خسرو کے کلام کی زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر قسم کے نازک و لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کئے ہیں،

چند گویند کہ گہ گہ بہ دلش می گذری — ایں حدیثے است کہ بہر دل ما نیز کنند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو ؟ تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے، لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لئے بھی کہدیا کرتے ہیں، اس لئے اعتبار کیونکر آئے،

جانا! اگر شبیت دہن بر دہن نہم — خود را بخواب ساز و مگوکیں دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے منھ پر منھ رکھدوں تو اپنے آپ کو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منھ ہے۔

دل من مست بود و غصہ دوست — گہے ز انجام و گہ ز آغاز می گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود — در میسر گردد دم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ برکہ بودی ؟ شب | کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد
مست آں ذوقم کہ شب در کوی خویشم دیدہ گفت | کیست ایں ؟ گفتند مسکینے گدائی می کند
جان باد فدات آندم کز بعد دو سہ بوسہ | گویم کہ یکے دیگر ، گوئی تو کہ نتوانم
وعدہ می خواہم و در بند وفا نیستم | غرض آنست کہ بارے بہ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال | عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہوگئی ہے، جس کا نام علمی زبان ہے،

سعدی و نظامی وغیرہ کی بولنے کی زبان اگر قلمبند کی جائے تو بوستان اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی، بلکہ آج اگر اس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہم کو سمجھنے میں وقت ہوگی، لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے، بے شبہہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں، جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کے لئے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کی جائے، خصوصاً غزل کی زبان، روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہئے، کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے،

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دیجائے، سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے، اس کا ایک بڑا گر یہی ہے،

امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں، اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے

بھی آجاتے ہیں جو آج ہم کو اس لئے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہم کو اس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں،

دل بسے بردۂ نکو بشناس　　آں کہ مجروح تر از آن من است

یعنی تم نے بہت سے دل لئے ہیں، خوب غور کرکے دیکھو جو بہت زخمی ہو وہی میرا دل ہے[1]

صبح روے تو بدبینیاں کہ برآید امروز　　نیست امکاں کہ چو من سوختہ تا شام کشند[1]

لب و دہان و رخت ہر یکے بلاے دل اند　　یکے دلم چہ کند، جانب کدام شود

یعنی تیرا لب، دہن، اور چہرہ، سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدھر کدھر جائے،

گفتمت ای دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی　　عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد[2]

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند　　ای ترک نیم مست عناں اکشندہ تر
ذرا باگ کو روکے ہوئے

بوسہ گفت و زباں گردانید　　خود ہے گوید و ہے گرداند

بوسہ دینے کو کہا اور پلٹ گیا، آپ ہی کہتا ہو اور آپ ہی ہٹ جاتا ہے،

بوے خوشم آید از تو در جیب　　گل داری یا ہمین است بو یت

تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے،

خنک سالی است دریں عہد وفا اے رشک　　زاں حوالی کہ تو می آئی باراں چون است
جدھر سے تم آتے ہو ادھر بارش کیسی ہے

ای گل، دہنِ تنگت صد تنگ شکر چیزی　　گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے،
ذرا سا

گویم غم و در دم بیں گوئی کہ بتر خواہم　　بسم اللہ اگر خواہی زیں ہر دو بتر چیزے

چو سبزہ خویش را خط تو خواند جاے آں باشد　　کہ گل از خندہ برخاک اوفتد غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین

---

[1] تا شام کشند یعنی شام تک زندہ رہجائے [2] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا،

پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں،

دلم می خواستی برہم عفاک اللہ چناں دیدی
مرا می خواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبادی کہ فلانے بہ چمن مے می خورد
ہیچ یاد من گم گشتۂ زندانے کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم
بوے گل نیست کہ می آیدم این بوی کسی است

دل من دور نہ رفت است نکوے دانم
باز جوئید ہمیں جا ہی کہ در کوی کسی است

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت بہ چہ کنم
کہ ز ابروے تو چشم بدو محراب افتاد

تیرا چہرہ دیکھ کر مجھکو قبلہ میں دھوکا سا ہوتا ہے کیونکہ مجھکو تیرے ابروسے دو محرابیں نظر آتی ہیں،

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں
زیں ذوق مست بیخبرم کان سخن چہ بود

سب کو منھ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی،

ساکنان سر کوے تو بنا شند بہ ہوش
کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد

ز چشمت کاروانِ صبرِ من تاراجِ کافر شد
مسلمانان کسے دیداست کاندر شہر راہ افتد

مسلمانو! کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہی،

بہ بازی سوے من آمد بہ شوخی دل ز من بستد
بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید

عام محاورہ بکار می آید ہی کار می آید، امیر خسرو کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گذرا،

حسن تو عالمے بخواہد سوخت
ہم در آغاز می توان دانست

نرخ کردی بہ بوسہ جانی
بندہ بخرید رائگاں دانست

تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی، میں نے خریدا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا،

از بہر آں کہ لاف جمالِ تو میزند
صد بار لالہ بر دہن یاسمیں زدہ است

ما جان فدای خنجرِ تسلیم کردہ ایم
خواہی بہ بخش و خواہ بکش رای رای تست

ساقی بیار می کہ چناں سوخت دل ز عشق　　کز سوز این کباب ہمہ خانہ بو گرفت

راست کردی ز ابروان محراب　　می نماید نماز خواہی کرد

ابرووں سے تو نے محراب درست کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے،

من آں ترکِ طناز را می شناسم　　من آں مایۂ ناز را می شناسم

شبم تازہ شد جاں بہ دشنام مستی　　تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا جدا ز رخ او زلف در ربود　　ابر سیہ گشادہ شد و آفتاب کرد

دھوپ نکل آئی

تو حال من ہم از ین روی زرد بیرون　　کہ من بہ روی تو پیدا نمی توانم کرد

سالہا شد کہ نیابم خبر از در کویت　　دل ویراں شدہ را آیم و آواز کنم

من از سر زندہ گردم، گر تو یارا یک سخن گوئی　　تو می دانم نگوئی، لیک من گفتار میگویم

مجھ کو معلوم ہی کہ تم نہ کہوگے لیکن میں بات کہتا ہوں

دعوای خون بہای دلِ خویش می کنم　　یک بوسہ بر لبم زن و مالا کلام کن

امیر نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا کسی اور اہل زبان کے کلام میں نہیں ملتے ہیں مثلاً

ازگرہ او چہ می رود

آواز کردن، پکارنا،

گفتار می گویم، یوں ہی ایک بات کہتا ہوں،

مالا کلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی

---

[1] پیدا کردن، ظاہر کرنا،

محاورے اُن کی زبان سے نکل جاتے ہیں، ممکن ہے ایسا ہی ہو، لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقراء پر اعتماد نہیں، اس لئے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہو سکتے،

تسلسل مضامین غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے، قصائد کا موضوع مدح ہے، مثنویاں، قصے یا اخلاق کے لئے مخصوص ہیں، قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں، عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں تو کیوں کر کریں، اس کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے، لیکن قدماء بلکہ متاخرین میں بھی اسکا بہت کم رواج ہوا، امیر خسرو نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اُس کی نظیر نہیں مل سکتی،

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق کس حسرت کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں،

ای صبا باز بمن گوی کہ جاناں چون است	آں گل تازہ و آں غنچۂ خنداں چون است؟
باکہ مے می خورد و آں ظالم و درمی خوردن	آں رخ پر خوی آں زلف پریشاں چون است؟
چشم بد خوش کہ ہشیار نہ باشد مست است	چشم میگونش کہ دیوانہ کنداں چون است؟
روی و زلف بتِ عیار کہ آں ہر دو خوش اند	دل دیوانۂ من پہلوی ایشان چون است؟
روزہا شد کہ دلم رفتہ دراں لعف بماند	یارب آں یوسفِ گم گشتہ بزندان چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعۃً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلافِ عاشقی ہے، اس لئے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بہ جان و سرِ جاناں کہ کم و بیش مگو	گو ہمیں یک سخن است کہ جاناں چون است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم ادھر ادھر کی باتیں نہ کہہ، صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے،

معشوق نے روزہ رکھا ہے اس پر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہو سکتے ہیں،

ان کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

ماہ من روزہ میان شکرستان دارد	ای خوش آن روزہ کہ جا در لب جانان دارد
لب بہ آلودہ دہان پر شکر و نرگس مست	ای مسلمانان کس روزہ بدینسان دارد
خضر گر بر لبش آید شکند روزہ خویش	کان بسر در تہ لب چشمہ حیوان دارد
خون من می خورد آخر زنش پنہان نسست	من گرفتم کہ خود او روزہ پنہان دارد
جان من گر تو قدم رنجہ کنی بندہ تو	قدرے آب دو چشم و دل بریان دارد

معشوق سر و سامان کے ساتھ سوار آ رہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے کہ کیا آسمان سے چاند اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آ رہی ہے؟ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں معشوق آتا ہے، لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا، اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہئے، ان خیالات کو مسلسل ادا کرتے ہیں،

کہ می آید چنین یا رب مگر مہ بر زمین آمد	چہ گرد است اینکہ میخیزد کہ با جان ہمنشین آمد
کہ می راند چنین یا رب کہ میدان عنبر آگین شد (سواری)	کدامین باد می جنبد کہ بوئے یاسمین آمد
بتی و آفت تقوی و آخر این نمیدانی	کہ در شہر مسلمانان نباید این چنین آمد

بہار آئی ہے، عاشق باغ میں جاتا ہے، مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے، سبزہ لب جو اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے، قاصد سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ادھر ادھر کی باتوں میں ٹالنا چاہئے

تو نہ ماننا، اور جس طرح ہو سکے ساتھ لانا، اور اگر عالمِ مستی میں ہو تو اسی طرح مست اٹھا لانا،

ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے،

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش ۔۔۔ وقتیست خوش بہار کہ وقت بہار خوش[1]

در باغ با ترانۂ بلبل درین ہوا ۔۔۔ مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش

مائیم و مطربے و شرابے و حجرے ۔۔۔ جائے بزیر سایۂ شاخِ چنار خوش

ای باد کاہلی مکن و سوے دوست رو ۔۔۔ مارا بکن بہ آمدنِ آں نگار خوش

چیزے دگر مگوے، ہمیں گو کہ در چمن ۔۔۔ سبزہ خوش است و آب خوش و جویبار خوش

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد ۔۔۔ پیشش کن و بیار مشوز ینہار خوش

در بینیش کہ مست بود خفتنش مدہ ۔۔۔ ہم ہمچنانش مست بہ نزدِ من آر خوش

من مست خوش حریفی اویم کہ آں حریف ۔۔۔ سر خوش خوش است و مست خوش و ہوشیار خوش

باد دراں زماں کہ طبیعتش راہ می دہد ۔۔۔ بازی خوش است و بوسہ خوش است و کنار خوش

سرو پیادہ خوش بود اندر چمن و لیک ۔۔۔ آں سرو من پیادہ خوش است و سوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہئیے ؟ اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں،

ہنگام گل است بادہ باید ۔۔۔ ساقی و حریف سادہ باید

گر غنچہ گرہ در ابرو افگند ۔۔۔ پیشانی گل کشادہ باید

ساقی برخیزد و یار بنشاں ۔۔۔ کیں نشستہ و آں ستادہ باید

وانگاہ، حریف سادہ و مست ۔۔۔ در چنگ من اوفتادہ باید

بہار کا سامان،

[1] وقت کے خوش بودن، دعائیہ جملہ ہے، یعنی خدا اُن کو خوش و خرم رکھے،

بوستاں جلوہ در گرفت اینک — گل ز رخ پردہ در گرفت اینک

آتشِ لالہ بر فروخت ز باد — دامنِ کوہ در گرفت اینک

بلبل آمد، نشست بر سر گل — بے نوا بود، زر گرفت اینک

غنچہ در پیش فاختہ ز اصول (موسیقی) — سبقے تازہ بر گرفت اینک

ورق غنچہ را کہ تر شدہ بود — ورقش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ نم تھے، اس لئے چپک کر رہ گئے،

آب را گرچہ چشم ہا پاک است — بوستاں را ببر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے، تاہم اس نے باغ کو سینہ سے لپٹا لیا،

خار چوں تیز کرد پیکاں را — گل بصد تو سپر گرفت اینک

طوطی آغاز شعر خسرو کرد — روے گل در شکر گرفت اینک

جدت — جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، امیر کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعویٰ بدیہی دعوی ہے، ان کی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو، چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں،

راز خون آلود خویش اے دل منہ با من بروں — کیں ورق خام است حرف اُو وی بروں خواہد گذشت

اے دل اپنا بھید مجھ سے نہ کہہ، کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے، اس میں حرف پھوٹ نکلے گا،

زلف او پہلوی خال لب او — گوئی از شہد مگس می راند

نہ رود مہ بر اوج در شب تار — تا زِ زلف تو نردبان نہ برد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جبتک تیری زلفوں کی سیڑھیاں لگائے

(چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

هست صحرا چوں کف دست بُرد از لاله جام   خوش کف دستی که چندیں جام صهبا بر گرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے،

دیده ام شاخ گلے بر خویش می پیچم که کاش   می توانستم بیک دست ایں قدر ساغر گرفت

یعنی میں نے ایک ڈالی پھولوں سے بھری دیکھی، اور تڑپ گیا کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے ہی پیالے لے سکتا:

غلام نرگسِ مستم که بامداد پگاه   قدح بدست گرفته ز خواب برخیزد

گلستاں نسیم سحر یافته است   صبا غنچه را خفته دریافته است

چناں خواب دیده است نرگس بخواب   که گویا یکے جام زر یافته است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے، اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں، اور یہ تشبیہ عام تھی، لیکن اس اسلوب بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے، ایک خاص لطف پیدا کر دیا، اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں، اس لئے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے،

می روی و گریه مے آید مرا   ساعتے بنشیں که باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں، لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجھکو رونا آتا ہے، اتنا ٹھہر جا کہ بارش تھم جائے، اور اس میں مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے، اس لئے وہ جانا چاہے گا، تو بارش ہو گی، اس لئے وہ کبھی نہ جا سکے گا،

می میانِ شیشهٔ ساقی نگر   آتشے گویا به آب آلوده اند

ابر آمد و به ساغرِ لاله شراب کرد   در گوشهاے باغ بسے در ناب کرد

فراشِ باغ بار گہ خود بہ باغ زد وانگہ بر آب، خرگہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت ز فریاد بلبلاں بنہاد سر بہ بالش گل میل خواب کرد

مضمون آفرینی: خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے، غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے، غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر خسرو کا ہے اور انہی پر خاتمہ بھی ہوگیا، متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اسکا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے. چنانچہ آگے چل کر اسکی حقیقت کھلے گی،

امیر خسرو کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں، مثالوں سے اندازہ ہوگا،

بہ خانۂ تو ہمہ روز بامداد بود کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا

ترے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے، کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا،

زلف تو سیہ چراست بارہا بسیار در آفتاب گشتہ است

مشتبہ می شود م قبلۂ رویت چہ کنم کہ ز ابروی تو چشم بدو محراب فتاد

چشم مست تو کہ دی بر من بیتاب فتاد تو نیفگندی از آلودگی خواب افتاد

زبہر آں چنیں تاریک باشد خانۂ چشمم کہ ہرگز آفتاب من درین روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست روز روشن چراغ نتواں کرد

می روی دگریہ سے آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دلِ من بہ لف رویت شد اسیر و چوں نگردد شب ماہتاب دزدے کہ بخانہ در آید

زہے عمر دراز عاشقاں گر شب ہجراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب ہجر کو بھی شامل کر دیا جائے تو عاشق کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،

زلفت اناں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غم　　گر شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کنند

یعنی اپنی زلف وہ اس لئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہوجائیں تو ان میں جوڑ لگا کر بڑھادے،

راہی است برائے بردن دل　　-　ابروی تو کز میان کشاد است

یعنی تیرے دونوں ابروں کے درمیان میں جو فاصلہ ہے، اسلئے ہے کہ دل لیجانے کیلئے راستہ ہے!

زلفت سرو پاشکستہ زاں است　　کز سرو بلندت افتاد است،

یک شب ز رخ خویش چراغیم کرم کن　　تا قصۂ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم

یعنی کسی رات کو، اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اسکی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں،

خانۂ چشم من خراب شدہ است　　کہ بہ بنیاد خانہ، نم رفتہ است

کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شکریں لعلِ تو کان نمک است　　گرچہ شکر نہ مکان نمک است

اب روسے تو ملاحت افزود　　گرچہ از آب زیاں نمک است

خواہی ایجان برو و خواہ بمن باش کہ من　　مردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجا است

آئینہ کرد حسن وی از آسمان سوال　　برخاست آفتاب بہ زانو جواب کرد

یعنی اس کے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا، آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے،

سر ابروی تو گردم گرہش باز کشاے　　کہ کمانت نہ بہ اندازۂ بازوی کسی است

ہر چند کہ زلفِ تو سپاہی است جہانگیر　　زیں گونہ پریشاں نتواں کرد سپہ را

بہ سایہ خفتہ بدم من کہ یار آمد گفت　　چہ خفتۂ کہ رسید آفتاب در سایہ

اکثر شاعرانہ اجتماع نقیضین ثابت کرتے ہیں، اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے،

ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز،

یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم

صنائع | امیر نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہم کو بڑا ڈر تھا کہ جو جال اُنھوں نے بچھایا اس میں خود بھی پھنس نہ جائیں لیکن یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع و بدائع کو فن بنایا اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں مثلاً فرخی و ابن المعتز وغیرہ وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے،

امیر خسرو، اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم ان کے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں، اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں، صنعتِ طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے برتتے ہیں،

ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز

زبند دو جہاں آزاد گردم	اگر تو ہمنشین بندہ باشی
من درویش را کشتی بہ غمزہ	کرم کردی الٰہی زندہ باشی
گفتیم ناخوشش چرائی خسروا	چوں کنم؟ آں شکل داں بالا خوش است
بندہ را در غمِ تو نیست خبر	ہمہ یارانِ بندہ را خبر است
خروسانے بہ من کند بیداد	اے بزرگانِ شہر داد دہید

عربیت | اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر کو عربی علم ادب میں کمال تھا، اور اس فن کی نادر کتابیں ان کے حافظہ میں محزون تھیں، تاہم ان کو اس فن میں دعویٰ نہیں، غرۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے ان کو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے،

اشعار یہ ہیں

ذاب الفواد و سال من عینی الدم　　　وحکی الدموع کل ما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھ سے خون بہا اور آنسوؤں نے وہ سب کہدیا جو میں چھپاتا تھا،

واذا الجت لدی الوری کرب النوی　　　بتکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یا عاذل العشاق، دعنی باکیا　　　ان السکوت علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے چپ رہنا، عاشق پر حرام ہے،

من بات مثلی فھو یدر خلیلتی　　　طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے.

اعجاز خسروی میں عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں، جن سے ان کی عربیت کا اندازہ ہوسکتا ہے، اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں، لیکن یہ اس زمانہ کا عام انداز تھا، تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا،

وان انا الا من غزیۃ، ان غوت　　　غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال قبیلہ غزیہ کا آدمی ہوں، غزیہ گمراہ ہو تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہو تو میں بھی ہوں،

صنائع و بدائع امیر خسرو نے صنائع و بدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں، اگرچہ کوہ کندن او کاہ بر آوردن ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ اون کی محنت بالکل رائگاں نہ جانے پائے، ان کا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے،

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں، لیکن فارسی میں ان کا ادا کرنا اسلئے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اس کی متحمل نہیں ہوسکتی، مثلاً صنعت منقوط یعنی عبارت

میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہوا، امیر نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں، بعض فارسی میں بھی، لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص لکھ نہ سکا، امیر خسرو نے ورق کے ورق لکھے بعض صنائع میں اُنھوں نے تصرفات کئے، اور بعض بالکل خاص ان کی ایجاد ہیں، چنانچہ ہم انہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں،

دورُو، یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے ردوبدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جاسکے اور بامعنی ہو، امیر نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں، لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے ان کا صحیح پڑھنا ناممکن ہے، اس لئے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں،

رسیدی بدیدی مرا دی بخانے (کل مکان)   زمانے بباشی، بہ یاری بشائی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے،

کل تو آیا اور تو نے مجھ کو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھہر جا تو دوستی کرنے کے قابل ہے،

لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں،

رشیدی، ندیدی، مرادی نجاتی   رمانی بیاس، تبادی نسائی

تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے، مجکو اس بات نے ناامید کیا ہے کہ میری عورتیں باہم لڑتی ہیں،

قلب اللسانین، بہت سے اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں، لیکن اگر ان کو الٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بن جائے، مثلاً

بسی با کامرانی در جہاں باش،

می باش بہ کار ستادمانی

بای یار ما کہ کار می کینم بہم

دوست ما یار منی بہ یاری ما آئی
بکن داد و بکشود کامراں باش

ان تمام مصرعوں کو الٹ کر پڑھیں، تو عربی عبارت بن جاتی ہے،

وصل الحرفین: یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں، ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو تین تین حرف کا لفظ ہو، مثلاً

چاکر خاصہ، حاجی شرقانی، سر خدمت، بر پایت می مالد، و می گوید، کہ بدیں جانب خاطر با فرحت قرین می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما، نامہ فرماید، تا ہر خوشی کہ بر ماست فرخی کامل باید،

یہ اُس صنعت کا نقیض ہے، جس کا ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً

دَر دُور و وداد آورد، در رو دار، دارای دربار دوّار، ذات داور دوراں را الخ

امیر نے اسی صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے،

اربعۃ الاحرف، اس صنعت پر امیر کو بہت ناز ہے، کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حرف یعنی الف، ہ، واو، ے کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں،

لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل سہل معلوم ہوتی ہے اور اس کا پڑھنا سخت مشکل ہے،

معجزۃ الالسنۃ و الشفاہ، اس صنعت پر اور بھی ان کو ناز ہے، اس میں ایسے الفاظ جمع کئے ہیں کہ سطریں کی سطریں پڑھتے جاؤ، لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی، صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے،

ترجمۃ اللفظ، یہ صنعت بھی خاص ان کی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے، اُس کے بعد کا لفظ، دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے، مثلاً

سوداے رخ تو کشت مارا

یہ فارسی مصرع ہے لیکن کشت کا اگر اردو میں ترجمہ کریں تو مارا ہوگا اس لئے مصرع کا اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے، امیر نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے۔

محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اس کے سات معنی ہیں، اور ہر معنی وہاں مراد لئے جا سکتے ہیں،

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ، دوسرے مصرعہ کے آغاز کا محتاج رہتا ہے، مثلاً

در حسن ترا، کسے نماند الّا	خورشید کہ ہر صبح بروں آید تا
خدمت کند، و پای تو بوسد، اما	بینی تو بسوے او، چو پا بوسد، تا

انہی صنعتوں اور بیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں، اگر کسی صاحب کو امیر خسرو سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے، مطالعہ فرمائیں،

سلمان ساوجی

(وفات ۷۶۹ھ یا ۷۷۸ھ)
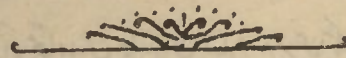
عراق عجم میں ساوہ ایک مشہور صوبہ تھا، صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ "اب صرف چند قصبے باقی رہ گئے ہیں"، سلمان یہیں کے رہنے والے تھے، عربی میں نسبت کے وقت ہ ج سے بدل جاتی ہے، اس لئے ساوجی کہلاتے ہیں، ان کا خاندان ہمیشہ سے معزز چلا آتا تھا اور سلاطین وقت ان کا بہت احترام کرتے تھے، سلمان کے والد جن کا نام خواجہ علاء الدین محمد تھا، دربار شاہی میں ملازم تھے، سلمان کی ابتدائی تعلیم بھی اسی حیثیت سے ہوئی تھی، چنانچہ دفتر کے کاروبار اور علم سیاق میں نہایت کمال رکھتے تھے، اس زمانہ میں جو طوائف الملوک حکومتیں جابجا قائم ہوگئی تھیں، ان میں ایک جلایر کا خاندان تھا، جس کا پایہ تخت بغداد تھا، اس خاندان نے ۸۶ برس تک حکومت کی، اور چار شخص مسند حکومت پر بیٹھے، اس سلسلہ کا پہلا فرماں روا حسن ایلکانی تھا، حسن ایلکانی کے فرزند سلطان اویس جلائر نے بڑا جاہ اور اقتدار پیدا کیا، ۷۶۰ھ میں آذربائجان، اران، مغان، شیروان، موصل وغیرہ فتح کرکے، اپنے حدود حکومت میں داخل کر لیے، ۱۹ برس تک بڑے عظمت و اقتدار کے ساتھ حکومت کی، مختلف علوم و فنون میں کمال رکھتا تھا، تصویر ایسی عمدہ کھینچتا تھا کہ بڑے بڑے مصور دنگ رہ جاتے تھے، خواجہ عبدالحئی جو مشہور مصور گذرا ہے، اسی کا تربیت یافتہ تھا، علم موسیقی میں اکثر چیزیں اس کی ایجاد

ہیں ان باتوں کے سوا حسن وجمال کا یہ حال تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تھی تو راستہ تماشائیوں سے رک جاتا تھا، ۷۷۶ھ میں وفات پائی، خواجہ سلمان انہی دونوں کے دربار کے ملک الشعراء تھے[1]

خواجہ سلمان کی ابتدائی تقریب کا یہ واقعہ ہے، کہ انھوں نے حسن ایلکانی کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر بغداد کا قصد کیا، اور دربار میں پہونچے، ایک دن حسن تیراندازی کی مشق کر رہا تھا، سلمان بھی اس موقع پر موجود تھے، برجستہ یہ اشعار کہہ کر پیش کئے،

چو در بارِ چاچی کماں رفت شاہ	تو گفتی کہ در برج قوس است ماہ
دو زاغ کماں با عقابِ سہ پر	بدیدم بیک گوشہ آوردہ سر
نہادند سر بر سر گوشِ شاہ	ندانم چہ گفتند در ہوشِ شاہ
چو از شست بکشادہ خسرو گرہ	بر آمد ز ہر گوشہ آواز زہ،
شہا! تیر در بند تدبیر تست	سعادت دواں در پیِ تیر تست
بہ عہدت ز کس نالہ بر نخاست	بغیر از کماں کو بنالد رواست
کہ در عہد سلطانِ صاحبقراں	نکر داست کس زور جز بر کماں

حسن نے سلمان کی غیر معمولی قادر الکلامی دیکھ کر مقربینِ خاص میں داخل کیا،

سلطان حسن کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت تھی، سلطان برائے نام بادشاہ تھا، سلطنت کا نظم ونسق دلشاد خاتون کے ہاتھ میں تھا، وہ شعرائے سخن کی بڑی قدر دان تھی، اس بنا پر سلمان کی نہایت قدر دانی کرتی تھی، سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زورِ طبع دکھایا ہے،

سلطان اویس کو شاعری کے ساتھ خاص مذاق تھا، خود شعر کہتا تھا، اور سلمان کو دکھاتا

---

[1] مجمع الفصحاء و تذکرۂ دولت شاہ،

تھا، اس بنا پر سلمان نے اس کے دربار میں نہایت تقرب حاصل کیا،

ایک دفعہ سلمان رات کے وقت سلطان اویس کی مجلس عیش میں شریک تھے جلسہ ختم ہو چکا تو سلمان اٹھے، سلطان نے ملازم ساتھ کر دیا، کہ روشنی دکھانے کے لئے شمع ساتھ لیجائے، گھر پر پہنچے تو ملازم شمع وہیں چھوڑ آیا، صبح کو شمع لینے گیا تو خواجہ صاحب اس بنا پر گھبرائے کہ شمع کے ساتھ طلائی تھالی بھی تھی، وہ ہاتھ سے جاتی ہے، اسی وقت یہ شعر لکھ کر ملازم کو دیا، کہ سلطان کی خدمت میں پیش کرنا،

شمع خود سوخت بزاری شب دوشین و امروز | گر لگن می طلبد شاہ زمن می سوزم

سلطان نے ہنس کر کہا کہ شاعر سے کوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے،

سلمان جب بہت ضعیف ہو گئے تو ملازمت سے استعفا دینا چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کئے،

بادشاہا! بندہ در حضرت برسم عرضداشت | انبساطے می نماید بر امید رحمتت

قرب چل سال است تا سکان شرق و غرب[1] | طبع سلمان می کند در گوش در مدحتت

در ثنائی حضرتت عہد جوانی گشت صرف | نوبت پیری رسید اکنون بامر حضرتت

گوشۂ خواہم گرفتن تا اگر عمرے بود | چند روزے بگذرانم در دعاے دولتت

علت پیری و درد پا وضعف جسم و چشم | می برد درد سر من بندہ را از خدمتت

گفتہ ام در باب خود فصلے دو سہ از جواب | چشم دارد بندہ از درگاہ گردوں حشمتت

قطعۂ دوم

اول آنست کہ چون نیت عزلت دارد | بندہ زین دائرۂ جمع، جدا خواہد بود

---

[1] دولت شاہ

مدتے مالک ملکِ شعرا بود بہ حق   زیں زماں خادمِ جمع فقرا خواہد بود

پیش ازیں، در پئے مخلوق بہ سرمی گردید   بعد ازیں بر درِ معبود بپا خواہد بود

بندہ تا زندہ بود وجہ معاشِ بندہ   ہیچ شک نیست کز احسانِ شما خواہد بود

لیک دارم طمع آں کہ معین باشد   کہ مرا وجہ معیشت ز کجا خواہد بود

قطعۂ سوم

دیگر آن است کہ محبوبِ جہاں مقری شاہ   آمد از بندگیٔ[1] شاہ کہ مے فرماید

رو بگو بندۂ دیرینۂ ما سلماں را   کہ بخواہ از کرمم ہرچہ ترا می باید

بندہ برحسبِ اشارت طلبی کردم و شاہ   داشت مبذول جہاں کز کرم شاہ آید

وعدہ دین است زدین من اگر زانچہ کند   ذمۂ ہمت خود شاہ بری، سے شاید

قطعۂ چہارم

دیگر از خرچ تر (زیادہ) و دخل کمش قرضے چند   ہست و قرض است کہ قرض غربا باز دہد

بندہ را غیر در شاہ درِ دیگر نیست   قرض باید کہ ز انعام شما باز دہد

وجہ این قرض کہ از من غربا می خواہند   گر نہ خواہد ز تو سلماں ز کجا باز دہد

سلطان نے فی البدیہہ پہلے قطعہ پر یہ شعر لکھا،

ہرچہ تا غایت بہ نام او مقرر بودہ است   ہمچناں باشد بہ نام او مقرر ہمچناں

دوسرے قطعہ پر یہ لکھا،

---

[1] بندگی کا لفظ اس زمانہ میں اس طرح بولتے تھے جس طرح آجکل بادشاہ کے لئے ہز مجسٹی کہتے ہیں؛

دہ ایرین کہ در حدود رَے، است	بدہندش کہ التماس وے است

غرض جاگیر اور تنخواہ کی بحالی کے ساتھ قرض بھی ادا کر دیا گیا،[۱]

سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہے، ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہے، حسب روایت دولت شاہ ۷۶۹ھ میں وفات پائی، لیکن مولوی غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے دیوان سلمان کا ایک نسخہ ۷۹۱ھ کا لکھا ہوا دیکھا، اُس کے خاتمہ میں ایک قطعہ تھا، اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ صاحبِ قطعہ سلمان کا معاصر ہے، قطعہ یہ ہے،

محل آیت اعجاز پارسی، سلمان	کہ کرد ناطقہ پیشِ دمش بہ عجز اقرار
ندید بر سر شاخ گلِ سخن اصلا	بہار طبع چو او عندلیب خوش گفتار
نماز شام دوشنبہ بیاز صفر بودہ	کہ نقد عمر بہ یک دم چو صبح کرد نثار
بساط دار قرار ست سالِ تاریخش	چو کرد میل بہ سوئے بساط دار قرار

اس سے ۷۷۸ نکلتے ہیں،

ناصر بخاری اس زمانہ میں مشہور شاعر تھے، اور درویشانہ وضع رکھتے تھے، حج کو جاتے ہوئے، بغداد میں آئے، خواجہ سلمان کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، ان کو بھی ملنے کا شوق پیدا ہوا، ایک دن سلمان دجلہ کے کنارے عالم آب کی سیر کر رہے تھے، ناصر وہیں پہنچے، سلمان نے مزاج پرسی کے بعد نام و نشان پوچھا، ناصر نے کہا شاعر ہوں، سلمان نے فی البدیہہ یہ مصرع پڑھا،

ع   دجلہ را امسال رفتارے عجب مستانہ ایست

ناصر نے برجستہ دوسرا مصرع پڑھا،

ع   پائے در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ ایست[۲]

---

[۱] یہ تمام تفصیل خزانہ عامرہ میں ہے، [۲] دولت شاہ تذکرہ ناصر بخاری،

سلمان نے گلے سے لگا لیا، اور کئی دن تک مہمان رکھا، ناصر باوجود کمال استادی کے سلمان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے،

عبید زاکانی، ہجو گویوں کا پیشوا، اسی زمانہ میں تھا، ایک دفعہ خواجہ سلمان سفر میں امیرانہ سازوسامان کے ساتھ ایک چشمہ کے کنارے خیمہ زن تھے، اتفاق سے عبید زاکانی کہیں سے آنکلا، سلمان نے پوچھا کدھر سے آنا ہوا، عبید نے کہا قزوین سے، سلمان نے کہا سلمان کا کلام کچھ یاد ہو تو سناؤ، عبید نے یہ شعر پڑھے،

من خراباتیم و بادہ پرست	در خراباتِ مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش	می برندم چو قدح دست بدست

ساتھ ہی کہا، لیکن سلمان بڑے رتبہ کا شخص ہے، یہ شعر اس کے نہیں ہو سکتے، عجب نہیں انکی بیوی کا کلام ہو، سلمان بہت برہم ہوئے، لیکن قیاس سے سمجھا کہ عبید ہے، قسم دیکر پوچھا عبید نے اقرار کیا، اور کہا کہ تم بے دیکھے لوگوں کی ہجویں کرتے ہو، یہ زیبا نہیں، میں بغداد خاص اس غرض سے آیا تھا کہ تم کو ہجو گوئی کا مزہ چکھاؤں، تمھاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے قصداً چھوڑ دیا، سلمان نے شکرگذاری کی، خود گھوڑے پر سوار کرایا، نقدی اور کپڑے دئے، اس پر بھی ہمیشہ عبید کی ہجو گوئی سے ڈرتے رہے[۱]،

کلام پر رائے | سلمان کے کمال شاعری کا تمام اساتذہ نے اعتراف کیا ہے، خواجہ حافظ معاصر تھے، تاہم کہتے ہیں،

سرآمد فضلائے زمانہ دانی کیست	زراہ صدق و یقیں نے زراہ کذب و گماں
شہنشہ فضلا بادشاہ ملکِ سخن	جمالِ ملت و دیں خواجۂ جہاں سلمان

---

[۱] دولت شاہ حالات عبید زاکانی،

سلمان نے شاعری کی عمارت کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی داغ بیل پر قائم کی، اکثر قصائد انہی دونوں کے جواب میں اور اسی طرز میں لکھے ہیں، مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ سلمان کے اکثر مضامین، اساتذۂ قدیم خصوصاً کمال اسمٰعیل سے ماخوذ ہیں، لیکن سلمان نے ان کو اس قدر ترقی دی کہ جائے اعتراض نہیں، اور اس کی یہ مثال ہے،

معنی نیک بود شاہد پاکیزہ بدن	کہ بہر چند در و جامہ دگرگوں پوشند
کسوت عار بود باز پسیں خلعت او	کہ نہ در خوبیش از پیشتر افزوں پوشند
ہنر است اینکہ کہن خرقۂ پشمین ز برش	بدر آرند در و اطلس و اکسوں پوشند

شاعری میں سلمان کا ایک خاص درجہ ہے، یعنی وہ قدما اور متوسطین میں برزخ ہیں، ان کا کلام، قدما کے دور کا خاتمہ اور متوسطین کا آغاز ہے، اُنھوں نے کمال اسمٰعیل اور ظہیر سے زبان کی صفائی اور شستگی لی ہے، اور اس میں ایجاد مضامین کی رنگ آمیزی کی ہے مضمون بندی جو متوسطین اور متاخرین کا مابہ الامتیاز جوہر ہے، گو کمال نے شروع کی لیکن سلمان نے کمال کو پہنچا دیا،

سلمان نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، مثنوی جمشید و خورشید، ان کی مشہور مثنوی ہے، اس کا انداز اشعار ذیل سے معلوم ہوگا،

شگوفہ چو نازک تنے سیم بر	ز صندوق چوبیں برآورده سر
بنفشہ چو مشکیں سر زلف یار	بریده زبار خودش روزگار
برآنم کہ سوسن پریزاده است	زباں آورے خوب و آزاده است
شنیدم کہ پروانہ با بلبلے	ہمی کرد در عشق گل غلغلے
ہمی گفت کیں بانگ و فریاد چیست	ز بیداد معشوق ایں داد چیست
ز من عاشقی باید آموختن	کہ ہرگز نے نالم از سوختن

بہ روز من و حال من کسی مباد　　　که یارم رود و پیش چشم به باد

بباید بداں زندہ بگریستن　　　که بے یار خود بایدش زیستن

سلمان نے اگرچہ، مثنوی، قصیدہ، غزل، سب کچھ لکھا ہے لیکن ان کی شاعری کا اصلی میدان قصیدہ گوئی ہے، ان کے قصائد کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

۱۔ زبان کی صفائی اور روانی کے ساتھ ترکیبوں میں وہ چستی جو ان سے پہلے نہ تھی، اور جو خاص متوسطین شعرا کا انداز ہے، مثلاً

خندہ زد دہنت تنگ شکر پیدا کرد　　　سخن گفت لبت لولوی تر پیدا کرد

بود نایافت میان تو، لیکن کمرت　　　چست بربست میان را و بہ زر پیدا کرد

پردہ از چہرہ برانداز کہ آں زلف سیاہ　　　در سپیدی عذار تو اثر پیدا کرد

باد نوروز نسیم گل رعنا آورد　　　گرد مشک ختن از دامن صحرا آورد

شاخ را باغ بہ نقش دم طاؤس نگاشت　　　غنچہ را باد بہ شکل سر ببغا آورد

لالہ از دامن کوہ آتش موسی بنمود　　　شاخ بیروں ز گریباں ید بیضا آورد

از پے خسرو گل، بلبل شیریں گفتار　　　نغمۂ باربد و صورت نکیسا آورد

سرو را باد صبا منصب بالا بخشد　　　لالہ را لطف ہوا خلعت والا آورد

صبحگا ہے کہ صبا مجمرہ گرداں باشد　　　گل فروکردہ بداں مجمرہ، داماں باشد

جامۂ سرو ز استبرق و سندس بافند　　　کمر کوہ، ز پیروزہ و مرجاں باشد

می کند باد صبا طفل چمن را در خواب　　　ورنہ مہد شجرش بہر چہ جنباں باشد

آب در رود، نواہائے تر و تازہ زند　　　مرغ بر عود سحر ساختہ الحاں باشد

۲۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی جو متوسطین اور متاخرین کا کارنامۂ فخر ہے

چند[1] مثالیں ذیل میں درج ہیں،

دہن و دندان و لب و خال کی تشبیہ

در درج[2] در عقیق لبت نقد جاں نہاد ۔۔۔ جنس نفیس بود، بہ جائے نہاں نہاد

قفلے زلعل بر درآں درج زد لبت ۔۔۔ خالت زعنبر آمد و مہرے برآں نہاد

باریک تر ز مو، کمرت را دقیقۂ ۔۔۔ ناگاہ در دل آمد و اسمش میاں نہاد

یعنی کمر بند کے خیال میں ایک مضمون یاد آیا جو بال سے بھی باریک تھا، کمر بند نے اس کا نام کمر رکھدیا، مطلب یہ ہے کہ معشوق کی کمر درحقیقت ایک باریک خیال ہے،

بعد ازیں از گرہ زلفِ مغاں، کن تسبیح ۔۔۔ پس ازیں از خم ابروی بتاں کن محراب

جدت تشبیہ

خوش برا ہمچو حباب از می گلگون و منہ ۔۔۔ ہیچ بنیاد بریں گنبد گردوں چوں حباب

مدتے گردش ایں دائرہ ما را از ہم ۔۔۔ ہمچو پرکار جدا کرد و بہم باز آورد

حسن تعلیل تشبیہ

غنچہ با پیش دہان تو صبا خنداں یافت ۔۔۔ آں چناں بر دہنش زد کہ دہن پر خوں شد

پا ازیں دائرہ بیروں نہ نہم یکسر مو ۔۔۔ گر سراپاے چو پرکار کنندم بدونیم

دامن از من مکش ای سرو کہ چوں آبِ رواں ۔۔۔ من سری در قدمت مے نہم و می گذرم

۳۔ مخلص یعنی گریز میں نئے نئے پیرائے پیدا کئے، ایک قصیدہ ہے، جس کی ردیف دست ہے اور قافیے ہزار، نگار، بہار، اس میں گریز کا شعر ہے،

سودائی است ورنہ چرا می کند دراز ۔۔۔ زلفت بہ عہد معدلت شہریار دست

تیری زلف سودائی ہے، ورنہ بادشاہ کے زمانہ میں دست درازی کیوں کرتی،

---

[1] اوپر جو اشعار گذرے ان کو مضمون بندی کی حیثیت سے بھی دیکھنا چاہئے [2] یعنی تیرے ہونٹوں نے عاشق کی نقد جان کو موتی کے ڈبہ (دہن) میں رکھا، اس لئے کہ وہ نفیس چیز تھی اور نفیس چیز کو ایسی ہی مخفی جگہ رکھتے ہیں، پھر ہونٹوں نے ڈبہ پر یاقوت کا قفل لگا دیا، اور تل نے آکر عنبر کی مہر کر دی،

ایک قصیدہ میں تشبیب کے بعد کہتے ہیں،

بعد ازیں غم مخور اے دل کہ غم امروز ہمہ ‎ ‎ روزیٔ دشمنِ دارائے مظفر شدہ است

اب اے دل غم نہ کھا، کیونکہ اب تو غم، مظفر شاہ کے دشمن کی خوراک بن گیا ہے،

عیش اور رقص و سرود کا بیان کرتے کرتے کہتے ہیں،

مُطربا راہ[1] طرب خوش بزن امروز کہ نیست ‎ ‎ جز تو در عہد شہنشاہ جہاں راہ زنے

نیست پیدا، دہنت بر رخ، و در دولت شاہ ‎ ‎ فتنہ آں بہ بہ ہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

دور مستی است دریں دور نہ زیبد کہ بود ‎ ‎ .بجز از بخت خداوند جہاں کس بیدار

سایۂ زلف تو بر چشمۂ خورشید فتاد ‎ ‎ خم زلف تو مگر چتر شہ داد گر است

بہت مشکل ردیفیں ایجاد کیں اور ان میں اسی روانی اور صفائی کے ساتھ کہتے جاتے ہیں، گویا معمولی ردیفیں ہیں، اس کے ساتھ ہر جگہ ردیف نہایت خوبی سے نمایاں ہوتی ہے مثلاً

منم امروز بلاے شبِ ہجراں برسر ‎ ‎ کردہ در کار تو چوں شمع دل و جاں برسر

دست آنم نہ کہ در دامنت آویزم و بست ‎ ‎ تا مگر گستردم لطفِ تو داماں برسر

سرو بر پای تو می میرد و مرغانِ چمن ‎ ‎ می کنندش ہمہ شب نالہ و افغاں برسر

ماہ تابانِ تو یابد شبِ مشکیں بر دوش ‎ ‎ سرو رعنائے تو دارد گلِ خنداں برسر

آفتاب تو اگر سایہ ز من باز گرفت ‎ ‎ باز یابند مرا سایۂ سلطاں برسر

مدح کے بعد فخریہ کہتے ہیں،

شعرم از تربیت لطف تو جائی برسید ‎ ‎ کہ نہندش ہمہ اشرافِ خراساں برسر

دعائیہ ملاحظہ ہو،

---

[1] راہ کے معنی راگنی کے بھی ہیں اور راستہ کے بھی، پہلے مصرع میں پہلے معنی لئے ہیں اور دوسرے میں دوسرے معنی،

تا زند خسروِ گل، تختِ زمرد در باغ　　　تاج یاقوت نهد لالۂ نعماں بر سر

تیر باراں کند از روے ہوا قوسِ قزح　　　ہر دم آرد، سپرِ لعل، گلستاں بر سر

شجرِ روضۂ بختِ تو چناں مثمر باد　　　کہ فلک را فگند سایۂ احساں بر سر

اسی طرح دست، پاے، رو وغیرہ ردیفوں میں قصیدے لکھے ہیں،

قطعات | قصیدہ کی افتاد ایسی بُری پڑگئی تھی کہ اس میں بجز معشوق اور ممدوح کی مداحی کے اور کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، جو شعراء اور اور خیالات ادا کرنے چاہتے تھے، وہ قطعات کے ذریعے سے ادا کرتے تھے،

سلمان نے نہایت کثرت سے قطعات لکھے ہیں، اور اُن میں ہر قسم کے عجیب و غریب مضامین ادا کئے ہیں، افسوس ہے کہ سلمان کا جو دیوان بمبئی میں چھپا ہی، اس میں یہی قطعات نہیں ہیں، جو دیوان کی جان ہے، ہمارے پاس جو قلمی مجموعہ ہے، اس میں سے بعض نمونے درج کئے جاتے ہیں،

بادشاہ نے سلمان کو ایک سیاہ رنگ کا گھوڑا عنایت کیا تھا، سلمان نے واپس کر دیا، کہ دوسرے رنگ کا گھوڑا مرحمت ہو، داروغۂ اصطبل نے وہ بھی رکھ لیا، اس پر کہتے ہیں،

شاہا مرا بہ اسپے موعود کردہ بودی　　　در قولِ بادشاہاں قیلے دگر نباشد

اسپے سیاہ و پیرم دادند و من برآنم　　　کاندر جہاں سیاہے زاں پیرتر نباشد

آں اسپ باز دادم، تا دیگرے ستانم　　　بر صورتے کہ کس را زیں سر خبر نباشد

اسپ سیہ بدادم، رنگے دگر ندادند　　　آرے پس از سیاہی رنگے دگر نباشد،

ایک اور قطعہ میں گھوڑے کی ہجو کی ہے،

شاہا امید بود کہ خواہم بدولتت　　　بر مرکبے بلند و جوان زود ان نشست

اسپیم پیر و کاہل و کوتہ ہمی دہند — اسپے نہ آں چناں کہ توانم بدان نشست

چوں کا کلک امر کبے سیہ ست لاغر است — جہل مرکب است براسپے چناں نشست

از بندہ بہتر است بہ سی سال پیر استی (بڑا / بھینک) — گستاخی است بر زبر بہتراں نشست

آنکھوں میں آشوب کی وجہ سے دربار میں جانا بند ہوگیا تھا، اسکی معذرت میں ایک قطعہ لکھا ہے،

خسروا خاکِ درگہ تو مرا است — از غبار زروے نیکو ترا

لیک در عین حالتے کہ مرا است — غیبتم از حضور نیکو تر

حالِ چشم بد است، دور از تو — چشم بد، از تو دور نیکو تر

بدن پر کپڑے نہیں رہے تھے، بادشاہ کو قطعہ لکھا،

ای ز ما مستغنی و از امثالِ ما — بر شما احوالِ ما پوشیدہ نیست

بر تنم پوشیدنی این ست و بس — بندہ را ہیچ از شما پوشیدہ نیست

بادشاہ نے ملبوس خاص بدن سے اتار کر بھیجا اور یہ شعر لکھا،

ہر چند ترا، جامۂ ما پوشیدن — عیب است ولیکن این عیب بپوش

درد پا کی وجہ سے دربار میں نہ جا سکتے تھے، اس کی عذر خواہی کرتے ہیں،

بہر استقبال شاہ از فرق و سر کردم قدم — خواستم تا رو بہ درگاہ ہمایوں آورم

درد پایم گشت از آں مانع کہ آرم درد سر — من کہ درد پای دارم، درد سر چوں آورم

سلمان کی بدعات | سلمان سب سے پہلے شخص ہیں جس نے صنعتِ ایہام کو نہایت کثرت سے برتا،

اس میں اکثر لطیف اور نئے نئے پیرائے پیدا کیے، مثلاً

با قد تو صنوبر در چشم من نیاید — او کیست تا قدت را قائم مقام باشد

کی تواند دلم از موی میانِ تو گذشت — کہ شب تیرہ و تاریک ہمی بر کمر است

چشم سرمستِ ترا عین بلا می بینم — لیکن ابروے تو چیزے ست کہ بالاے بلاست

فتنہ در دور تو بیمار و ضعیف افتادہ است — آن چنان نیست کہ تا حشر تو اندر برخاست

با چنیں عارضہ و ضعف، تمناے نجات — دارم اما ہمہ موقوف اشارات شماست

سرو را باد صبا منصب بالا بخشید — لالہ را لطفِ ہوا خلعت والا آورد

در بست با دلم دہنِ تنگ او بہ ہیچ — او ایں چنیں مضائقہ بسیار می کند

نیست سودائے سر زلفِ تو کار ہمہ کس — کاں طریقے است خم اندر خم و دل گیر و دراز

لیکن اکثر اس قدر بے اعتدالی برتی کہ ضلع جگت کی حد تک نوبت پہونچ گئی سیکڑوں اشعار ہیں جن میں صرف رعایت لفظی سے کام لیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعت مقبول عام نہ ہوئی ورنہ ایران میں بھی بہت سے امانت پیدا ہو جاتے،

غزلیں | سلمان کی غزلیں چنداں مقبول نہیں ہوئیں، ان سے پہلے سعدی کا رنگ عالم کو مسخر کر چکا تھا، اس رنگ میں وہ کہہ نہیں سکتے تھے، اس لئے مضمون آفرینی شروع کی، لیکن لوگوں کے کانوں میں سعدی کی نے گونج رہی تھی، اس لئے اُن کی آواز خالی گئی، سعدی ہی کا رنگ جب خواجہ حافظ نے اختیار کیا اور اس شراب کو اور تیز کر دیا تو ع حریفاں را نہ سرماند و نہ دستار

نمونہ کے طور پر ہم سلمان کی ایک دو غزل اور متفرق اشعار نقل کرتے ہیں،

بہ سر کوے تو سوگند کہ تا سر دارم — نیست ممکن کہ من از حکم تو سر بر دارم

ای کہ در خواب غروری خبری نیست کہ من — ہر شب از خاکِ درت بالش و بستر دارم

ساغرم پر می و می در سر و سر در کفِ دست — تو چہ دانی کہ من امروز چہ در سر دارم

گفتۂ در قدمِ من گہر انداز بہ چشم — اینک از بہر قدمہاے تو گوہر دارم

دل بردو لبرو دردام بلاش اندازد — دل ما برد، کنون تا به کجاش اندازد

چشم فتّانِ تو هر جا که بلا انگیزد — ای بسا کس که دران عرصه بلاش اندازد

هر کجا مرغ دلی بال کشاید، الحال — به کمان خانهٔ ابرو، ز هواش اندازد

خوش کمندی است سر زلف شکن بر شکنش — ده چه خوش باشد اگر بخت به ماش اندازد

عاقل آن است که در پای تو اندازد سر — پیشتر زان که فراقِ تو ز پاش اندازد

بوی گیسوی تو هر جا که جگر سوخته ایست — در پی قافلهٔ باد صباش اندازد

هر کرا درد بیند اخست دوا چاره کند — که کند چارهٔ سلمان چو دواش اندازد

یک شب خیال چشم تو دیدیم با بخواب — زان شب دگر به چشم ندیدیم خواب را

غمزه ات دل می برد چشم تو ام خون می خورد — روز و شب دو در شکار این دو سرا بیا فتاده است

زاهد دهدم تو به ز روی تو زهی روی — هیچش ز خدا شرم، و ز روی تو حیا نیست

من خراباتیم و باده پرست — در خراباتِ مغاں عاشق و مست

می کشندم چو سبو دوش بدوش — می برندم چو قدح دست بدست

ظاهر نمی شود اثر صبح گوئیا — دود دلم در یچهٔ خاور گرفته است

خواجہ حافظ شیرازی

تاریخ شاعری کا کوئی واقعہ اس سے زیادہ افسوسناک نہیں ہو سکتا کہ خواجہ حافظ کے حالاتِ زندگی اس قدر کم معلوم ہیں کہ تشنگان ذوق کے لب بھی تر نہیں ہو سکتے۔ اس پایہ کا شاعر یورپ میں پیدا ہوا، ہوتا تو اس کثرت اور تفصیل سے اس کی سوانحعمریاں لکھی جاتیں کہ اسکی تصویر کا ایک ایک خد و خال آنکھوں کے سامنے آجاتا، لیکن ہمارے تمام تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ان سب کو جمع کر دیا جائے، تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہو کر نہیں نظر آتا، جس قدر تذکرے ہیں، سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں، اور وہی چند واقعات ہیں جن کو باختلاف الفاظ سب نقل کرتے آتے ہیں، ان سب میں عبد النبی فخر الزمانی نے اپنے تذکرہ میخانہ میں جو جہانگیر کے عہد میں ۱۰۳۶ھ میں لکھا گیا، ابتدائی حالات اوروں کی نسبت اچھے بہم پہنچائے ہیں، حبیب السیر میں جستہ جستہ کچھ واقعات ملتے ہیں، خود حافظ کے کلام میں جا بجا واقعات کے اشارے ہیں، ان سب کو ترتیب دے کر اُن کی زندگی کی تصویر کھینچتا ہوں، لیکن دراصل یہ تصویر نہیں بلکہ خاکہ ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ خاکہ بھی نہیں بلکہ محض چند لکیریں ہیں،

نام و نسب خواجہ صاحب کے دادا، اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے، اتابکان شیراز کے زمانہ میں شیراز میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی، خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاء الدین تھا، اُنھوں نے یہاں تجارت شروع کی اور کاروبار کو اس قدر

ترقی دی کہ دولت مندوں میں ان کا شمار ہونے لگا، بہاء الدین نے جب انتقال کیا تو تین بیٹے چھوڑے، ان کو اگرچہ باپ سے بہت بڑا ترکہ ملا تھا، لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ نہ تھا، چند روز میں باپ کی کمائی سب اڑ گئی، بیٹے پریشان ہو کر کہیں کے کہیں نکل گئے، لیکن خواجہ صاحب کمسنی کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ شیراز ہی میں رہ گئے گھر میں فاقے ہونے لگے تو ان کی ماں نے ان کو محلہ کے ایک آدمی کے حوالہ کر دیا، کہ اپنی خدمت میں رکھے اور کھانے پینے کی کفالت کرے، لیکن یہ شخص بد اطوار تھا، خواجہ سن شعور کو پہونچے تو اس کی صحبت ناگوار ہوئی، چنانچہ اس سے قطع تعلق کر کے خمیر بنانے کا پیشہ اختیار کیا، آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے، گھر کے پاس ہی ایک مکتب خانہ تھا، محلے کے سب لڑکے اس میں پڑھتے تھے، خواجہ صاحب اکثر ادھر سے نکلتے تو دل میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوتی، رفتہ رفتہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہو گئے، خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک معلم کو دیتے، بقیہ خیرات کرتے، مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا، معمولی سوادخوانی کی بھی لیاقت حاصل کی، اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، محلے میں ایک بزاز رہتا تھا، وہ سخن سنج اور موزوں طبع تھا، اس مناسبت سے اور ارباب ذوق بھی اس کی دوکان پر آ بیٹھتے تھے، اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے، خواجہ صاحب پر بھی اس مجمع کا اثر ہوا، چنانچہ شاعری شروع کی، لیکن طبیعت موزوں نہ تھی، بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا، رفتہ رفتہ ان کی لغو گوئی کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی، لوگ تفریح کے لئے ان کو صحبتوں میں بلاتے اور لطف اٹھاتے، دو سال تک یہی حالت رہی لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ہوا، ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور

بابا کوہی کے مزار پر جاکر پھوٹ پھوٹ کر روئے، رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے، نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام ہیں، صبح کو اٹھے تو یہ غزل لکھی،

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   و ندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے حسب معمول شعر پڑھنے کی فرمایش کی، انھوں نے وہی غزل پڑھی، سب کو حیرت ہوئی، اور سمجھے کہ کسی سے یہ غزل لکھوالی ہے، امتحان کے لئے طرح دی، انھوں نے طرح میں بھی عمدہ غزل لکھی، اسی وقت گھر گھر چرچا پھیل گیا،

یہ تمام واقعات عبدالنبی نے میخانہ میں لکھے ہیں، اس میں اگرچہ خوش اعتقادی اور وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھادی ہیں، یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے، تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں،

خواجہ صاحب کے کمالات اور شاعری کا چرچا عام ہوا، تو دور دور سے سلاطین اور امرا نے ان کے بلانے کے لئے خطوط بھیجے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں شیراز میں متعدد حکومتیں قائم ہوئیں، اور حسنِ اتفاق یہ کہ فرماں روا عموماً خود صاحبِ علم و فضل اور علما اور شعرا کے نہایت قدردان تھے،

غازان خاں (چنگیز خاں کا پوتا) کے زمانہ میں غازان خاں کی طرف سے محمد شاہ انجو، فارس اور شیراز کا حکمراں مقرر ہو کر آیا تھا، اس کے خاندان میں سے شاہ ابو اسحاق خواجہ حافظ کے زمانہ میں تھا، وہ نہایت قابل اور فاضل تھا، خود شاعر اور شعرا کا مربی اور قدردان تھا، اس کے ساتھ نہایت عیش پرور اور لہو و لعب کا دلدادہ تھا، اس بنا پر اگرچہ ملکی انتظامات بے اصول تھے، لیکن گھر گھر عیش و نشاط کے چرچے

تھے، اور شیراز باغ ارم بن گیا تھا، خواجہ حافظ کی مستانہ غزلوں میں اس دور کا اثر شامل ہی،
شاہ ابو اسحٰق کی عیش پسندی حد سے بڑھ گئی تو ۷۴۶ھ میں محمد مظفر نے اس پر لشکر کشی
کی، فوجیں شہر پناہ کے دامن میں آگئیں، لیکن ابو اسحٰق کو کوئی شخص خبر نہیں کر سکتا تھا، امین الدین
نے کہ مقرب خاص تھا، ابو اسحٰق سے کہا کہ جوش بہار نے شہر کو چمنستان بنا دیا ہی، حضور
ذرا بالاخانہ پر چل کر سیر فرمائیں، ابو اسحٰق نے بالاخانہ پر چڑھ کر دیکھا تو چاروں طرف
فوجیں پھیلی ہوئی ہیں، پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ شاہ مظفر کا لشکر ہی،
مسکرا کر کہا عجب احمق ہے، اس بہار میں یوں اوقات خراب کرتا ہے، یہ شعر پڑھ کر
نیچے اُتر آیا،

بیا تا یک امشب تماشا کنیم | چو فردا شود فکر فردا کنیم

غرض مظفر نے شیراز فتح کر لیا، اور شاہ ابو اسحٰق قتل کر دیا گیا، خواجہ صاحب
کو سخت رنج ہوا، چنانچہ ایک قطعہ لکھا جس میں اس عہد کے تمام ارباب کمال کا تذکرہ کیا،

به عهد سلطنت شاه شیخ ابو اسحٰق | به پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد
نخست بادشهی همچو او ولایت بخش | که گوئی فضل ببرد او به عدل و بخشش و داد
دوم بقیهٔ ابدال شیخ امین الدین | که بود داخل اقطاب و مجمع اوتاد
سوم چو قاضی عادل اصیل ملت و دین | که قاضیی به ازو آسمان ندارد یاد
دگر چو قاضی فاضل عضد که در تصنیف | بنای شرح مواقف بنام شاه نهاد
دگر کریم چه حاجی قوام دریا دل | که او به جود چه حاتم، همی صلا در داد
نظیر خویش به نگذاشتند و بگذشتند | خدای عزّ و جل جمله را بیامرزاد

شاہ ابو اسحٰق کے مرنے کا صدمہ، خواجہ صاحب کو مدت تک رہا، غزلوں میں بھی

بے اختیار ابو اسحاق کا نام زبان پر آجاتا ہے،

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحاقی	خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

ابو اسحاق کے بعد محمد بن مظفر مبارز الدین، شیراز و فارس کا حکمران ہوا، وہ اصل مین خراسان کا باشندہ تھا، جس زمانہ مین سلطان ابوسعید نے وفات پائی اور طوائف الملوکی شروع ہوئی تو اس نے ۷۴۱ھ مین فوجین فراہم کرکے آس پاس کے مواضع پر حملہ شروع کیا، سب سے پہلے یزد پر قبضہ کیا، رفتہ رفتہ اس کے حدود حکومت نہایت وسیع ہوگئے،

محمد بن مظفر نہایت متقشف تھا تخت نشین ہونے کے ساتھ ہر جگہ محتسب مقرر کئے اور تمام میخانے بند کرا دیے، تذکرۂ تقی الدین حسینی مین لکھا ہے کہ خواجہ حافظ نے اسی واقعہ پر یہ غزل لکھی ہے،

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است	بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہان کن	کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است
ز رنگ بادہ بشوئید خرقہا از اشک	کہ موسم ورع و روزگار پرہیز است

خواجہ صاحب کے دیوان مین ایک غزل ہے جو شراب خانون کے بند ہونیکا نہایت پر اثر مرثیہ ہے،

بود آیا کہ در میکدہا بکشایند؟	گرہ از کار فرو بستۂ ما بکشایند
گیسوی چنگ ببرید بمرگ مئ ناب	تا ہمہ مغبچہ ہا زلف دوتا بکشایند
نامۂ تعزیت دختر رز بنویسید	تا حریفان ہمہ خون از مژہ ہا بکشایند
در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند	کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
اگر از بہر دل زاہد خود بین بستند	دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشایند

یہ غزل اسی زمانہ کی ہے،

امیر مبارز الدین کا بیٹا شاہ شجاع جس کا ذکر آگے آتا ہے، اس نے بھی اس موقع پر ایک رباعی لکھی اور خوب لکھی،

در مجلس دہر ساز مستی پست است — نہ چنگ نہ قانون و نہ دف بر دست است

رندان ہمہ ترکِ مے پرستی کردند — جز محتسبِ شہر کہ بے مے مست است

امیر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمان روا ہوا، وہ اس سلسلہ کا سرتاج اور علم و فن کا پشت و پناہ تھا، وہ علم و فن کی گود مین پلا تھا، سات برس کے سن مین تعلیم شروع کی، نو برس مین قرآن مجید حفظ کیا، قاضی عضد سے شرحِ مفصل وغیرہ پڑھی،

حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ کے سننے مین عربی کے چھ سات شعر یاد ہو جاتے تھے، عربی و فارسی مین اس کے مکاتبات اہل ادب مین مقبول عام ہین، علم و فضل کی قدردانی کی وجہ سے اس کا دربار علما و فضلا کا قبلۂ حاجات تھا، شعر بھی کہتا تھا، تقی الدین حسینی نے اپنے تذکرہ مین بہت سے اشعار لکھے ہین، ایک رباعی یہ ہے،

احوال بدم ز خلق پنہان مے کن — واحوالِ جہان بر دلم آسان می کن

امروز خوشم بدار و فردا با من — انچہ از کرم تو می سزد آن می کن

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع سے پہلے میخانون کی جو روک ٹوک تھی شاہ شجاع نے آزادی تجارت کے لحاظ سے اٹھا دی، خواجہ صاحب کے دیوان مین ایک غزل ہے وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے،

غزل یہ ہے،

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

شد آں، کہ اہلِ نظر بر کنارہ می رفتند | ہزار گونہ سخن بر دہان و لب خاموش
بہ بانگ چنگ مگوئیم آں حکایتہا | کہ از شنیدن آں دیگ سینہ میزد جوش
رموز مملکتِ خویش خسرواں دانند | گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

معلوم ہوتا ہے کہ شاہ شجاع کی آزاد پسندی نے میخواروں کو بہت آزاد کر دیا تھا، اس بنا پر خواجہ صاحب اس کے بہت ممنون ہیں، اور جو غزلیں شاہ شجاع کی مدح میں لکھی ہیں، سب میں اس کا بڑے جوش سے تذکرہ کیا ہی،

قسم بہ حشمت و جاہ و جلال شاہ شجاع | کہ نیست باکسم از بہر مال و جاہ نزاع
ببیں کہ رقص کناں می رود بہ نالۂ چنگ | کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

ایک اور غزل میں کہتے ہیں،

چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر | جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع
عمر خسرو طلب ار نفع جہاں می طلبی | کہ وجودیست عطا بخش کریم نفاع
مظہر لطف ازل روشنی چشم امل | جامع علم و عمل جان جہاں شاہ شجاع

خواجہ صاحب نے اگرچہ جا بجا اپنے اشعار میں شاہ شجاع کا نام مداحانہ انداز سے لیا ہے، چنانچہ ایک غزل میں فرماتے ہیں،

خیال آب خضر بست و جام کیخسرو | بہ جرعہ نوشے سلطان ابوالفوارس شد

لیکن شاہ شجاع خواجہ صاحب سے صاف نہ تھا، شجاع کے عہد میں خواجہ عماد فقیہ مشہور عالم تھے، شجاع ان کا نہایت معتقد تھا، (شاہ شجاع کی کیفیت)

خواجہ عماد کی ایک بلی تھی جس کو انھوں نے اس طرح تعلیم دی تھی کہ جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی نماز پڑھنے کے انداز سے جھکتی اور سر اٹھاتی، خواجہ حافظ نے

اسی زمانہ میں ایک غزل لکھی،

صوفی بہ جلوہ آمد و آغاز ناز کرد　　بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

اس غزل میں ظرافت سے یا خواجہ عماد کو ریا کار سمجھ کر خواجہ صاحب نے یہ شعر لکھا،[1]

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز　　غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

غالبًا شجاع کی ناراضی کی ابتدا اسی شعر سے ہوئی، رفتہ رفتہ کشیدگی زیادہ بڑھتی گئی، ایک دن شجاع نے خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ کی کوئی غزل یکساں اور ہموار نہیں ہوتی، ایک شعر میں تصوف، دوسرے میں می پرستی، تیسرے میں شاہد بازی، اس طرح ہر شعر میں رنگ بدلتا جاتا ہے،

خواجہ صاحب نے کہا ہاں، لیکن ان سب برائیوں کے ساتھ بھی میری غزلیں میری زبان سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل جاتی ہیں، بخلاف اوروں کے کہ ان کا قدم شہر کے دروازے سے بھی باہر نہیں نکلتا، شجاع کو اس گستاخانہ اور آزادانہ جواب پر اور زیادہ ملال ہوا،

اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں خواجہ صاحب نے ایک اور غزل لکھی جس کا مقطع تھا،

گر مسلمانی این است کہ حافظ دارد　　وای اگر در پس امروز بود فردائے

شجاع نے یہ غزل سنی تو اس بہانہ سے کہ اس سے قیامت کا انکار یا کم از کم شبہہ پایا جاتا ہے، خواجہ صاحب کو ستانا چاہا، خواجہ صاحب بہت پریشان ہوئے، حسن اتفاق یہ کہ مولانا زین الدین ابوبکر تائبادی حج کو جاتے ہوئے، شیراز سے گذرے، خواجہ صاحب نے ان سے یہ ماجرا بیان کیا، انھوں نے صلاح دی کہ مقطع کے اوپر ایک شعر

---

[1] حبیب السیر

لکھو جس سے مقطع دوسرے کا مقولہ بن جائے، خواجہ صاحب نے اسی وقت کہا،

دی[1] دو یتیم چہ خوش آمد کہ سحرگہ می گفت ‏ ‏ ‏ ‏ با دف و بربط و نے، مغبچۂ ترسائے

شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ مین انتقال کیا، اس کے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا، وہ بھی بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، خواجہ صاحب نے اس کی مبارکباد مین غزل لکھی،

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید ‏ ‏ ‏ ‏ نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید

منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کیا،

منصور اگرچہ نہایت دلیر اور صاحب عزم تھا، لیکن تیمور کی سطوت و عظمت کا غلغلہ تمام عالم مین پڑ چکا تھا، اس لئے چاہا کہ شیراز سے نکل جائے، شہر پناہ کے دروازہ پر پہنچا تو ایک بڑھیا نے کہا کہ ایک مدت تک بادشاہی کر کے رعایا کو مصیبت مین چھوڑ کر کہان بھاگے جاتے ہو؟ منصور وہین سے پلٹا اور صرف دو ہزار فوج سے تیمور پر حملہ آور ہوا اور پے در پے تیمور کی فوجون کو شکست دیتا ہوا قلب فوج تک پہنچ گیا، تیمور پر تلوار کا وار کیا، قماری ایتاق نام ایک افسر نے بڑھ کر تلوار کو سپر پر روکا، چار دفعہ پے در پے تلوار ماری لیکن ہر دفعہ قماری ایتاق سپر ہو جاتا تھا اور تیمور کو بچا لیتا تھا، بالآخر فوجون نے چارون طرف سے ہجوم کر کے منصور کو قتل کر دیا، جس کا خود تیمور کو افسوس رہا، وہ کہا کرتا تھا کہ آج تک معرکون مین کسی کو منصور کا ہمسر نہین دیکھا

تیمور نے خواجہ حافظ کو طلب کیا اور کہا کہ مین نے تمام عالم کو اس لئے ویران کیا کہ سمرقند اور بخارا کو کہ میرا وطن ہے آباد کرون، تم ان کو ایک تل کے عوض مین دئے ڈالتے ہو،

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را ‏ ‏ ‏ ‏ بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انہی فضول خرچیون کی بدولت تو اس فقر و فاقہ تک نوبت

---

[1] حبیب السیر

پہنچی ہے،

خواجہ صاحب کی غزلیں اب، چار دانگ عالم میں پھیل گئیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

بہ شعر حافظ شیراز می گویند و می رقصند　　سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں، چنانچہ عراق، عرب، ہندوستان، ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے بغداد کا فرمان روا سلطان احمد بن اویس تھا جو تمام کمالات کا مجموعہ تھا، مصوری، زرنگاری، کمان سازی، خاتم بندی وغیرہ ان تمام فنون میں بڑے بڑے صناع اس کی شاگردی کا دم بھرتے تھے، موسیقی میں یہ کمال تھا کہ خواجہ عبدالقادر نے اس کی شاگردی اختیار کی اس فن میں اس کی متعدد تصنیفات ہیں، جو مدت تک گویوں کا دستورالعمل رہیں، ان باتوں کے ساتھ سخن سنج اور شاعر تھا[1]، خواجہ صاحب کو اس نے بار بار بلایا، خواجہ صاحب بھی للچائے، چنانچہ بعض غزلوں میں اس کے اشارے بھی ہیں، لیکن پھر بھی رکناباد کی خاک دامن نہیں چھوڑتی تھی چنانچہ خود فرماتے ہیں،

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر　　نسیم باد مصلّٰی و آب رکناباد

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر سلطان احمد کو بھیجی،[2]

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان　　احمد شیخ اویس حسن ایلخانی

خان بن خان شہنشاہ شہنشاہ نژاد　　آن کہ می زیبد اگر جان جہانش خوانی

از گل فارسیم، غنچۂ عیشے نہ شگفت　　حبذا دجلۂ بغداد دمے روحانی

بر شکن کاکل ترکانہ کہ در طالع تست　　دولت خسروی و منصب چنگیز خانی

[1] دولت شاہ　[2] ایضاً

اگرچہ خواجہ صاحب بغداد جا نہ سکے، لیکن شوق کا کانٹا ہمیشہ دل میں کھٹکتا رہا،

چنانچہ جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

رہ نہ بردیم بمقصود خود اندر شیراز　　　خرم آں روز کہ حافظ رہ بغداد کند

دکن میں سلاطین بہمنیہ کا دور تھا، اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا، وہ نہایت قابل اور صاحب کمال تھا، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا، عام حکم تھا کہ عرب وعجم سے جو شاعر آئے، اس کو پہلے قصیدہ پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے تھے، انعام میں دیئے جائیں، اس کی قدر دانیوں کا شہرہ سن کر خواجہ صاحب کو دکن کے سفر کا خیال ہوا، لیکن خیال ہی خیال تھا، یہ خبر میر فضل اللہ کو پہنچی جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر ممتاز تھے، انھوں نے زادراہ بھیجکر طلبی کا خط لکھا، خواجہ صاحب نے اس روپیہ میں سے کچھ بھانجوں کی ضروریات میں صرف کئے، کچھ ادائے قرض میں صرف ہوا، جو باقی رہ گیا اس سے زادراہ سفر کا سامان کرکے شیراز سے روانہ ہوئے، مقام لار میں پہونچے تو وہاں ایک دوست سے ملاقات ہوئی جن کا مال اور اسباب حال ہی میں لٹ گیا تھا، خواجہ صاحب نے جو کچھ پاس تھا ان کے حوالہ کردیا، اور آپ خالی ہاتھ رہ گئے، اتفاق یہ کہ خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمد کازرونی جو مشہور تاجر تھے، ہندوستان آرہے تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خواجہ صاحب کے مصارف کے کفیل ہوئے، لیکن سوداگروں سے ایک نازک مزاج شاعر کی نازبرداریاں کہاں انجام پاسکتی تھیں، خواجہ صاحب کو رنج ہوا تاہم صبر کیا، اور محمود شاہی جہاز پر جو دکن سے ہرمز کے بندرگاہ میں آیا تھا، اور ہندوستان کو واپس

جار ہا تھا، سوار ہوئے، سو، اتفاق یہ کہ جہاز نے لنگر بھی نہیں اٹھایا تھا کہ ہوا کا طوفان اٹھا، خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اتر آئے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کو بھیجی،

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بہ می بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد

شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جان درو درج است
کلاہ دلکش است اما بہ دردِ سر نمی ارزد

بہ کوے میفروشانش بہ جامے در نمی گیرند
زہی سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوے دُر
غلط کردم کہ یک موجش بہ صد من زر نمی ارزد

فضل اللہ نے غزل سلطان محمود بہمنی کی خدمت میں پیش کی اور تمام ماجرا بیان کیا، سلطان نے ملا محمد قاسم مشہدی جو دربار کے فضلا میں سے تھے، ایک ہزار تنکہ طلا دیا کہ ہندوستان کے عمدہ مصنوعات خرید کر کے لیجائیں اور خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش کریں[1]،

سلطان غیاث الدین بن سلطان سکندر فرماں روائے بنگالہ نے بھی جو ۷۶۸ھ میں تخت نشین ہوا تھا، خواجہ صاحب کے کلام سے مستفید ہونا چاہا، چنانچہ طرح کا یہ مصرع بھیجا،

ع ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود

خواجہ صاحب نے یہ غزل لکھ کر بھیجی،

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود
دیں بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

حافظ ز شوق مجلسِ سلطان غیاث دین
غافل مشو کہ کار تو از نالہ می رود

خواجہ صاحب نے ۷۹۳ھ میں وفات پائی، "خاکِ مصلےٰ" تاریخ ہے، جس میں ایک عدد کی کمی ہے،

---

[1] یہ پورا قصہ تاریخ فرشتہ میں ہے،

مصلے ان کا محبوب مقام تھا، اس لئے دفن بھی یہیں ہوئے، سلطان بابر بہادر کے زمانہ میں محمد معمائی نے جو صدارت کی خدمت پر ممتاز تھا، خواجہ صاحب کا مقبرہ بصرف کثیر تیار کرایا جو اب تک قائم ہے، ان کے نام کی مناسبت سے اس جگہ کا نام حافظیہ ہو گیا ہے، ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر ہے، لوگ زیارت کو وہاں جاتے ہیں، وہیں دن بسر کرتے ہیں، کھاتے پکاتے ہیں، چاء پیتے ہیں، کہیں کہیں شراب کا دور بھی چلتا ہو، کوئی رنگین مزاج خواجہ صاحب کے نام کا حصہ خاک پر گرا دیتا ہے، خواجہ صاحب نے پانسو برس پہلے کہدیا تھا،

بر سر تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ　　　　که زیارت گہ رندانِ جہاں خواہد بود

آل و اولاد　خواجہ صاحب کی آزادہ مزاجی اور رندی سے قیاس ہوتا ہے کہ بیوی بچوں کے بکھیڑوں سے آزاد ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شادی بھی کی تھی اور اولاد بھی تھی، صاحبزادہ کا نام شاہ نعمان تھا، وہ ہندوستان میں آئے اور یہیں بہ مقام برہان پور وفات کی، ان کی قبر قلعہ اسیر کے متصل ہے[1]،

دیوان میں ایک قطعہ ہے،

صباح جمعہ بد و سادس ربیع اول　　　　که گشت فرقت آں مہ بکشتیم حاصل

بہ سال ہفتصد و شصت و چہار از ہجرت　　　　چو آب حل بشدم ایں دقیقہ مشکل

غالباً یہ قطعہ بیوی کی وفات میں لکھا ہے، ایک اور قطعہ ہے،

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند　　　　چہ دید اندر خم ایں طاق رنگیں

بجائے لوحِ سیمیں در کنارش　　　　فلک بر سر نہادہ لوحِ سنگیں

[1] خزانۂ عامرہ بہ حوالہ مرآۃ الصفا،

اگرچہ ممکن ہے کہ یہ قطعہ کسی اور جوانہ مرگ کی شان میں ہو، لیکن زیادہ قیاس یہی ہے کہ خود انہی کا کوئی فرزند تھا جو آغاز عمر میں گذر گیا تھا،

خواجہ صاحب کی تحصیل علم اور ان کے مبلغ کا حال تذکرہ نویسوں نے مطلق نہیں لکھا، میخانہ سے جس کا حوالہ اوپر گذر چکا ہی، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ محلہ میں جو مکتب تھا، اس میں تعلیم پائی تھی، لیکن کلام سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ انھوں نے علوم درسیہ کی تحصیل مستعدانہ کی تھی، اکثر غزلوں میں عربی کے مصرعے جس برجستگی سے لاتے ہیں، اس سے ان کی عربیت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

بعض غزلوں میں متعدد شعر، خالص عربی میں ہیں اور سلاست و فصاحت میں جواب نہیں رکھتے،

الا اے ساربان محمل دوست	الی رکبانکم طال اشتیاقی
درونم خون شد از نادیدن یار	الا فیالاہ یام الفراق
بیا ساقی بدہ رطل گرانم	سقاک اللہ من کاس دھاق
نھانی الشیب من وصل العذاری	سوی تقبیل حسنہ و اعتناق

سلام اللہ من کر اللیالی	علی ملک المکارم و المعالی
فجدک راحتی فی کل حین	و ذکرک مونسی فی کلّ حال
سبت سلمی بصدغیھا فوادی	و روحی کل یوم لی تنادی

گر تیغ بارد در کوے آں ماہ	گردن نہادیم الحکم للہ
الصبر مرّ و العمر فان	یا لیت شعری حتام القاہ

جا بجا عربی کے جملے اس خوبصورتی سے پیوند کرتے ہیں کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہے،

چو ہست آب حیاتت بدست تشنہ میر | فلا تمت و من الماء کل شیٔ حی

بخیل، بوے خدا نشنود، بیا حافظ | پیالہ گیر و سخن ورز و الضمان علی

قرآن مجید اور تفسیر کے ساتھ اُن کو خاص لگاؤ تھا، دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ تفسیر کشاف پر حاشیہ بھی لکھا ہے، خود فرماتے ہیں،

ز حافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نکرد | لطائف حکما با کتاب قرآنی

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے، فن قرأت میں کمال تھا، اس کے ساتھ خوش آواز تھے، معمول تھا کہ ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے مقصورہ میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے[1] قرآن مجید حفظ یاد تھا، اور اس مناسبت سے حافظ تخلص رکھا تھا، قرآن دانی پر انکو ناز تھا، چنانچہ اشعار میں جا بجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ | بہ قرآنے کہ اندر سینہ داری

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ | انچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

تجرد اور آزادی عام تذکروں کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب دنیاوی تعلقات سے آزاد تھے، اور سلاطین و امراء سے بے نیاز رہتے تھے، لیکن خود ان کے کلام سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی، ان کے زمانہ میں شیراز کے جو جو فرماں روا گذرے، سب کی مدح میں ان کے قصائد موجود ہیں، اور اسی شان کے ہیں جو عام مدح گویوں کا انداز ہے، شاہ شجاع کی مدح میں نمونہ قصیدہ ہے، جس میں لکھتے ہیں،

دارای دہر، شاہ شجاع، آفتاب ملک | خاقانِ کامگار و شہنشاہِ نوجواں

---

[1] ہفت اقلیم امین رازی،

حکمش رواں چو باد براطرافِ بحر و بر — مہرش رواں چو روح در اعضائے انس و جاں

بے طلعتِ تو جاں نہ گراید بہ کالبد — بے نعمتِ تو مغز نہ بندد در استخواں

سلطان ابو اسحٰق کی مدح میں بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہی،

سپیدہ دم کہ صبا بوی بوستاں گیرد — چمن ز لطفِ ہوا نکتہ بر جناں گیرد

مدح میں لکھتے ہیں،

جمالِ چہرۂ اسلام شیخ بو اسحاق — کہ ملک در قدمش زیب بوستاں گیرد

سلطان محمود کی مدح مثنوی میں لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئیگا، منصور کے وزراء میں سے ایک بد ہمت نے راے دی تھی کہ علماء و فضلا کے وظیفے جن کی تعداد ۷ تومان تھی بند کر دیئے جائیں، منصور نے نہ مانا، اس پر خواجہ صاحب نے قصیدہ لکھا،[۵۱]

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم — یعنی غلام شاہم و سوگند میخورم

منصور بن محمد غازی است حرزِ من — وز این خجستہ نام بر اعدا مظفرم

ای شاہ شیر گیر چہ گردد، اگر شود — در سایۂ تو ملکِ فراغت میسرم

جا بجا خود ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین اور امراء کے نام مدحیں لکھ کر بھیجیں کہ صلہ ہاتھ آئے، چنانچہ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

شاہ ہر موزم نہ دید و بے سخن صد لطف کرد — شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نہ داد

کار شاہاں این چنیں باشد تو ای حافظ مرنج — داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہاد

ایک اور قطعہ میں لکھتے ہیں،

خسروا! دادگرا! شیر دلا! بحر کفا — اے کمالِ تو بہ انواعِ ہنر ارزانی

[۵۱] حبیب السیر،

دردوسال آنچہ بیند و حشم از شاہ و وزیر ہمہ بر بود بیک دم فلک چوگانی

غرض یہ بالکل غلط ہے کہ خواجہ صاحب ہات پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تھے، اور کسب معاش کی کچھ فکر نہ کرتے تھے، البتہ فرق یہ ہے کہ اُن کے تمام معاصرین بلکہ پیشرو نہایت ذلیل اور کمینہ طریقوں سے کام لیتے تھے، انوری، ظہیر فاریابی، سلمان ساوجی کس پایہ کے لوگ تھے لیکن سب کا یہ حال تھا کہ کسی کی مدح لکھی اور اس نے صلہ کم دیا یا دیر لگائی تو ہجو شروع کر دیتے تھے، اور یہاں تک نوبت پہنچاتے تھے کہ تہذیب و شایستگی آنکھیں بند کر لیتی تھی، ظہیر وغیرہ کے کلام میں سیکڑوں قطعے اور قصائد ہیں، جن میں اس درجہ کا گدایانہ ابرام ہے کہ ان کو دیکھکر شرم آتی ہے، خواجہ صاحب اس سفلہ پن سے بری ہیں، وہ مدح لکھتے ہیں، صلہ ملا تو بہتر ورنہ یہ کہہ کے چپ ہو جاتے ہیں کہ تقدیر میں نہ تھا، کبھی کبھی ہلکا سا تقاضا بھی کرتے ہیں، لیکن پیرایہ نہایت لطیف ہوتا ہے، ایک قطعہ میں فرماتے ہیں،

بہ سمعِ خواجہ رساں ای رفیق وقت شناس بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد
لطیفہ بہ میاں آر و خوش بخند انش بہ نکتۂ کہ دلش را دراں رضا باشد
پس آنگہے ز کرم ایں قدر بپرس بہ لطف کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

ایک اور قطعہ میں کس لطف سے کنایہ کیا ہے،

دوش در خواب چناں دید خیالم کہ سحر گذر افتاد بر اصطبل شہم پنہانی
بستہ بر آخور او استر من جو می خورد توبرہ افشاند و بمن گفت مرا میدانی
ہیچ تعبیر نمی دانمش ایں خواب کہ چیست تو بفرمائے کہ در فہم نداری ثانی

یعنی میں نے کل خواب دیکھا کہ میرا گذر شاہی اصطبل خانے کی طرف ہوا، وہاں میرا خچر جو کھار ہا تھا مجھ کو دیکھ کر اس نے توبڑہ کا رخ میری طرف کر کے جھاڑا، اور کہا کہ کیوں

مجھ کو پہچانتے ہو، اس خواب کی مجھ کو کچھ تعبیر نہیں معلوم ہوتی، آپ بڑے نکتہ فہم ہیں، آپ ہی بتائیں کہ اس کی تعبیر کیا ہے، "مطلب یہ کہ گھوڑے کے دانے چارے کا سامان کر دیجئے"

معاشرت ان کے اشعار اور جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی سے بسر کرتے تھے، حافظ قرآن تھے، قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے، لیکن باایں ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے، صاف دل اور بے تکلف تھے، جو دل میں تھا، وہی زبان پر تھا، کوئی برائی کرتے تو ریا کاری کے پردے میں چھپا کر نہ کرتے، رکناباد جو ایک چشمہ ہے، شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہ گئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھکر عالم آب کا لطف اٹھاتے تھے، دوست احباب جمع ہوتے، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اس کا ذکر کرتے ہیں،

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکناباد و گلگشت مصلا را

رکناباد کے منبع کا نام اللہ اکبر ہے، اس کا بھی ذکر جا بجا کرتے ہیں،

فرق است ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست   تا آب ما کہ منبعش اللہ اکبر است

جو ارباب کرم ان سے اچھا سلوک کرتے تھے، اکثر غزلوں میں ان کا ذکر احسانمندی کے ساتھ کرتے ہیں، یہ طریقہ ان کا خاص انداز ہے،

بخواہ جام صبوحی بہ یاد آصف عہد   وزیر ملک سلیمان عماد بن محمود

ع   چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم

دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال   ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

مطرب بہ پردہ سازی، شاید اگر بخواند   از طرز شعر حافظ در بزم شاہزادہ

تو بہ ایں نازکی و سرکشی اے شمع چو گل لائق بزمگہ خواجہ جلال الدینے

با تو گر زیں پس فلک خواری کند باز گو در حضرت دارائے رے

خسرو آفاق بخشش کز عطا نامۂ حاتم زنامش گشت طے

از برائے صید دل در گردنم زنجیر زلف چوں کمند خسرو مالک رقاب انداختی

نصرت الدین شاہ یحیی آنکہ تاج آفتاب از سر تعظیم و قدرت در تراب انداختی

اے در رخِ تو پیدا انوار بادشاہی در فکرتِ تو پنہاں صد حکمتِ الٰہی

عمرے است بادشاہا کز می تہی ست جامم اینک ز بندہ دعویٰ، در محتسب گواہی

انصاف پسندی خواجہ صاحب اگرچہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ اُن کے تمام ہمعصر شعرائی غزل گوئی میں ان کے سامنے ہیچ تھے، تاہم وہ سب کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں، بلکہ اپنے آپ کو ان کا پیرو کہتے ہیں، خواجوِ کرمانی کی نسبت کہتے ہیں،

استاد غزل سعدی است پیشِ ہمہ کس اما دارد غزلِ حافظ طرز و روشِ خواجو

فخر کے جوش میں آکر کہتے ہیں،

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعر سلمانست کہ شعر حافظ شیراز بہ ز شعر ظہیر

لیکن انصاف سے دیکھو تو یہ ان کے لئے ننگ ہے، ظہیر کو غزل میں ان سے کیا نسبت؟

اس زمانہ میں کمال خجند مشہور شاعر اور صاحبِ کمال تھے، خواجہ صاحب سے ان سے بہت راہ و رسم تھی، وہ خواجہ صاحب کی غزلیں منگوایا کرتے اور اپنا کلام اُن کو بھیجتے،

ایک دفعہ اپنی یہ غزل بھیجی،

گفت یار از غیر ما پوشاں نظر گفتم بچشم وانگہے دزدیدہ در ما می نگر گفتم بچشم

غزل میں یہ شعر بھی تھا،

گفت اگر سر در بیابان غمم خواہی نہاد　　تشنگان را مژدہ از ما بر گفتم بہ چشم

خواجہ جب اس شعر پر پہونچے، تو ان پر حالت طاری ہوئی، افاقہ کے بعد کہا کہ واقعی اس شخص کا پایہ بہت بلند ہے،[1]

کلام | تذکرہ می خانہ میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب کا دیوان صرف دو برس میں تیار ہوا، لیکن یہ قطعاً غلط ہے، خلاف قیاس ہونے کے علاوہ غزلوں میں جا بجا جن لوگوں کے نام آتے ہیں ان کے زمانوں میں برسوں کا آگا پیچھا ہے،

خواجہ صاحب کی شہرت اگرچہ صرف غزل میں ہے لیکن انھوں نے قصائد اور مثنویاں بھی لکھی ہیں، اور گو وہ تعداد میں کم ہیں، لیکن ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے تمام اصناف پر ان کو قدرت حاصل تھی، عام خیال ہے کہ جو لوگ غزل اچھی لکھتے ہیں، قصیدہ اور مثنوی اچھی نہیں لکھتے، لیکن خواجہ صاحب کے قصیدے بھی کچھ کم نہیں اور مثنوی میں تو وہ صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے،

سر فتنہ دارد دگر روزگار　　من و مستی و فتنۂ چشم یار

فریب جہاں قصۂ روشن است　　بہ بیں تا چہ زاید، شب آبستن است

ہماں مرحلہ است این بیابان دور　　کہ گم شد درو لشکر سلم و تور

ہماں منزل است این جہانِ خراب　　کہ دیداست ایوانِ افراسیاب

چہ خوش گفت جمشید با تاج و گنج　　کہ یک جو نیرزد سرائے سپنج

مغنی کجائی بہ گلبانگ رود　　بہ یاد آور آں خسروانی سرود

مغنی بزن چنگ بر ارغنوں　　بیر از دلم فکر دنیائے دوں!

[1] دولت شاہ تذکرہ کمال خجندی،

چناں بر کش آہنگ ایں داورے | کہ ناہید چنگی برقص آورے
مغنی دف و چنگ را ساز دہ | بہ یارانِ خوش نغمہ آواز دہ
مغنی کجائی نواے بزن | بہ یکتائی او دو تاے بزن
بیا ساقی ایں نکتہ بشنو زنے | کہ یک جرعۂ مے بہ زدیہیم کے
بیا ساقی آں آب اندیشہ سوز | کہ گر شیر نوشد شود بیشہ سوز
بیا ساقی آں آتشِ تابناک | کہ در دشت می جویدش زیر خاک
بدہ تا بگویدز آواز نے | کہ جمشید کے بود و کاؤس کے
می دہ کہ بدنام خواہم شدن | خرابِ می و جام خواہم شدن
بیا ساقیا مے کہ تا دم زنیم | قلم بر سر ہر دو عالم زنیم
سبک باش و رطل گرانم بدہ | دگر فاش نتواں نہانم بدہ
کہ ایں چرخ وایں انجم و آبنوس | بسے یاد دارد ز بہرام و طوس
بدہ ساقی آں آب افسردہ را | بیا زندہ ساز ایں دلِ مردہ را
کہ ہر پارہ خشتے کہ بر منظری است | سر کیقبادی و اسکندری است
ہر آں گل کہ در گلستانی بود | ہمہ عارض دلستانی بود
ہر آں شاخ سروے کہ در گلشنے است | قد دلبر و زلفِ سیمیں تنے است

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ سے پیچھے نہیں لیکن انکا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے، یہ عموماً مسلّم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہوسکا، متوسطین اور متاخرین، غزل کے بزم آرا ہیں، لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا،

صائب

روواست صائب اگر نیست اُزرہ دعویٰ | تتبع غزلِ خواجہ گرچہ بے ادبی است

صائب چہ تواں کرد بہ تکلیفِ عزیزاں | ورنہ طرفِ خواجہ شدن بے بصری بود

ع چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد،

سلیم

سلیم معتقد نظم خواجہ حافظ باش | کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

عرفی نے کبھی غزل میں کسی استاد کا نام نہیں لیا، تاہم کہتا ہے،

عرفی

برآں تتبع حافظ روا است چوں عرفی | کہ دل بکاو دود درد سخنوری داند

خواجہ صاحب کی غزل گوئی

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی، ساتویں صدی کا چمن انہی بلبلوں کے زمزموں سے گونج رہا تھا کہ سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی نے نغمہ سنجی شروع کی، سعدی اور خسرو کے آگے اگرچہ ان کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا، لیکن یہ دونوں اور اصنافِ سخن یعنی قصیدہ اور مثنوی میں اس قدر ممتاز اور نام آور تھے کہ اس اثر نے غزل میں بھی کام دیا، اس کے ساتھ ان لوگوں نے غزل میں کچھ جدتیں بھی پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق تھیں، اس لئے اور بھی مدد ملی اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت نے بھی ساتھ دیا، سلمان بغداد کے ملک الشعرا اور خواجو ابواسحٰق فرماں روائے شیراز کے دربار میں سب سے ممتاز تھے،

اساتذہ کا تتبع

غرض خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا، خواجہ صاحب نے دونوں کا زمانہ پایا تھا، اور اتفاق یہ کہ خواجو نے جب ۷۵۳ھ میں شیراز میں وفات پائی، تو دفن اسی مقام یعنی اللہ اکبر میں ہوئے جو حافظ کی خاص سیرگاہ تھی، اور جس کی شان میں فرماتے ہیں،

فرق است زآب خضر کہ ظلمات جائے اوست | تا آب ماکہ منبعش اللہ اکبر است

خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں، ع

دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو

جو غزلیں ہم طرح ہیں ان میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں، سلمان کی غزلوں پر بھی اکثر غزلیں ہیں اور ان سے بھی اس قدر جا بجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے یہانتک کہ بعض بعض غزلیں دونوں کے دیوان میں موجود ہیں، اور ایک نقطہ کا فرق نہیں، اسی بناء پر بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ کاتبوں نے حافظ خواجو اور سلمان کے دیوانوں میں نہایت خلط ملط کر دیا ہے۔

خواجہ صاحب کے کلام کا خواجو وغیرہ سے موازنہ کرنا اگرچہ اس لحاظ سے غیر ضروری ہے کہ آج کسی کو حافظ کی ترجیح میں کلام نہیں، بلکہ خواجہ صاحب کی غزلوں کے مقابلہ میں خواجو اور سلمان کی غزلوں کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، لیکن شاعری کی تاریخ کا یہ ایک ضروری باب ہے کہ شاعری کی ترقی کے تدریجی مدارج دکھائے جائیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ سعدی، خواجو اور سلمان ہی کے خاکے ہیں، جن پر حافظ نے نقش آرائیاں کی ہیں، اس لئے انکے باہمی امتیازات اور تدریجی ترقی کا دکھانا شعر العجم کا ضروری فرض ہے،

سعدی اور خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے، خواجو نے دنیا کی بے ثباتی، وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا، اکثر غزلیں پوری کی پوری صرف دنیا کی بے ثباتی پر ہیں، مثلاً یہ غزل

پیش صاحب نظران ملک سلیماں باد است	بلکہ آن است سلیماں کہ ز ملک آزاد است
ایں کہ گویند کہ برآب نہادہ ست جہاں	مشنوای خواجہ! کہ چوں درنگری بر باد است

یا مثلاً یہ غزل

مشو بہ ملکِ سلیمان و مالِ قارون شاد　　کہ مال و ملک بود در رہ حقیقت باد

خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے،

سلمان کا خاص مذاق، مضمون آفرینی، جدت تشبیہ، اور صنائع لفظی ہے، خواجہ حافظ بھی ان چیزوں کو لیتے ہیں، لیکن یہ اُن کا خاص انداز نہیں، سعدی، خسرو اور حسن کا کلام ہمہ تن عشق، سوز و گداز، بیان شوق، ناامیدی اور حسرت ہے، خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں، چنانچہ اکثر غزلیں ان کی غزلوں پر لکھی ہیں، لیکن وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور ولولہ خیز طبیعت رکھتے تھے، اس لیے درد و غم کے نوحے ان سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے،

خواجہ صاحب نے سعدی، خواجو، سلمان کے جواب میں جو غزلیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کے فرقِ مراتب کا اندازہ ہو سکے،

خواجو	حافظ
خرقہ، رہنِ خانۂ خمّار دارد پیرِ ما	دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
اے ہمہ رنداں مریدِ پیرِ ساغر گیر ما	چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

خواجہ صاحب کا مطلع ہر پہلو سے خواجو کے مطلع سے بڑھا ہوا ہے، اور یہ محتاج اظہار نہیں،

خواجو	حافظ
گر شدیم از بادہ، بدنام جہاں تدبیر چیست	در خراباتِ مغاں ما نیز ہمدستاں شدیم
ہمچنیں رفت است از روزِ ازل تقدیرِ ما	کایں چنیں رفت ست از روزِ ازل تقدیر ما

خواجہ صاحب نے خواجو ہی کے مضمون اور الفاظ کو الٹ پلٹ کر دیا ہے، اور

افسوس ہے کہ کچھ بھی ترقی نہیں کی، دوسرا مصرع تو حرف حرف خواجو ہی کا مصرع ہی پہلا مصرع خواجو کا زیادہ برجستہ اور صاف ہی اس کے ساتھ تدبیر اور تقدیر کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے آیا ہے، خواجہ صاحب نے یہ حسن بھی کھو دیا، خواجو کے مصرع کا مطلب یہ ہی کہ شراب نے اگر ہم کو رسوا کر دیا تو علاج کیا؟ تقدیر یونہی تھی، خواجہ صاحب کہتے ہیں ہم کو بھی مغوں کا ساتھ دینا پڑا، تقدیر میں یہی لکھا تھا، خواجہ صاحب کو مضمون کے لحاظ سے بھی کچھ ترجیح نہیں،

خواجو	حافظ
ما دلِ دیوانہ در زنجیر زلفت بستہ ایم	عقل اگر داند کہ دل دربند زلفش چون خوش است
اے بسا عاقل کہ شد دیوانۂ زنجیرِ ما	عاقلاں دیوانہ گردند از پے زنجیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے یہ بات اضافہ کی کہ عاقلوں کے دیوانۂ زنجیر ہونے کی وجہ ظاہر کر دی یعنی یہ کہ زلف کی قید کس قدر پر لطف ہے، اس کے علاوہ خواجہ صاحب کا پہلا مصرع زیادہ صاف اور ڈھلا ہوا ہی، لیکن خواجو کے مصرع میں ایک خاص نکتہ ہے جو خواجہ صاحب کے ہاں نہیں، خواجو کہتا ہے کہ میرا دیوانہ دل زنجیر زلف میں پھنس گیا، یہ وہ زنجیر ہے کہ عاقل بھی اس کے دیوانے بن گئے، جس سے اس بات کی معذرت نکلتی ہے، کہ جب عقلا اس زنجیر میں پھنستے ہیں تو دیوانہ کا پھنسنا کیا تعجب ہے؟ اس کے علاوہ دیوانوں کو عموماً زنجیر میں باندھتے ہیں، اس لئے دل کا زلف میں گرفتار ہونا قدرتی بات تھی، خواجہ صاحب نے دل کی دیوانگی کا کچھ ذکر نہیں کیا، اس لئے گرفتاری کی کوئی معقول وجہ نہیں، خواجو کے ہاں عاقل و دیوانہ کے لفظی تقابل نے جو لطف پیدا کیا ہی، خواجہ صاحب کے ہاں وہ بھی نہیں،

حافظ	خواجو
تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جاناں خموش	از خدنگ آہ عالم سوز ما غافل مشو
رحم کن بر جان خود، پرہیز کن از تیر ما	کز کمانِ بزم زخمش، سخت باشد تیر ما

مضمون وہی خواجو کا ہے، خواجہ صاحب نے کوئی ترقی نہیں دی، بلکہ اس کے لطف کو کم کر دیا، خواجو نے معشوق سے صرف اس قدر کہا تھا کہ "غافل مشو"، خواجہ صاحب "خاموش اور رحم کن بر جان خود"، سے معشوق کو خطاب کرتے ہیں جو آدابِ عشق کے بالکل خلاف ہے،

حافظ	خواجو
نسیم صبح سعادت برآں نشاں کہ تو دانی	دیا صبا خبرے کن مرا ازاں کہ تو دانی
گذر بکوی فلاں کن دراں زماں کہ تو دانی	بداں زمیں گذرے کن بداں زماں کہ تو دانی
تو پیک حضرت شاہی مراد دو دیدہ بہ راہ ہست	چو مرغ در طیران آئی و چوں بہ اوج رسی
بہ مردمی نہ بفرمان بیر ہر آں کہ تو دانی	نزول ساز دراں آشیاں کہ تو دانی
بگو کہ جانِ ضعیفم، ز دست رفت خدا را	چناں مرد کہ غبارسے بدو رسد ز گذارت
ز لعل روح فزاست بہ بخش ازاں کہ تو دانی	بداں طرف چو رسیدی چناں کہ تو دانی
من ایں دو حرف نوشتم چناں کہ غیر نہ دانست	
تو ہم ز روی کرامت بخواں چناں کہ تو دانی	

دونوں نے صبا کو قاصد بنایا ہے اور اس کو ہدایتیں کی ہیں، خواجو نے صبا کو مرغ سے اور معشوق کے گھر کو آشیانہ سے تشبیہ دیکر بدمزگی پیدا کر دی، لیکن اخیر کا شعر نہایت لطیف ہے، یعنی اے صبا اس طرح آہستہ اور مودب جانا کہ گرد تک نہ اٹھنے پائے،

اور بتانے کی کیا حاجت ہے؟ تو تو خود آداب داں ہے جیسا مناسب سمجھنا کرنا،

خواجہ صاحب کا مطلع نہایت برجستہ ہے، صبا کے بجائے نسیم اور اس پر صبحِ سعادت کی قید نے لطف پیدا کر دیا ہے، خواجو کے مصرع میں زمین و زماں کا جو لفظی تناسب تھا، تکلف سے خالی نہ تھا، اس لئے خواجہ صاحب نے اس کو اڑا دیا "بداں زمین" کے بجائے "بہ کوی فلاں" کا کنایہ زیادہ لطیف ہے، دوسرا شعر بھی نہایت لطیف ہو، کہتے ہیں کہ تو شاہی قاصد ہے، میں تجھکو حکم نہیں دے سکتا، البتہ مروت اور انسانیت کے اقتضا سے توقع رکھتا ہوں، اخیر شعر اور زیادہ پر مزہ ہے معشوق سے کہتے ہیں، کہ میں نے یہ دو سطریں اس طرح چھپا کر لکھی ہیں کہ غیروں کو خبر نہیں ہونے پائی، تم بھی اسی طرح پڑھنا، جیسا مناسب ہو یعنی کسی کو خبر نہ ہونے پائے،

خواجو	حافظ
دل دریں پیر زنِ عشوہ گرِ دہر مبند	مجو درستی عہد از جہانِ بے بنیاد
کیں عروسے است کہ در عہد بسے اماداست	کہ ایں عجوزہ، عروسِ ہزار داماد است

مضمون وہی ہے، لیکن خواجہ صاحب کی بندش میں ذرا حسن ہے، پہلے مصرع میں صرف اس قدر کہنا چاہیے، کہ دنیا میں دل نہ لگاؤ پھر اسکی وجہ بتانی چاہیے، کہ یہ ایک ایسی عجوزہ ہے جو ہزاروں کے نکاح میں رہی، خواجو نے پہلے ہی کہدیا کہ عجوزۂ دہر سے دل نہ لگاؤ حالانکہ جب پہلے ہی عجوزہ کہہ دیا تو اس دلیل کی ضرورت نہیں رہی کہ وہ کثیر الازواج ہے، کیونکہ بڑھیا سے یوں بھی انسان کو رغبت نہیں ہوتی، خواجہ صاحب نے پہلے دنیا کی برائی کو مطلق حیثیت سے بیان کیا پھر ایک ساتھ نفرت کی دو وجہیں بتائیں یعنی یہ بوڑھی ہے اور کثیر الازواج بھی ہے،

خواجو

منزل اریار قرین است چہ دوزخ چہ بہشت
سجدۂ گر بہ نیاز است چہ مسجد چہ کنشت

حافظ

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

خواجو کے شعر کو خواجہ صاحب کے شعر پر ترجیح ہے، اول تو خواجو نے مطلع میں جس میں قافیہ کی پابندی ہو جاتی ہے، ایسے وسیع مضمون کو ادا کیا ہے، اس کے ساتھ دونوں عالم کی دونوں چیزیں لے لیں، یعنی دوزخ اور بہشت، مسجد اور کنشت، ان سب کے علاوہ مسجد کی تنکیر اور تعمیم اور نیاز کی قید نے جو لطف پیدا کیا ہے، خواجہ صاحب کے ہاں مطلق نہیں، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ مسجد اور گرجا دونوں عشق کے گھر ہیں، اور ایک ہی چیز ہیں، خواجو دونوں کو مخالف تسلیم کر کے کہتا ہے کہ سجدۂ نیاز وہ چیز ہے کہ مخالف اور موافق ہر جگہ ادا کیا جا سکتا ہے، اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سجدۂ نیاز گرجا میں بھی ادا کیا جائے تو مسجد بن جائے،

خواجو

کے بر کنم دل از رخِ جاناں کہ مہر او
با شیر در دل آمد و با جان بدر شود

حافظ

عشق تو در وجودم و مہر تو در دلم
با شیر در بدن شد و با جاں بدر شود

خواجہ صاحب نے جس طرح اس مضمون کو ترقی دی ہے محتاجِ اظہار نہیں،

خواجو اور خواجہ صاحب کی غزلیں اکثر ہم طرح ہیں، اختصار کے لحاظ سے ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں،

خواجہ صاحب نے سلمان کی اکثر غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں، جن میں کہیں سلمان کی تقلید کی ہے، کہیں سلمان کے مضمون کو لے کر زیادہ دلکش پیرایہ میں ادا کیا ہے، کہیں سلمان کے آئینہ کو زیادہ جلا دیدی ہے،

حافظ	سلمان
عیداست وموسم گل ساقی بیار بادہ	آوازۂ جمالت تا در جہاں فتادہ
ہنگامِ گل کہ دیداست بے می قدح نہادہ	خلقے بہ جستجویت سر در جہاں نہادہ

دونوں مطلع بالکل الگ الگ ہیں، ان میں کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا،

حافظ	سلمان
گل رفت اے حریفاں غافل چرا نشنید	سودای زہد خشکم بر باد دادہ حاصل
بے بانگ رود چنگے، بے بادہ وجام وبادہ	مطرب بزن ترانہ، ساقی بیار بادہ

سلمان کا دوسرا مصرع نہایت برجستہ اور مستانہ ہے،

حافظ	سلمان
زیں زہد وپارسائی بگرفت خاطرِ من	مائیم بستہ دل را در لعل دلکشایت
ساقی پیالۂ دہ تا دل شود کشادہ	آں لب بہ خندہ بکشا تا دل شود کشادہ

صنعت اضداد کا دونوں نے لحاظ رکھا ہے، لیکن سلمان کے الفاظ زیادہ صاف ہیں، یعنی بستن وکشادن، گرفتن اور کشادن میں بھی گو یہی صنعت ہے، لیکن گرفتن کے یہ اصلی معنی نہیں ہیں، بلکہ محاورہ نے یہ معنی پیدا کئے ہیں، اس کے علاوہ دل کے کھلنے کی توجیہ سلمان کے ہاں لفظاً و معنیً دونوں لحاظ سے زیادہ روشن ہے، یعنی تو لب کھول تو ہمارا دل بھی کھلے کیونکہ ہمارا دل تیرے لبوں میں بندھا ہوا ہے، پیالہ سے دل کھلنے میں یہ بات نہیں،

حافظ	سلمان
در مجلسِ صبوحی، دانی؟ چہ خوش نماید	سودائیانِ زلفت گرد تو حلقہ بستہ
عکس عذار ساقی بر جامِ می فتادہ	شوریدگانِ مویت در یک دگر فتادہ

مضمون کے لحاظ سے دونوں شعر الگ ہیں، البتہ قافیہ مشترک ہے اور سلمان کے ہاں اچھا بندھا ہے، یوں بھی سلمان کا شعر اچھا ہے،

سعدی اور حافظ

شیخ سعدی کے جواب میں بھی گو اکثر غزلیں ہیں، لیکن درحقیقت دونوں کے راستے الگ الگ ہیں، اس لئے ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا، تاہم متعدد مضامین خواجہ صاحب نے شیخ سعدی سے لئے ہیں، لیکن ان کے اسلوب کو اس طرح بدل دیا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ موتی انہی قطروں کے بنے ہیں، مثالیں جدت اسلوب کے عنوان میں آئیں گی،

خواجہ صاحب کی خصوصیات

تم نے دیکھا! خواجہ صاحب اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند رتبہ نہیں ہیں، ان کی شاعری کے مہمات مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں، بلکہ خیام کے ابر قلم کے رشحات ہیں، بایں ہمہ اُن کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا، اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو، سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں، اس کا کچھ سبب ہوگا، اور وہی خواجہ صاحب کی خصوصیاتِ شاعری ہیں، یہ خصوصیات اگرچہ درحقیقت ذوقی اور وجدانی ہیں جو صرف مذاقِ سلیم سے تعلق رکھتے ہیں، تاہم جس قدر ضبط تحریر میں آسکتا ہے وہ حسب ذیل ہے،

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ہے، ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے، لیکن خواجہ صاحب کا کلام ع "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کا مصداق ہے،

ان میں بعض اوصاف ایسے بھی ہیں جو اوروں کے کلام میں اس درجہ تک نہیں پائے جاتے ہیں مثلاً روانی، برجستگی اور صفائی، یہ وصف سعدی اور خسرو کا بھی مابہ الامتیاز ہے لیکن یہ ایسی چیز ہے، جس کے مدارج کی حد نہیں، ممکن ہے کہ ایک شعر خود نہایت رواں اور صاف و شستہ ہو، لیکن ایک اور شعر اس سے بھی بڑھ کر ہو، اور اس سے

بھی بڑھ کر کوئی اور شعر ہو، جس طرح نغمہ اور حسن کہ ان کے مدارجِ ترقی کی کوئی حد نہیں،

ایک اور چیز جو خواجہ صاحب کی شاعری کا نہایت نمایاں وصف ہے جوشِ بیان ہے، اسی طرح تنوعِ مضامین بھی، ان سے پہلے اس قدر نہ تھا، چنانچہ ہم ان کے کلام کے تمام اوصاف کو الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

جوشِ بیان فارسی شاعری، باوجود ہزاروں گوناگوں اوصاف اور خیالات کے جوشِ بیان سے خالی ہے، فردوسی اور نظامی کے ہاں خاص خاص موقعوں پر جوشِ بیان کا پورا زور ہے، لیکن وہ اوروں کے خیالات اور واردات ہیں، خود شاعر کے حالات اور جذبات نہیں، بخلاف اس کے خواجہ حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں، وہ خود ان کے واردات اور حالات ہیں، اس لئے اُن کو وہ اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے، جوشِ بیان کے لئے کسی مضمون یا کسی خیال کی خصوصیت نہیں، ہر مضمون اور ہر خیال جوش کے ساتھ ظاہر کیا جا سکتا ہے، البتہ اختلافِ نوعیت کی وجہ سے صورتیں بدل جاتی ہیں، مثلاً شاعر جوشِ مسرت کا بیان کرتا ہے تو اس انداز سے کرتا ہے کہ گویا آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، قہر اور غضب کا بیان ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا مرقع الٹ دیگا، دنیا کی بے ثباتی کا مذکور ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالم ہیچ ہے، غصہ اور غضب کا مضمون ہے تو نظر آتا ہے کہ منہ سے انگارے برس رہے ہیں،

خواجہ صاحب نے سیکڑوں گوناگوں خیالات ادا کئے ہیں اور جس خیال کو ادا کیا ہے، اس جوش کے ساتھ کیا ہے کہ سننے والے پر وہی اثر طاری ہو جاتا ہے جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتا ہے،

زمانہ کی بے اعتباری	اعتمادے نیست بر دورِ جہاں — بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم
	سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود — کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند
استقلال و ثابت قدمی	حلقۂ پیر مغاں ز ازل در گوش است — ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود
وجد و ذوق	در نمازم خم ابروئے تو ام یاد آمد — حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد
فسانۂ عشق کی پائداری	از حدیث سخن عشق ندیدم خوشتر — یادگاری کہ دریں گنبد دوار بماند
واعظوں کے وعظ اور پند کی تحقیر	بادہ خور غم مخور و پند مقلد مشنو — اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن
معشوق کی دلفریبی۔	می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد — محراب ابروی تو حضور نماز من
مستی کی تمنا	زاں پیشتر کہ عالم فانی شود خراب — مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن
کمال کسی پر محدود نہیں	فیض روح القدس ار باز مدد فرماید — دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد
ہمہ تن وفا و محبت ہونا	ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس
اعلان راز	داستاں در پردہ می گویم ولے — گفتہ خواہد شد بہ دستاں (زور سے) نیز ہم
	محتسب داند کہ حافظ می خورد — آصف ملک سلیماں نیز ہم
ظاہر و باطن یکساں ہونا	رنگ و تزویرے پیش ما نبود — شیر سرخیم و افعیِ سیہیم
معشوق کی روح افزائی	گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر — تا سحر گہ ز کنار تو جواں برخیزم
جود و کرم کی ترغیب	ای نور چشم من سخنے ہست گوش کن — تا ساغرت پر است بنوشان و نوش کن
غریبوں کے ستانے کا انجام	بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات — با دردکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد
سوز دل کا اثر	سوز آہ سینۂ سوزانِ من — سوخت ایں افسردگانِ خام را

جوش بیان کا اصلی موقع وہاں آتا ہے، جہاں کسی خاص جذبہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً رنج و غم، فخر و ناز، غیظ و غضب، عشق و محبت،

خواجہ صاحب پر رندی اور سرمستی کا جذبہ غالب تھا، ان کے تمام کلام میں یہ جذبہ اس جوش اور زور کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کی ہزار سالہ زندگی میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی، اس کے اندازہ کرنے کے لئے پہلے ایک رند سرمست کی حالت کا تصور باندھو، کہ جب وہ مستی کے جوش وخروش میں ہوتا ہے، تو اس کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں، وہ مزے میں آکر پکارتا ہے کہ مجھ کو نام و ننگ کی کچھ پروا نہیں، ساقی پیالہ پر پیالہ دیئے جا، اور کسی سے نہ ڈر، زاہد کیا جانتا ہے کہ جام میں کیا کیا گوناگوں عالم نظر آتے ہیں، مطرب سے کہدو یہ ترانہ گائے کہ تمام دنیا پر میری حکومت ہے، کل خاک میں جانا ہی ہے، آج کیوں نہ عالم میں غلغلہ ڈال دوں، تم مجھے حقیر سمجھتے ہو، شراب خانہ میں آؤ تو تم کو نظر آئے کہ میری کیا شان ہے؟ میرے ہاتھ میں جو پیالہ ہے جمشید کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، میں شراب آج سے نہیں پیتا، مدت سے آسمان اس غلغلہ سے گونج رہا ہے، صوفی اور واعظ رازدانی کی شیخیاں بگھارتے ہیں، حالانکہ جو کہتے ہیں مجھی سے سن لیا تھا، یہ عالم لطف اٹھانے کے لئے کافی نہیں، آؤ آسمان کی چھت توڑکر ایک اور نیا عالم بنائیں خواجہ صاحب ان خیالات کو اسی جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں، جس طرح ایک سرمست کے دل میں آتے ہیں،

ابھی یہ بحث چھوڑ دو کہ خواجہ صاحب کی شراب، معرفت کی شراب ہے یا انگور کی مستی دونوں میں ہے، اور یہاں صرف مستی سے غرض ہے،

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم	فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم
آؤ پھول برسائیں اور شراب پیالہ میں ڈالیں	آسمان کی چھت توڑ ڈالیں اور نئی بنا ڈالیں،
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد	من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

اگر غم عاشقوں کے مقابلہ کے لئے فوج تیار کرے، تو ہم اور ساقی دونوں ایکا کر کے اسکی جڑ اکھاڑ کر پھینکدیں

بچہ در دست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

رند مزے میں آکر جب گاتا ہے تو دونوں طرف ہاتھ جھٹکتا ہے، پاؤں زمین پر دے دے مارتا ہے، سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیتا ہے، یہ شعر بعینہ اس حالت کی تصویر ہے،

ساقی بہ نور بادہ بر افروز جام ما مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکامِ ما

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم اے بیخبر ز لذتِ شُرب مدام ما

ساقیا برخیز و در دہ جام را خاک بر سر کن غم ایام را

گرچہ بد نامی است نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را

تا زمی خانہ و مے نام و نشاں خواہد بود سر ما خاکِ رہ پیر مغاں خواہد بود

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است ما ہمانیم کہ بودیم و ہماں خواہد بود

بر سر تربت ما چون گذری ہمت خواہ کہ زیارت گہِ رندانِ جہان خواہد بود

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

حاصل کارگہہ کون و مکاں اینہمہ نیست بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں اینہمہ نیست

ساقی بیار بادہ و با مدعی بگو انکار ما مکن کہ چنیں جام جم نداشت

خوش وقت رند مست کہ دنیا و آخرت از دست داد و ہیچ غم بیش و کم نداشت

ما می بہ بانگ چنگ نہ امروز می خوریم بس دیر شد کہ گنبد چرخ ایں صدا شنید

سر خدا کہ عارف و سالک بکس نگفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ساقی بیا کہ عشق ندا می کند بلند کاں کس کہ گفت قصہ ما ہم ز ما شنید

من ترک عشق بازی و ساغر نمی کنم صد بار توبہ کردم و دیگر نمی کنم

من رند و عاشق و آنگاه توبه
استغفر اللہ استغفر اللہ

ما زہد و تقوی کمتر شناسیم
یا جام بادہ یا قصہ کوتاہ

شراب و عیش نہاں چیست کار بے بنیاد
زدیم بر صفِ رندان و ہرچہ بادا باد

سخن درست بگویم نمی توانم دید
کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

نہ قاضیم نہ مدرس نہ مفتیم نہ فقیہ
مرا چہ کار کہ منعِ شراب خوارہ کنم

با من خاک نشیں خیز و سوئے میکدہ آئے
تا بہ بینی کہ در آں حلقہ چہ صاحب جاہم

اے خوشا حالت آں مست کہ در پائے حریف
سر و دستار نہ داند کہ کدام اندازد

خوش تر از فکرِ می و جام چہ خواہد بودن
چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

پیر میخانہ چہ خوش گفت معمای دوش
از خطِ جام کہ فرجام چہ خواہد بودن

بادہ خور غم مخور و پند مقلد مشنو
اعتبار سخن عام چہ خواہد بودن

غم دنیای دنی چند خوری بادہ بخور
حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد

ساقی بیا کہ شد قدحِ لالہ پر زمے
طامات تا بچند و خرافات تا بکے

شیخم بہ طنز گفت حرام است می مخور
گفتم برو کہ گوش بہر خر نمی کنم

کہ برد بہ نزد شاہاں ز من گدا پیامے
کہ بکوی می فروشاں دو ہزار جم بہ جامے

صبح است ژالہ می چکد از ابر بہمنی
برگِ صبوح ساز و بزن جام یک منی

ساقی بہوش باش کہ غم در کمینِ ماست
مطرب نگاہ دار ہمیں رہ کہ میزنی

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود
ز زہد ہمچو توئی یا ز رندی چو منی

ما مرد زہد و توبہ و طامات نیستم
با ما بہ جام بادۂ صافی خطاب کن

زاں پیشتر کہ عالمِ فانی شود خراب — مارا بہ جام بادۂ گلگوں خراب کن

یہ مضامین کہ دنیا چار دن کی چاندنی ہے، اس کے لئے جھگڑوں اور بکھیڑوں میں پڑنے سے کیا حاصل، کھاؤ پیو، لطف اٹھاؤ اور دنیا سے گذر جاؤ، سو سو طرح بندھ چکے ہیں اور خیام کی تمام شاعری کی یہی کائنات ہے، لیکن خواجہ صاحب کے یہاں جو جوشِ بیان پایا جاتا ہے فارسی شاعری اس سے خالی ہے،

شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش — کہ تا یکچند بیا سایم ز دنیا و ز شر و شورش

کمند صید بہرامی بیفگن جامِ مے بردار — کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام ست نے گورش

می دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

دو بار زیرک و از بادۂ کہن دو منے — فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے،

من ایں مقام بہ دنیا و آخرت ندہم — اگرچہ در پیم افتند خلق انجمنے

دنیا کی شان و شوکت، جاہ و جلال، دھوم دھام، ان کو للچانا چاہتے ہیں، لیکن ان کے دل سے یہ صدا آتی ہے، کہ تا کے؟ یہ نیرنگیاں کب تک؟ اس جھوٹے طلسم کے لئے زندگی کو کیوں آلودہ کیا جائے،

بس کن ز کبر و ناز کہ دیدست روزگار — چین قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

حاصل کارگہ کون و مکاں اینہمہ نیست — بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں اینہمہ نیست

بیفشاں جرعۂ بر خاک و حالِ اہل شوکت بیں — کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

گرہ بہ باد مزن گرچہ بر مراد وزد — کہ ایں سخن بہ مثل باد با سلیماں گفت

یہ فلسفہ خواجہ صاحب پر اس قدر چھا گیا تھا کہ بوریائے فقر انکو مسند جمشید نظر آتا تھا، وہ خود اس خیال میں مست تھے اور چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اس عالم کا لطف اٹھائیں،

وہ مناظر قدرت سے، بہار سے، آب رواں سے، سبزہ و مرغزار سے لطف اٹھاتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ خوش عیشی کا یہ عالم ہر شخص کو نصیب ہو سکتا ہے، اس بنا پر وہ تمام دنیا کو خوش عیشی کے فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، یونان میں اپکیورس کی بھی یہی تعلیم تھی، لیکن وہ فلسفی تھا اس لئے جو کچھ کہتا تھا، فلسفہ کے انداز میں کہتا تھا، خواجہ صاحب شاعر تھے اور فطری شاعر تھے، اس لئے اُنھوں نے خوش عیشی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ زمین سے آسمان تک جوشِ مسرت سے لبریز نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا اصلی کمال ہے،

عید است ساقیا قدحِ پُر شراب کن ۔۔۔ دورِ فلک درنگ ندارد شتاب کن

بنوش بادہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند ۔۔۔ چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد ۔۔۔ بمی بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد

شکوہ تاجِ سلطانی کہ بیم جاں درو درج است ۔۔۔ کلاہ دلکش است اما بدردسر نمی ارزد

غم دنیاے دنی چند خوری بادہ بخور ۔۔۔ حیف باشد دلِ دانا کہ مشوش باشد

خوشتر از فکر می و جام چہ خواہد بودن ۔۔۔ چوں خبر نیست کہ انجام چہ خواہد بودن

بہار سے لطف اٹھاتے ہیں،

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد ۔۔۔ عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

ارغواں جامِ عقیقی بہ سمن خواہد داد ۔۔۔ چشمِ نرگس بہ شقائق نگراں خواہد شد

مطربا مجلس انس است غزل خوان و سرود ۔۔۔ چند گوئی کہ چنیں است و چناں خواہد شد

بلبل ز شاخِ سرو بہ گلبانگ پہلوی ۔۔۔ می خواند دوش درسِ مقاماتِ معنوی

مرغانِ باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو ۔۔۔ تا خواجہ می خورد بہ غزلہاے پہلوی

درویشم و گدا و برابر نمی کنم ۔۔۔ پشمیں کلاہ خویش بہ صد تاجِ خسروی

خوش فرش بوریا و گدائی و خواب امن   کیں عیش نیست درخور اورنگِ خسروی

آخر الامر گل کوزہ گراں خواہی شد   حالیا فکر سبو کن کہ پُر از بادہ کنی

اے کہ در کوے خرابات مقامے داری   جم وقت خودی ار دست بہ جامے داری

اے کہ با زلف و رخِ یار گذاری شب و روز   فرصتت باد کہ خوش عیش و دو لمے داری

می خواہ و گل افشاں کن از دہر چہ می جوئی   ایں گفت سحرگہ گل بلبل تو چہ می گوئی

مسند بہ گلستاں بر شاہد و ساقی را   لب گیری و رخ بوسی می نوشی و گل بوئی

خواجہ صاحب کے اس خاص کمال (جوش بیان) کا اندازہ اس وقت اچھی طرح ہو سکتا ہے، جب انہی مضامین کے متعلق اور اساتذہ کے کلام کا موازنہ کیا جائے نمونہ کے لئے ہم صرف چند شعروں پر اکتفا کرتے ہیں،

سلمان	حافظ
رندی و عاشقی و قلاشی ہیچ شک نیست کہ در ما ہمہ ہست	عاشق و رند نظر بازم و میگویم فاش تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام
درون صافی ز اہل صلاح و زہد مجوی کہ ایں نشانۂ رنداں دُردی آشام است	راز درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را
مکن ملامت رنداں دگر بہ بدنامی کہ ہر چہ پیش تو ننگ ست نزد ما نام است	گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں ما نمی خواہیم ننگ و نام را
غرض از کعبہ و بتخانہ توئی سلماں را حکیم خانۂ بے خانہ خدا باید رفت	جلوہ بر من مفروش ای ملک الحاج کہ تو خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم
من ازاں روز کہ در بند توام آزادم	فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم

حافظ	سلمان
بندۂ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم	بادشاہم چو بدست تو اسیر افتادم
یارب این باکہ تواں گفت کہ آں نوشیں لب	ای گنج نوشدار و در خستگان نظر کن
کشت ما را ودم عیسیٰ مریم با اوست	مرہم بدست و ما را مجروح می گذاری

بدیع الاسلوبی یعنی جدت وخوبیٔ ادا | اکثر مضامین ایسے ہیں جو مدتوں سے بندھے آتے تھے پابند ہے نہ تھے لیکن بجائے خود معمولی مضمون تھے، جن میں کوئی دلفریبی نہ تھی، خواجہ صاحب کے حسن اسلوب اور جدت ادا نے اس کو نہایت دلآویز اور لطیف کر دیا، مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب مخمور سرشار اور مست کہتے آئے ہیں خواجہ صاحب اسی بات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں،

ہر کس کہ بدید چشم او گفت — کو محتسبے کہ مست گیرد

یعنی جس نے اس کی آنکھ دیکھی بول اٹھا کہیں محتسب تو نہیں کہ مست کو گرفتار کرے،

معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے، خواجہ صاحب اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں،

بنفشہ طرۂ مفتولِ خود گرہ میزد — صبا حکایتِ زلفِ تو درمیاں انداخت

یہ مضمون اس طرح ادا کیا ہے کہ تصویر کھینچ دی ہے، بنفشہ گویا ایک حسین اور جمیلہ ہے اس کی زلفیں نہایت خوبصورت اور گھونگھروالی ہیں، وہ بڑے ناز و انداز سے بیٹھی ہوئی چوٹی میں گرہیں لگا رہی ہے، اتنے میں کہیں سے صبا آنکلی، اس نے معشوق کی زلفوں کا ذکر چھیڑ دیا، بنفشہ عین غرور اور ناز کی حالت میں شرما کر رہ گئی،

جدت میں جدت یہ ہے کہ نتیجہ یعنی بنفشہ کا شرمندہ ہو جانا بیان نہیں کیا کہ اس کے

۱؎ یہ شعر سعدی کا ہے:

اظہار کی ضرورت نہیں،

زاہد کی نسبت یہ خیال ظاہر کرنا مقصود تھا کہ گو وہ شراب وغیرہ استعمال نہیں کرتا تاہم چونکہ اس کی فتوحات اور نذور، ریا اور زور کے ذریعہ سے ہات آتی ہیں اسلئے وہ بھی حرام سے کم نہیں، اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

ترسم کہ صرفہ نبرد روز باز خاست　　　نانِ حلال شیخ ز آبِ حرامِ ما

یعنی مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن شیخ کی حلال روٹی، میرے آبِ حرام (شراب) سے بازی لیجا سکے، جدت اسلوب کے ساتھ ہر لفظ ایک خاص لطف پیدا کرتا ہی،

ترسم سے دکھانا ہے کہ میں اس بات کو بطور شماتت کے نہیں کہتا، بلکہ ہمدردی کے لحاظ سے مجھ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو، قیامت کو باز خاست کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ کھوٹے کھرے کے پرکھنے کا دن ہے،

نان حلال، اور آب حرام کے مقابلہ نے علاوہ صنعت اضداد کے جو نہایت بے تکلفی سے ادا ہوئی ہے، اصل مضمون کو نہایت بلیغ کر دیا ہے، یعنی زاہد کی روٹی باوجود حلال ہونے کے میرے آبِ حرام سے بازی نہ لیجائے، تو زاہد کے لئے کس قدر افسوس کا سبب ہوگا،

فقیہ مدرسہ دی مست بود و فتویٰ داد　　　کہ می حرام و لے بہ ز مال اوقاف است

اس طرز ادا کی بلاغت پر لحاظ کرو، اول تو اس امر کا اعتراف کہ شراب گو حرام سہی لیکن مال وقف سے بہر حال اچھی ہے، خود فقیہ کی زبان سے کرایا ہی، اس کے ساتھ مست کی قید لگا دی ہے، جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ فقیہ چھپی بات کا اظہار یوں کاہے کو کرتا، مست تھا، اس لئے پس و پیش کا خیال نہ آیا، در جو دل میں تھا زبان سے کہہ گیا،

زاہد خدا کا تصور جو دلوں میں قائم کراتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ مجسم قہر و غضب ہی؛ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہوتا رہتا ہی، اور نہایت بے رحمانہ سزائیں دیتا ہے لیکن اہلِ نظر کے نزدیک خدا سرتاپا لطف اور رحم ہے، اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں؛

پیر دردی کش ما گرچہ ندارد زر و زور — خوش عطا بخش و خطا پوش خدائے دارد

خدائے" کی تنکیر نے کیا لطف پیدا کیا ہی، گویا ایسا خدا بہت غیر معروف ہی، زاہد وغیرہ سے اس سے مطلق شناسائی نہیں،

یہ مضمون کہ میں نے معشوق کا انتخاب ایسی دیدہ وری سے کیا کہ ہر شخص نے اسکی داد دی، اس کو یوں ادا کرتے ہیں،

ہر کس کہ دید روئے تو بوسید چشمِ من — کارے کہ کرد دیدۂ من بے بصر نہ کرد

یعنی جس نے تیرا چہرہ دیکھا، میری آنکھیں چوم لیں کہ کیا عمدہ انتخاب ہے، میری آنکھ نے جو کام کیا دیکھ بھال کے کیا،

شاہد بازی کی نسبت یہ عذر خواہی کہ اور لوگ بھی تو کرتے ہیں، عام مضمون ہے، سعدی فرماتے ہیں،

گر کند میل بہ خوبان دلِ من خردہ مگیر — کیں گناہیست کہ در شہرِ شما نیز کنند

اسی مضمون کو خواجہ صاحب جدید اور لطیف اسلوب سے ادا کرتے ہیں،

من ارچہ عاشقم و رند و مست نامہ سیاہ — ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہ اند

شعر کا ظاہری مطلب یہ ہی کہ میں اگرچہ گنہگار اور نالائق ہوں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ شہر میں اور لوگ پاکیزہ خیال ہیں، جس کی برکت سے میری شامت اعمال کا اثر اوروں پر نہ پڑیگا، لیکن حقیقت میں یہ اوروں پر درپردہ چوٹ ہے، سعدی نے کھلے لفظوں

میں کہدیا، خواجہ صاحب کنایۃً ادا کرتے ہیں،

خدا کے عفو کے بھروسہ پر شراب پینے کی جرأت اس پیرایہ میں دلاتے ہیں،

بیار بادہ بخور زاں کہ پیر میکدہ دوش　　بسے حدیث عفور و رحیم و رحمٰن گفت

اس موقع پر خدا کے متعدد نام جن سے رحم اور مغفرت کا اظہار ہوتا ہے، لانا کس قدر بلاغت ہے،

دنیا کی بے ثباتی کو اس انداز میں ادا کرتے ہیں،

سرود مجلس جمشید گفتہ اند ایں بود　　کہ جام بادہ بیاور کہ جم نخواہد ماند

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا کچھ اعتبار نہیں، اس لئے یہ چندروزہ زندگی عیش و عشرت میں گذار دو، کل خدا جانے کیا ہوگا، اس مضمون کے لئے کس قدر بلیغ پیرایہ اختیار کیا ہی، عیش اور کامیابی میں جمشید سب سے نام آور ہے، تاہم خود اس کی مجلس میں یہ راگ گایا جاتا تھا، اس سے بڑھ کر دنیا کی بے ثباتی کا کیا ثبوت ہوگا، جمشید کا نام اس بے حقیقتی سے لینا کہ القاب و خطاب ایک طرف، پورا نام بھی نہیں، اس مضمون کو نہایت باثر کر دیتا ہی،

شرم ازاں چشم سیہ بادش و مژگانِ دراز　　ہر کہ دل بردنِ او دیدہ و در انکارِ من است

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ جو شخص میرے اوپر اعتراض کرتا ہے، اگر معشوق کو دیکھ لیتا تو اعتراض سے باز آتا، اس کو یوں ادا کیا ہے کہ جو شخص میری دل باختگی پر اعتراض کرتا ہے، اس کو معشوق کی آنکھ اور مژگاں سے شرم نہیں آتی، یعنی مجھ پر اعتراض کرنا گویا آنکھوں کی دلربائی سے انکار کرنا ہی،

یارب بہ کہ بتواں گفت ایں نکتہ کہ در عالم　　رخسارہ بہ کس ننمود آں شاہدِ ہرجائی

اس مضمون کو کہ شاہد مطلق (خدا) کا جلوہ اگرچہ ایک ایک ذرہ میں چمکتا ہے لیکن اسکی

حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی، کس بدیع اسلوب سے ادا کیا ہے، یعنی کس قدر تعجب ہے کہ ہر جائی بھی ہے اور آج تک کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں، وصالی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

اے کہ در ہیچ جا نہ داری جا   بو العجب ماندہ ام کہ ہر جائی

لیکن خواجہ صاحب کی طرز ادا میں لطافت کے علاوہ اسلوب بھی زیادہ معنی خیز ہے، بدیع الاسلوبی کے اچھی طرح سے سمجھ میں آنے کے لئے ہم چند مثالیں لکھتے ہیں، جن سے ظاہر ہوگا کہ ایک مضمون جو کسی اور استاد نے باندھا تھا، خواجہ صاحب نے خوبی ادا سے اس کو کس قدر بلند رتبہ کر دیا ہے،

سعدی	حافظ
توگرچہ امیر و ما فقیریم	در راہ عشق، فرق غنی و فقیر نیست
دل داری دوستاں ثواب است	ای بادشاہ حسن سخن با گدا بگو
ای بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم	بنال بلبل اگر با منت سر یاری است
تو عشق گلے داری من عشق گل اندامی	کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاری است

شیخ صاحب کہتے ہیں کہ "بلبل اگر تو رونے پر آمادہ ہو تو میں بھی تیرا ساتھ دینے کو موجود ہوں، مجھ کو تجھ سے ہمدردی کی یہ وجہ ہے کہ تو گل پر عاشق ہے اور میرا معشوق بھی گل اندام ہے،، غرض شیخ نے ہمدردی کی وجہ معشوق کا یک گونہ اشتراک قرار دیا ہے، لیکن یہ پہلو نزاہت اور غیریت سے ذرہ ہٹا ہوا ہے اس لئے خواجہ صاحب ہمدردی کی وجہ صرف عشق کی شرکت قرار دیتے ہیں، معشوق کے اشتراک سے کوئی تعلق نہیں، اس کے ساتھ خود بلبل کے پیرو نہیں بنتے، بلکہ بلبل کو اپنا پیرو بناتے ہیں" دو،، کے لفظ پر جو زور

دیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے صحیح دعویدار صرف وہی ہو سکتے ہیں عاشق اور بلبل، ان باتوں کے ساتھ زار اور زاری کے اجتماع اور مطلع ہونے نے شعر کو نہایت بلند پایہ کر دیا ہے،

حافظ	سعدی
چہ غدر از بخت خود گویم کہ آں عیارۂ شہر آشوب	ای گنج نوشدارو و درخستگان نظر کن
بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد	مرہم بدست و مارا مجروح می گذاری

خواجہ صاحب نے شیخ کے مضمون کا پیرایہ کس قدر لطیف کر دیا ہے،

حافظ	سلمان
عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش	رندی و عاشقی و قلاشی
تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام	ہیچ شک نیست کہ در ماہمہ ہست

چستی بندش اور جوش بیان کے علاوہ سلمان صرف یہ کہتے ہیں کہ مجھ میں یہ سب باتیں ضرور ہیں، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان باتوں پر ان کو فخر ہے، یا ندامت، خواجہ صاحب صرف ان اوصاف کے پائے جانے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کو باعثِ ناز قرار دیتے ہیں، ع تا بدانی کہ بچندیں ہنر آراستہ ام،

حافظ	سلمان
گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں	مکن ملامت و مدان گر بہ بدنامی
ما نمی خواہیم ننگ و نام را	کہ ہر چہ پیش تو ننگ است نزد ما نام است

سلمان کہتے ہیں کہ ہم کو ملامت نہ کرو کیونکہ جس چیز کو تم ننگ سمجھتے ہو وہی ہمارے نزدیک ناموری کی بات ہے، اس مضمون میں یہ نقص ہے کہ اس سے اس قدر پھر ثابت ہوتا ہے

کہ ان کو نام کی خواہش ہے، گو وہ نام آبروں کے نزدیک ننگ ہے، خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کو نام وننگ سے سرے سے غرض ہی نہیں اور رندی کی یہی شان ہی،

سلمان	حافظ
شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز ولب لعل	شاہد آں نیست کہ موے ومیانے دارد
شاہد آں ست کہ ایں دارد و آنے دارد	بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد
دیدہ ام طلعت زیبا ئش کہ آنے دارد	
ایں ہمہ شیفتہ از پے آں می گردم	

اصل مضمون یہ تھا کہ معشوق پن صرف تناسب اعضا کا نام نہیں، بلکہ اصلی چیز ناز وادا انداز ہے، سلمان نے اس مضمون کو جس طرح ادا کیا، اُس میں ایک اور لفظی خوبی یعنی این وآن کا مقابلہ شامل کر دیا، جس سے اصل مضمون کا زور بٹ گیا، اس لئے خواجہ صاحب نے اصل مضمون کو صنعت لفظی سے بالکل الگ کرکے بیان کیا، لیکن این وآں کا لطف بھی ہاتھ سے دینے کے قابل نہ تھا، اس لئے دوسرے موقع پر اس کو زیادہ نمایاں پیرایہ میں ادا کیا،

این کہ می گویند آں بہتر زحسن ۔۔۔ یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں، ہمکو صرف نمونہ دکھانا مقصود تھا،

ان جزئی اسالیب سے قطع نظر کرکے کلی اسالیب پر نظر ڈالو، خواجہ صاحب نے جن مضامین کو زیادہ تر باندھا ہے، وہ شراب کی تعریف، رندی وسرمستی کی ترغیب، دنیا کی بے ثباتی، واعظوں اور زاہدوں کی پردہ دری ہے، ان میں سے ہر مضمون کے ادا کرنے کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے، اس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انہی مضامین پر اور اساتذہ کے سیکڑوں ہزاروں اشعار موجود ہیں، لیکن عام محفلوں میں

خواجہ صاحب ہی کے ترانے زبانوں پر ہیں،

واردات عشق خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے، اور ہر نوع کو اعلیٰ رتبہ پر پہنچایا ہے، لیکن ان کی اصلی شاعری عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ہے، رندانہ مضامین وہ جس آزادی، رنگینی اور جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں، اسکی تفصیل جوش بیان کے عنوان میں گذر چکی، عشقیہ مضامین سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے، لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہئے (جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں) کہ خواجہ صاحب کے عشقیہ جذبات غم اور درد سے کم تعلق رکھتے ہیں، وہ فطرۃً شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے، اس لئے عشق و عاشقی سے ان کو وہیں تک تعلق ہے، جہانتک لطفِ طبع اور شگفتگیِ خاطر کے کام آئے، وہ ناامیدی، حسرت، یاس وغیرہ پر کچھ لکھتے ہیں تو محض تقلید ہوتی ہے، وہ غمگین منہ بنانا بھی چاہتے ہیں تو چہرہ سے شگفتگی نہیں جاتی، اس بنا پر وہ شوق، نازو نیاز، بوس و کنار، بزم آرائی و مجلس افروزی کے جذبات اچھی طرح ادا کرسکتے ہیں، وہ اس قسم کا عشق نہیں کرتے، کہ کسی کے پیچھے زندگی برباد کردیں گلیوں میں پڑے پھریں، ان کا عشق بھی لطف نظر ہے، اچھی صورت سامنے آئی دیکھ لی، دل تازہ ہوگیا، پاس بیٹھ گئے، ہمزبانی کا لطف اٹھایا، زیادہ پھیلے تو سینہ سے لگالیا، گلے میں باہیں ڈالدیں؛ اس حالت میں بھی کوئی برا خیال نہیں، پاکبازی اور پاک نظری کی روک قائم ہے، خود فرماتے ہیں،

منم کہ شہرۂ شہرم بہ عشق ورزیدن　　　منم کہ دیدہ نیالودہ ام بہ بد دیدن

باایں ہمہ عشق و محبت میں جو جو وارداتیں گذرتی ہیں، ایک ایک سے باخبر ہیں اور ان سب جذبات کو اسی سچائی اسی واقفیت اسی جوش کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں، جس طرح دل میں آتے ہیں اور یہی اصلی شاعری ہے، وہ کوئی بات نہیں کہتے جب تک کوئی جذبہ دل

میں نہیں پیدا ہوتا، معشوق کی تعریف بھی جو شاعروں کا رات دن کا وظیفہ ہے کرنا چاہتے ہیں، تو اسی وقت کرتے ہیں جب معشوق کی کسی نئی ادا سے دل پر نئی چوٹ پڑتی ہے، ورنہ یوں کچھ کہہ جاتے ہیں تو اس کو بیکار سمجھتے ہیں، خود فرماتے ہیں،

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا! معذور دار　　　عشوۂ فرماے تا من طبع را موزوں کنم

غنی نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا ہے،

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر　　　تو حنا بستی و من معنی رنگیں بستم

خواجہ صاحب اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ عشق محض ظاہری حسن و جمال سے نہیں پیدا ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ عشق نہیں بلکہ ہوس پرستی ہے، عشق کیلئے معشوق میں حسن و جمال کے سوا اور بہت سی ادائیں ہونی چاہئیں، اسی نکتہ کو سلمان ساوجی نے بھی ادا کیا تھا

شاہد آں نیست کہ دارد خط سبز و لب لعل　　　شاہد آں ست کہ ایں دارد و آنے دارد

لیکن سلمان نے آن کی تخصیص کر دی، خواجہ صاحب بھی اسکو تسلیم کرتے ہیں،

شاہد آں نیست کہ موے و میانے دارد　　　بندہ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

لیکن یہیں تک بس نہیں کرتے، بلکہ آگے بڑھتے ہیں،

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است　　　کہ نام آں نہ لبِ لعل و خط زنگاری است

عاشق جب عشق سے لطف اٹھاتا ہے تو عام فطرت انسانی کے لحاظ سے اوروں کو بھی اس مزہ کے اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے، اس جذبہ کو عجیب لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

مصلحت دید من آن است کہ یاران ہمہ کار　　　بگذارند و سر زلف نگارے گیرند

شہرے پُر از حریفاں ز ہر طرف نگارے　　　یاران! صلاے عشق است گر می کنید کارے

اس مستی کو دیکھو کہ "یار کو کوئی کام کرنا ہے تو بس یہ (عشق) کرنے کا کام ہے،

عاشق کو جب وصل کا تصور آتا ہے، تو یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ معشوق کو طرح

طرح سے آراستہ کرونگا، پھولوں کے زیور پہناؤنگا، تخت پر بٹھاؤنگا اور عرض کرونگا کہ

کہ معشوقانہ انداز سے بیٹھے اور تماشائیوں پر بجلی گرائے، ان جذبات کی تصویر دیکھو،

بہ تخت گل بنشانم بتے چو سلطانے ۔۔۔ ز سنبل و سمنش ساز و طوق و بارہ کنم

کرشمہ کن و بازار ساحری بشکن ۔۔۔ بہ غمزہ رونق بازار سامری بشکن

بہ باد دہ سر و دستار عالمے یعنی ۔۔۔ کلاہ گوشے بہ آئینِ دلبری بشکن

چو عطر سائی شود زلف سنبل از دم ۔۔۔ تو قیمتش بہ سر زلف عنبری بشکن

بہ زلف گوئی کہ آئینِ دلبری بگذار ۔۔۔ بہ غمزہ گوے کہ قلب ستمگری بشکن

بروں خرام و بہ بر گوی خوبی از ہمہ ۔۔۔ سزائے حور بدہ رونق پری بشکن

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ وصل میں دل کے کانٹے نکل جاتے ہیں اور تسکین ہوجاتی ہے؛

لیکن صاحب ذوق جانتا ہے کہ وصل میں آتش شوق اور بھڑکتی ہے، اور دل کا ولولہ

کسی طرح کم نہیں ہوتا، اسی بنا پر عرب کا شاعر کہتا ہے،

بِكُلٍّ تَدَاوَيْنَا فَلَمْ يُشْفَ مَا بِنَا ۔۔۔ عَلٰى اَنَّ قُرْبَ الدَّارِ خَيْرٌ مِنَ الْبُعْدِ

یعنی ہم سب کرکے دیکھ چکے کبھی تسلی نہیں ہوتی تاہم ہجر سے وصل پھر اچھا ہے، خواجہ حسن اس نکتہ کو یوں ادا کرتے ہیں،

بلبلے برگ گلے خوش رنگ در منقار داشت ۔۔۔ و ندراں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

گفتمش در عین وصل این نالہ و فریاد چیست؟ ۔۔۔ گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

معشوق نے چند روز بے وفائی برتی ہے، پھر صاف ہوگیا ہے، عاشق کو پچھلی باتیں

یاد آتی ہیں، لیکن قصداً بھلاتا ہے اور معشوق کو مطمئن کرتا ہے کہ مجھکو کوئی شکایت نہیں،

اتفاقیہ باتیں تھیں، ہوگئیں، اس حالت کو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

گر ز دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت ۔۔۔ ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

اس بلاغت کو دیکھو کہ ظلم و ستم کو معشوق کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ زلف کا نام لیتا ہے اور اس کو ہندو (چور ظالم) کہتا ہے کہ اس سے یہ کیا بعید ہے،

برق عشق ار خرمنِ پشمینہ پوشی سوخت سوخت | جور شاہ کامراں گر بر گدا ہی رفت رفت
گر دلم از غمزۂ دلدار تابے بر دبرد | درمیان جان و جانان ماجرائی رفت رفت

کبھی عاشق کے دل میں یہ جذبہ اٹھتا ہے کہ معشوق کو اور لوگ بھی چاہتے ہونگے لیکن میری سی جانبازی کون کر سکتا ہے اس خیال کو محبت کے انداز سے معشوق کے سامنے بھی ظاہر کر دیتا ہے،

خواجہ صاحب اس جذبہ کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں،

شبے مجنوں بہ لیلی گفت کای معشوقِ بے ہمتا | ترا عاشق شود پیدا ولے مجنوں نخواہد شد

اس موقع پر مجنوں کے لفظ نے کیا بلاغت پیدا کی ہے، یہ مضمون سیکڑوں نے باندھا ہے لیکن یہ پیرایہ کسی کو نصیب نہ ہوا،

بعض وقت جب معشوق کا ناز اور تمکنت حد سے گذر جاتی ہے، تو عاشق تنگ آکر کہدیتا ہے، کہ اتنا بھی حد سے نہ گذرے، دنیا میں اور ہزاروں صاحب جمال ہیں، معشوق بھی جانتا ہے کہ بات سچ ہے، لیکن سمجھتا ہے کہ عاشق کے منصب کے خلاف ہے ان سچے جذبات کو خواجہ صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں،

صبحدم مرغ چمن با گلِ نو خاستہ گفت | ناز کم کن کہ دریں باغ بسی چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم و لے | ہیچ عاشق سخنے سخت بہ معشوق نہ گفت

عشق کے جذبات اگرچہ عالم شباب کے لئے خاص ہیں، لیکن بڑھاپے میں بھی یہ آگ سرد نہیں ہوتی، عاشق پر اس زمانہ میں مختلف حالات گذرتے ہیں، کبھی کہتا ہے،

ع رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولیٰ

کبھی خیال کرتا ہے کہ عشق کی گرمی خود جوان بنا دے گی، اس حالت میں کبھی معشوق سے کہتا ہے،

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر | کہ سحر گہ ز کنار تو جوان برخیزم

کبھی کہتا ہے،

ہر چند پیر و خستہ دل و ناتواں شدم | ہر گہ کہ یاد روی تو کردم جواں شدم

اسی بنا پر رکنائے کاشی نے کہا ہے، ع عشق در ایام پیری چوں بہ سرما آتش است،
ان خیالات کے ساتھ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ حالت عبرت انگیز ہے، اس حالت میں خود اپنی حالت پر افسوس کرتا ہے، اور عبرت کے لہجہ میں کہتا ہے،

دیدی دلا کہ آخر پیری و زہد و علم | با من چہ کرد دیدۂ معشوقہ باز من

یہ سب اصلی وارداتیں ہیں، جو عاشق کو پیش آتی ہیں، خواجہ صاحب نے انکو بے کم و کاست ادا کیا ہے،

معشوق جب صاحب جاہ اور عاشق مفلس اور کم مایہ ہوتا ہے تو معشوق کو عاشق کی طرف التفات سے عار ہوتی ہے لیکن عاشق میں یہ امتیاز ملحوظ نہیں، اس بنا پر قاصد سے خطاب کرکے کہتا ہے،

گر دیگرت بر آں در دولت گذر بود | بعد از ادای خدمت و عرض دعا بگو

در راہ عشق فرق غنی و فقیر نیست | اے بادشاہ حسن سخن با گدا بگو

غرض اس طرح کے سیکڑوں جذبات ہیں جن کو خواجہ صاحب نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے اور جس کی مثال، اساتذہ کے کلام میں نہیں مل سکتی، ہم سرسری طور پر یکجائی چند اشعار نقل کرتے ہیں،

معشوق کی نسبت بدگمانی،

خواب آں نرگسِ فتّان تو بے چیزے نیست　　تابِ آں زلف پریشانِ تو بے چیزے نیست

ظلم کے بعد معشوق کے رحم کی داد،

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

رقیب سے چھپ کر سرگوشی،

خدارا اے رقیب امشب زمانے دیدہ برہم نہ　　کہ من با لعل جاں بخشش نہانی یک سخن دارم

معشوق کی عام آمیزی کی شکایت،

زلف در دست صبا گوش بہ پیغام رقیب　　ایں ہمہ با ہمہ در ساختۂ یعنی چہ

عشق سے پارسائی میں فرق آنے کا خطرہ،

می ترسم از خرابی ایماں کہ می برد　　محرابِ ابروی تو حضور نماز من

معشوق نے چارہ ساز ہو کر چارہ نوازی نہ کی،

چہ عذر از بخت خود گویم کہ آں عیار شہر آشوب　　بہ تلخی کشت حافظ را و شکر در دہاں دارد

با کہ ایں نکتہ تواں گفت کہ آں سنگیں دل　　کشت مارا و دمِ عیسیِ مریم با اوست

بوسے کے ساتھ گالی کا مزہ،

قند آمیختہ با گل نہ علاج دلِ ماست　　بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند

بادوفا معشوق کی نظیر پیش کر کے معشوق سے التفات کی خواہش،

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند　　ای دوست بیا رحم بہ تنہائی ما کن

حیا اور رونے کی وجہ سے افشاے راز،

ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز　　وگرنہ عاشق و معشوق راز دار اند

اوروں کی کامیابی پر حسرت

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی | بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیما را

داستانِ عشق کی دلچسپی،

یک قصہ بیش نیست غمِ عشق ایں عجب | از ہر کسے کہ می شنوم نامکرر است

معشوق پر فدا ہونے کا انتظار اور اس کا اعراض،

می خواستم کہ میرمش اندر قدم چو شمع | او خود گذر بہ من چو نسیم سحر نہ کرد

معشوق کی یاد میں شب گذاری کا لطف،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح | بوی زلفِ تو ہماں مونسِ جان است کہ بود

معشوق نہ زر سے ہات آتا اور نہ خود ملتفت ہوتا،

از بہر بوسہ ز لبش جاں ہمی دہم | اینم نمی ستانم؛ آنم نمی دہد

اہل تقوی برا مانیں تو مانیں، شاہد پرستی نہیں چھوڑی جا سکتی،

شراب لعل کش و روی مہ جبیناں بیں | خلافِ مذہب آناں جمال ایناں بیں

فلسفہ | خواجہ صاحب کا فلسفہ قریبًا وہی ہے جو خیام کا ہے، خواجہ صاحب نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل، زیادہ توضیح اور زیادہ جوش کے ساتھ ادا کیا ہی، چنانچہ ہم ان کو بدفعات بیان کرتے ہیں،

(۱) ان کا فلسفہ اس مسئلہ سے شروع ہوتا ہے، کہ انسان کو کائنات کے اسرار اور ان کی حقیقت کچھ معلوم نہیں، اور نہ معلوم ہو سکتی! اس مضمون کو سقراط، فارابی، ابن سینا، خیام سب نے بیان کیا تھا، لیکن خواجہ صاحب جس بلند آہنگی، اور جوش و ادعا کے ساتھ کہتے ہیں، وہ ان کا خاص حصہ ہے،

بروای زاہد خود بیں! کہ ز چشم من و تو — راز ایں پردہ نہان است و نہان خواہد بود

انداز بیان کی بلاغت کو دیکھو! کلام کی ابتدا ایسے لفظ سے کی ہے، جس سے زاہد کی دعویٰ راز دانی کی سخت تحقیر ظاہر ہوتی ہے، خود بیں کے لفظ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ دعوی صرف خود بینی کی بنا پر ہوتا ہے، زاہد کے ساتھ اپنے آپ کو بھی شریک کر لیا ہے، جس سے زاہد کی خاطر داری اور دعویٰ کی تعمیم مقصود ہے یعنی اس امر میں عارف و زاہد، عالم و جاہل سب برابر ہیں، دوسرے مصرع میں ماضی کے ساتھ آیندہ زمانہ کو بھی داخل کر لینے سے دعویٰ میں زیادہ زور اور تعمیم پیدا ہو گئی ہے،

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں — کیں جا ہمیشہ باد بہ دست است دام را

حدیث از مطرب و می گوے و راز دہر کمتر جوے — کہ کس نہ کشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

دانا چو دید بازی ایں چرخ حقہ باز — ہنگامہ باز چید و در گفتگو بہ بست

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا است — ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

ساقیا جام میم دہ کہ نگارندۂ غیب — نیست معلوم کہ در پردۂ اسرار چہ کرد

آں کہ پر نقش زد ایں دائرۂ مینائی — کس ندانست کہ در گردش پرکار چہ کرد

نشوی واقف یک نکتہ ز اسرار وجود — گر تو سرگشتہ شوی دائرۂ دوماں را

در کارخانۂ کہ رہ عقل و علم نیست — وہم ضعیف رائے فضولی چرا کند

ما از بروں در شدہ مغرور صد فریب — تا خود درونِ پردہ چہ تدبیر می کنند

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

راز درون پردہ چہ داند فلک خموش — اے مدعی نزاعِ تو با پردہ دار چیست

با ہیچ کس نشانے زاں دلستاں ندیدم — یا من خبر ندارم یا او نشاں ندارد

مردم دیدہ دراں انتظار دریں پردہ راہ نیست — یا ہست و پردہ دار نشانم نمی دہد

(۲) شاہد مطلق کا ظہور اگرچہ ہر جگہ ہے اور ذرہ ذرہ میں اسکی چمک موجود ہی لیکن کوئی شخص اس کو پہچان نہیں سکتا،

(۳) اسرار کائنات اگرچہ حقیقت میں معلوم نہیں ہو سکتے لیکن جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا ہے، وہ علوم درسیہ کی تحصیل اور بحث و مباحثہ سے نہیں معلوم ہو سکتا، بلکہ مجاہدہ، ریاضت، وجدان اور کشف سے معلوم ہو سکتا ہی، خواجہ صاحب نے ارباب ذوق اور مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش، رند رکھا ہے، اور اسی بنا پر ہر جگہ پیر مغاں اور بادہ فروش کی حلقہ بگوشی کا دعویٰ کرتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں زہاد یعنی علمائے ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں،

راز درون پردہ ز رندان مست پرس — کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را

سر خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت — در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

اے کہ از دفتر عقل آیت عشق آموزی — ترسم ایں نکتہ بہ تحقیق ندانی دانست

سر ز حیرت بہ در میکدہ ہا بر کردم — چوں شناسای تو در صومعہ یک پیر نبود

حلاج بر سر دار ایں نکتہ خوش سراید — از شافعی مپرسید امثالِ ایں مسائل

مرزا غالب نے اس خیال کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے،

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است — بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

(۴) صوفیہ کے نزدیک علم حاصل ہونے کا ذریعہ بیرونی چیزوں کا مطالعہ نہیں ہے ان کے نزدیک دل پر جب ایک خاص طریقہ سے توجہ، اور مدت تک اس پر مواظبت

کی جاتی ہے، تو دل خود ادراکات اور معلومات کا سرچشمہ بن جاتا ہے، جس طرح انبیاؑ کا علم باہر سے نہیں آتا، بلکہ فوارہ کی طرح اندر سے اچھلتا ہے، خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت پرجوش اور بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے،

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست | و ندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم | گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد

یعنی میں نے ساقی (عارف) کو دیکھا کہ خوشی سے کھلا جاتا ہے، ہات میں شراب کا پیالہ ہے، اس کو بار بار دیکھتا ہے، اور اس میں اس کو گوناگوں عالم نظر آتے ہیں، میں نے پوچھا کہ کارپردازِ فطرت نے تم کو یہ جام جہاں بیں کس دن عنایت کیا تھا، بولا کہ جس دن یہ سبز گنبد (آسمان) تعمیر کر رہا تھا،

(۶) خواجہ صاحب کا میلان زیادہ تر جبر کی طرف معلوم ہوتا ہے، یعنی انسان خود مختار نہیں ہے کوئی اور قوت ہے جو اس سے کام لے رہی ہے، اگرچہ بعض جگہ اس کے خلاف بھی ان کے قلم سے نکل جاتا ہے، مثلاً ع

ہر عمل اجرے و ہر کار جزائے دارد

لیکن ان کا اصلی رحجان طبع جبر ہی کی طرف ہے، یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر خلافِ عقل ہے، لیکن فلسفہ کی انتہائی منزل یہی ہے، اور ارباب فنا بھی اسی نشہ میں چور ہیں، خواجہ صاحب جب اس عالم میں آتے ہیں تو اُن کی سرمستی حد سے بڑھ جاتی ہے اور عجیب جوش و خروش کا عالم ہوتا ہے،

نقشِ مستوری و مستی نہ بہ دستِ من و تست | انچہ استادِ ازل گفت، بکن آں کردم
بارہا گفتہ ام و بار دگر مے گویم | کہ من دل شدہ ایں رہ نہ بخود می پویم

برو ای ناصح و بر درد کشاں خرده مگیر　　کارفرمای قدر می کند این من چه کنم
برقِ غیرت که چنیں می جهد از پردهٔ غیب　　تو بفرما که منِ سوخته خرمن چه کنم

مرا مهر نکورویاں ز سر بیروں نخواہد شد　　قضائے آسمان است و دیگرگوں نخواہد شد
مرا روزِ ازل کارے بجز رندی نفرمودند　　هر آں قسمت کہ آں جا شد کم و افزوں نخواہد شد

مستور و مست هر دو چو از یک قبیله اند　　ما دل به عشوهٔ کہ دہیم؟ اختیار چیست؟

در پسِ آئینه طوطی صفتم داشته اند　　انچه استادِ ازل گفت همان می گویم

(۵) کمال اور ترقی کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں یہ غلط ہے کہ ع

حریفان بادہا خوردند و رفتند

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید　　دیگراں ہم بکنند انچه مسیحا می کرد

(۶) بندگانِ خاص کی فطرت ہی جدا ہوتی ہے، وہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی؛

گوہر جامِ جم از طینتِ خاکِ دگر است　　تو توقع زگلِ کوزہ گراں میداری

فلسفۂ اخلاق | خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم، اعلیٰ درجہ کے فلسفۂ انسانیت کی تصویر ہے ان کا طرزِ عمل خود ان کی زبان سے یہ ہے،

مباش در پے آزار و هر چه خواهی کن　　که در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

ع　فرضِ ایزد بگذاریم و بکس بد نه کنیم

ما نه گوئیم بد و میل به ناحق نه کنیم　　جامۂ کس سیه و دلق خود ازرق نه کنیم

نہ صرف اچھوں بلکہ بروں کو بھی ہم برا کہنا پسند نہیں کرتے کیونکہ گو برے کو برا کہنا چنداں مضائقہ نہیں پھر بھی برائی سے خالی نہیں، اس لئے سرے سے اس کام کو چھوڑ دینا بہتر ہے؛

عیب درویش و توانگر به کم و بیش بد است　　کارِ بد مصلحت آن است که مطلق نکنیم

ہم اپنے نکتہ چینوں اور مخالفوں سے بھی ناراض نہیں ہوتے اس لئے کہ اگر وہ حق کہتے ہیں تو حق کے بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں، اور اگر غلط کہتے ہیں تو غلط بات کا کیا رنج،

حافظ از خصم خطا گفت نگیریم بر او | ور کہ حق گفت جدل با سخنِ حق نہ کنیم

ہماری مجلس عام ہے کسی کی تخصیص نہیں، جو چاہے آئے، ہم سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے ہیں، واعظوں اور زاہدوں کی طرح ہمارا اخلاق دوست دشمن، عزیز و بیگانہ، کافر و مسلمان کی تفریق کی وجہ سے بدلا نہیں کرتا،

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو | گیر و دار حاجب و دربان دریں درگاہ نیست
بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است | ورنہ لطفِ شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

ہم کو صرف مہر و محبت سے کام ہے، دشمنی، بغض اور کینہ ہمارا طرزِ عمل نہیں،

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم | از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

قفا خوریم و ملامت کشیم و خوش باشیم | کہ در طریقتِ ما کافری است رنجیدن
بہ پیر میکدہ گفتم کہ چیست راہ نجات | بخواست جام می و گفت عیب پوشیدن

فرائض اور عبادات بہشت کے لالچ سے نہیں کرنی چاہئیں، بلکہ اس لئے کرنی چاہئیں کہ فرضِ انسانی ہیں، بہشت بے شک معاوضہ میں ملے گی، لیکن تمھارا مطمحِ نظر یہ نہیں ہونا چاہئے،

تو بندگی چو گدایان بہ شرط مزد مکن | کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند
من آں نگین سلیماں بہ ہیچ نستانم | کہ گاہ گاہ بر او دست اہرمن باشد

مشہور ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی تاثیر سے تمام جن اور انسان ان کے تابع تھے، ایک دفعہ ایک شیطان نے اس کو کسی طرح اڑا لیا، حضرت

سلیمانؑ کی سلطنت اور شان و شوکت سب جاتی رہی، یہاں تک کہ مچھلیاں بیچ کر زندگی بسر کرتے تھے، خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جس انگوٹھی پر کبھی کبھی شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے، میں اس کو کوڑی کے مول بھی نہیں خریدتا،

گرچہ گرد آلود فقرم شرم باد از ہمتم | گر بہ آب چشمۂ خورشید دامن تر کنم

بہ خرمن دو جہاں سر فرود نمی آرند | دماغ کبر گدایانِ خوشہ چیناں بیں

ما ملکِ عافیت نہ بہ لشکر گرفتہ ایم | ما تختِ سلطنت نہ بہ بازو کشادہ ایم

لیاقت جب تک نہ ہو بڑوں کی برابری نہیں کرنا چاہیئے،

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بگزاف | مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کنی

ذاتی لیاقت درکار ہے، خاندانی شرف کافی نہیں،

تاج شاہی طلبی گوہر ذاتی بنما | ور خود از گوہر جمشید و فریدوں باشی

تحصیل مقصد کے لئے کوشش درکار ہے،

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بہ جاں | شرطِ اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

ترغیب عمل،

اے دل بہ کوی عشق گذارے نمی کنی | اسباب جمع داری و کارے نمی کنی

چوگاں بدست داری و گوی نمی زنی | بازے چنیں بدست و شکارے نمی کنی

علما اور واعظین کی پردہ دری

اخلاقی تعلیم اس بات پر موقوف ہے کہ شاعر فطرت انسانی کا نکتہ شناس ہو، جو عیب اور برائیاں کھلی کھلی ہوتی ہیں، ان کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے لیکن دقیق مخفی اور سربستہ عیوب تک ہر شخص کی نگاہ نہیں پہونچ سکتی، اس لئے جو شاعر فلسفہ اخلاق کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اس کے لئے فطرت کا نکتہ شناس ہونا سب سے پہلی شرط ہے، اس

ساتھ تو یہ بھی ضرور ہے کہ لطیف اور دل آویز طریقوں سے یہ عیوب ظاہر کئے جائیں تاکہ لوگوں کو گراں نہ گذریں بلکہ خود ان کو ان کے سننے میں لطف آئے، مخفی اور دقیق عیوب جس قدر علما، واعظین اور زہاد میں پائے جاتے ہیں کسی فرقہ میں نہیں پائے جاتے، چنانچہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اس کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن چونکہ یہ فرقہ ہمیشہ با اقتدار رہا ہے، اس لئے ان کے عیوب کا ظاہر کرنا آسان بات نہیں، امام غزالی نے اس کا جو نتیجہ اٹھایا، یہ تھا کہ ان کی جان تک معرض خطر میں آگئی، اس لئے کسی کو ہمت نہ ہوئی شعراء میں سب سے پہلے خیام نے یہ جرأت کی، اس کے بعد شیخ سعدی نے دبی زبان سے کچھ کچھ کہا، مثلاً

محتسب در قفاے رندان است غافل از صوفیانِ شاہد باز

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار کہ تا بہ شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند

گر کند میل بہ خوبان دلِ من خردہ مگیر کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

لیکن جس دلیری، آزادی اور بے باکی سے خواجہ صاحب نے اس فرض کو ادا کیا آج (تک) کسی سے نہ ہو سکا،

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند محفل باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

گوئیا باور نمی دارند روز داوری کیں ہمہ قلب (کھوٹ) و دغا در کار داور (خدا) می کنند

دی دو بیتم چہ خوش آمد کہ سحرگہ (قیامت) میگفت بر در میکدۂ با دف و نے ترسائے

گر مسلمانی این است کہ حافظ دارد وای اگر در پس امروز بود فردائے

یعنی کل شراب خانہ کے دروازہ پر ایک عیسائی دف بجا کر یہ گاتا تھا کہ اگر اسلام اسی کا

نام ہے جو حافظ میں پایا جاتا ہے تو آج کے بعد اگر کل قیامت کا دن بھی آنے والا ہے تو ہے

اس شعر کا پیرایۂ بیان بھی کس قدر بلیغ ہے، اول تو جو کہنا ہے اس کو ایک عیسائی کی زبان سے کہا ہے، جس سے علاوہ احتیاط کے مقصود یہ ہے کہ غیروں کو بھی ان بداعمالیوں پر افسوس اور رحم آتا ہے، گانے اور بجانے کے شامل کرنے سے یہ غرض ہے کہ اس ذریعہ سے لوگ زیادہ جی لگاکر سنتے تھے اور زیادہ تشہیر ہوتی تھی، اپنا نام لینے سے علاوہ احتیاط کے یہ مقصد ہے کہ دوسروں کا عیب کہتے تو ان کو توجہ نہ ہوتی،

سب سے بڑا عیب مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری کا ہوتا ہے، اس لئے نہایت دلیری سے ان کی برائیاں بیان کی ہیں،

گرچہ بر واعظِ شہر ایں سخن آساں نشود | تا ریا ورزد و سالوس، مسلماں نشود

یعنی گو واعظ کو یہ بات گراں گذرے گی، لیکن ہے یہ کہ جب تک وہ ریا کرتا رہے گا، مسلمان نہیں ہوسکتا،

غلام ہمت دردی کشان یک رنگم | نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیاہ اند

بادہ نوشے کہ در و ہیچ ریائے نبود | بہتر از زہد فروشے کہ در و روی و ریاست

من از پیر مغاں دیدم کرامت ہائے مردانہ | کہ ایں دلق ریائی را بہ جائے دُرد می گیرد

می خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب | بہتر ز طاعتے کہ بہ روی و ریا کنند

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خاست | نان حلال شیخ ز آب حرام ما

بیا بمیکدہ و چہرہ ارغوانی کن | مرو بہ صومعہ کاں جا سیاہ کارانند

نقد ہا را بود آیا کہ عیارے گیرند | تا ہمہ صومعہ داران پے کارے گیرند

یعنی اگر سکے پرکھے جاتے تو سب خانقاہ نشین اپنا اپنا راستہ لیتے،

مولویوں اور واعظوں کو اس میں بڑا کمال ہوتا ہے کہ تقدس کے پردہ میں اس طرح برائیاں کرتے ہیں کہ کسی کو اُن کی نسبت گمان بھی نہیں ہو سکتا، خواجہ صاحب نے اس نکتہ کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

اے دل طریق مستی از محتسب بیاموز　　مست است و در حقِ او کس ایں گماں ندارد

خرقہ پوشاں ہمگی مست گذشتند و گذشت[1]　　قصۂ ما است کہ در کوچۂ و بازار بماند

صوفیان و استدند از گرو می ہمہ رخت　　دلق ما بود کہ در خانۂ خمار بماند

یعنی صوفیوں نے اپنا خرقہ شراب کے عوض میں رہن بھی کیا اور واپس بھی لے لیا کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، ہم رند، یوں رسوا ہوئے کہ ہمارا خرقہ رہن پڑا رہ گیا،

داشتم دلقے و صد عیب مرا می پوشید　　خرقہ رہن مے و مطرب شد و زنار بماند

عیب چھپانے کی ایک بڑی گہری چال یہ ہے کہ کوئی اور شخص اگر وہ عیب کرتا ہوا نظر آئے تو نہایت سختی سے اس پر دار و گیر کی جائے، اس راز کو خواجہ صاحب اس طرح فاش کرتے ہیں

بادہ با محتسب شہر نہ نوشی زنہار　　کہ خورد بادۂ تو و سنگ بہ جام اندازد

یعنی محتسب کے ساتھ کبھی شراب نہ پینا، وہ تمھارے ساتھ شراب بھی پیے گا اور تمھارا پیالہ بھی توڑ ڈالے گا،

مولویوں اور واعظوں میں ریاکاری علانیہ نظر آتی ہے، اور مذہبی گروہ بھی اس کے اثر سے خالی نہیں ہوتے، اس بنا پر خواجہ صاحب فرماتے ہیں،

می خور کہ شیخ و حافظ و قاضی و محتسب　　چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

صوفیان جملہ حریف اند نظر باز و لے　　زاں ہمہ حافظ سودا زدہ بدنام افتاد

[1] یعنی گئی گذری بات ہوئی،

علما کے اوصاف اور اخلاق پر خوب غور کرو، تو نظر آئیگا کہ عوام کی عقیدتمندی اور نیازمندی کی وجہ سے ان میں نہایت عجب اور غرور پیدا ہو جاتا ہے، اور اس وصف کو اس لئے ترقی ہوتی جاتی ہے کہ ان کو یہ باتیں مذہبی پیرایہ میں نظر آتی ہیں، وہ کسی کو جا کہتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ امر بالمعروف کی تعمیل ہے، سلاطین اور حکام کی دربارداری کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ احکام شرعی کے اجرا کے لئے اس کی ضرورت ہے، کسی سے ذاتی عناد کی وجہ سے دشمنی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ بغض فی اللہ ہے، غرور اور فخر کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ عزت نفس ہے، اس بنا پر یہ تمام عیوب اُن میں راسخ ہوتے جاتے ہیں، خواجہ صاحب ان تمام عیبوں کی نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں پردہ دری کرتے ہیں،

شکر ایزد کہ نہ در پردهٔ پندار بماند | اگر از پرده بروں شد دلِ من عیب مکن

بازار خود فروشی ازاں راه دیگر است | در راه ما شکسته دلی می خرند و بس

یعنی ہمارے بازار میں صرف خاکساری کی قیمت ہے، باقی خود پرستی تو اس کا راستہ دوسری طرف سے نکلا ہے،

من ہم از بہر نگارے بگزینم چہ شود | زاہد شہر چو مہر ملک وشحنہ گزید

یعنی جب زاہد نے بادشاہ پرستی اختیار کی، تو ہم بھی اگر کسی خوشرو سے دل لگائیں تو کیا ہرج ہے، یعنی بادشاہ پرستی سے شاہد پرستی بہتر ہے،

نفی حکمت مکن از بہر دل عامے چند | عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

اخفائے حق

علما کی عام حالت یہ ہے کہ امر حق کو عوام کی خاطر سے کبھی ظاہر نہیں کرتے بلکہ اگر اس میں کوئی برائی کا پہلو ہے تو صرف اسی پر زور دیتے ہیں، آج کل مغربی تعلیم قوم کے لئے کس قدر ضروری اور گویا شرط زندگی ہے، لیکن صرف اس وجہ سے کہ عوام اس سے وحشت

کرتے ہیں کبھی کوئی عالم اس کی ترغیب نہیں دے سکتا بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت کیجاتی ہے؛
خواجہ صاحب نے نہایت موثر طریقے سے اس عیب پر ملامت کی ہے، وہ کہتے ہیں
کہ عوام کی خاطر سے حکمت اور حقیقت سے انکار نہ کرو، شراب میں فائدہ بھی ہے اور نقصان
بھی، اور نقصان فائدہ سے زیادہ ہے، تاہم خدا نے قرآن مجید میں فرمایا فیھما اثم
کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما یعنی قمار اور شراب میں فائدے بھی
ہیں اور نقصان بھی، لیکن نقصان زیادہ ہے، جب خدا نے باوجود اس کے کہ شراب نہایت
بری چیز ہے، اس کے فائدوں کو چھپانا نہیں چاہا البتہ یہ بتادیا کہ فائدہ سے نقصان زیادہ
ہے، اور اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے تو امر حق کو عوام کی خاطر سے چھپانا کیونکر جائز
ہو سکتا ہے،

خواجہ صاحب نے اس بات کو جابجا نہایت بلیغ اور لطیف پیرایوں میں ادا کیا
ہے کہ مولویوں اور واعظوں کی نیکیاں بھی چونکہ ذاتی غرض پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے درگاہ
الٰہی میں مقبول ہونے کے قابل نہیں،

در می خانہ بہ بستند خدایا مپسند	کہ در خانۂ تزویر و ریا بکشایند
ترسم کہ صرفۂ نبرد روز بازخواست	نان حلال شیخ ز آب حرام ما
ایں خرقہ کہ من دارم در رہن شراب اولیٰ	ویں دفتر بے معنی، غرق مے ناب اولیٰ

روزمرہ و محاورہ | خواجہ صاحب کی فصاحت کلام کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے
ہاں کلام میں روزمرہ اور محاورے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو الفاظ اور
ترکیبیں رات دن استعمال میں آتے رہتے ہیں اور جن سے روزمرہ پیدا ہوتا ہے، عموماً
وہی ہوتے ہیں جو فصیح، سلیس، نرم اور رواں ہوں، اور اگر ان میں کسی قدر کمی ہوتی ہے

تو وہ روزمرہ کے استعمال سے نکل جاتی ہے، کیونکہ رات دن سنتے سنتے وہ الفاظ کانوں کو مانوس ہو جاتے ہیں، محاورات کا بھی یہی حال ہے، محاورہ اس وقت بنتا ہے جب ایک گروہ کا گروہ کسی جملہ کو کسی خاص معنی میں استعمال کرتا ہے، اس لئے ضرور ہے کہ یہ جملہ خود فصیح، سلیس، اور رواں ہو، ورنہ تحاورِ عام میں نہیں آسکتا،

ایک اور پہلو سے اس خصوصیت پر نظر ڈالو، فارسی زبان میں مفرد الفاظ بہ نسبت اور زبانوں کے نہایت کم ہیں، اس کمی کی تلافی زبان نے محاورات اور مصطلحات سے کی، شاعری کے لئے زبان پر قدرت تام حاصل ہونا سب سے ضروری شرط ہے، خواجہ صاحب کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اُنھوں نے جس قدر محاورات اور مصطلحات برتے، فارسی شعرا میں سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور یہ ان کی قادر الکلامی کی ایک بڑی دلیل ہے،

خواجہ صاحب کا تمام کلام اگرچہ روزمرہ محاورات اور مصطلحات سے لبریز ہے، لیکن مثال کے طور پر ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں[۱]،

ترسم کہ صرفہ نہ برد روزِ باز خاست	نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

قیامت / شراب

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا | بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں | کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

[۱] جو محاورات ان اشعار میں آئے ہیں ان کے معنی ہم یکجائی لکھدیتے ہیں،

صرفہ بردن بازی لیجانا، دام باز چیدن، جال کو سمیٹ لینا، باد بدست بودن، کچھ ہاتھ نہ آنا، خدمت سلام، در سر کار چیزے کردن، صرف کر دینا یا لگا دینا، تراچہ افتادہ است، تمکو کیا پڑی ہے، ہمت توجہ اور ہمدردی، بے اندام، بے ڈول، ازاں راہ دیگر ست یعنی اس کا اور راستہ ہے،

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحاں را

ترسم آں قوم کہ بر دردکشاں می خوانند در سر کارِ خرابات کنند ایماں را

برو بہ کار خود ای واعظ این چہ فریاد است مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتادہ است

روی خوب است و کمال و ہنر و دامن پاک لاجرم ہمتِ مردانِ دو عالم با او ست

ہر چہ ہست از قامت ناساز بے اندام ماست ورنہ تشریف تو بر بالاے کس کوتاہ نیست

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است ورنہ لطفِ شیخ و زاہد گاہ ہست و گاہ نیست

دانا چو دید بازی این چرخ حقہ باز ہنگامہ باز چید و در گفتگو بہ بست

در راہ ما شکستہ دلی می خرند و بس بازار خود فروشی ازاں راہ دیگر ہست

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است بہ بانگ چنگ مخور می کہ محتسب تیز است

می خواست گل کہ دم زند از رنگ و بوی دوست از غیرت صبا نفسش در دہاں گرفت

آسودہ بر کنار چو پرکار می شدم دوراں چو نقطہ عاقبتم در میاں گرفت

فرصت نگر کہ فتنہ در عالم اوفتاد عارف بہ جام مے زد و از غم کراں گرفت

حافظ چو آب لطف ز نظم تو می چکید غیرے چگونہ نکتہ تواند بر آں گرفت

مستم کن آں چناں کہ ندانم ز بیخودی در عرصۂ خیال کہ آمد کدام رفت

در حق من لبت آں لطف کہ می فرماید سخت خوب است ولیکن قدرے بہتر ازیں

ہمائے ہمتم عمرے ست کز جاں ہوائے آں قد و بالا گرفت است

دلم جز مہر مہرویاں طریقے بر نمی گیرد ز ہر در می دہم پندش ولیکن در نمی گیرد

تیز، جھلا اور غصہ ور۔ دم زدن، دعویٰ کرنا۔ نفس در دہاں گرفتن، دم گھٹنا۔ درمیاں گرفتن گھیر لینا۔ زدن کسی چیز پر ٹوٹ کر گرنا۔ نکتہ گرفتن، اعتراض کرنا۔ ہوا گرفتن، ہوا میں اڑنا۔ در گرفتن اثر کرنا یا لگ جانا؛

رخ و چشمے بایں خوبی تو گوئی دل ازو برگیر
بروکیں وعظ بے معنی مرا در سر نمی گیرد

میان گریه می خندم که چوں شمع اندریں مجلس
زبان آتشینم هست لیکن در نمی گیرد

بدیں شعر تر و شیریں زشاهنشه عجب دارم
که سرتاپای حافظ را چرا در زر نمی گیرد

یا وفا یا خبر وصل تو یا مرگ رقیب
بازی چرخ ازیں یکدو سه کاری بکند

نقدها را بود آیا که عیارے گیرند
تا همه صومعه داران پے کاری گیرند

خرقه پوشان همگی مست گذشتند و گذشت
قصه ماست که در کوچه و بازار بماند

مطرب عشق عجب ساز و نوائے دارد
نقش هر پرده که زد راه بجائی دارد

از راه نظر مرغ دلم گشت هواگیر
اے دیده نظر کن که به دام که درافتاد

بس تجربه کردیم دریں دیر مکافات
با دردکشاں هر که درافتاد برافتاد

چه مستی است ندانم که رو به ما آورد
که بود ساقی؟ وایں باده از کجا آورد

رسیدن گل نسریں به خیر و خوبی باد
بنفشه شاد و خوش آمد سمن صفا آورد

از دیده خون دل همه بر روے ما رود
بر روے ما ز دیده ندانم چها رود

من و انکار شراب این چه حکایت باشد
غالباً ایں قدرم عقل کفایت باشد

آں شد اے خواجه که در صومعه بازم بینی
کار ما با رخ ساقی و لب جام افتاد

رطل گرانم ده اے مرید خرابات
شادی شیخی که خانقاه نه دارد

در زر گرفتن، سونے میں تلوا دینا، پے کاری گرفتن، کسی کام کے پیچھے پڑنا، لیکن ایسے موقعوں پر اپنا راستہ لینا، کے معنی میں آتا ہے، گذشت، گئی گذری بات ہوئی، راہ بجای دارد، اصول اور قاعدہ کے موافق ہے، درافتادن، الجھنا، صفا آورد، خیر مقدم کے وقت کہتے ہیں، چہا رود، کیسے گذرے گی، شادی شیخی یعنی ان کے آنے میں، بہ فلاں بخشیدن، ان کے صدقہ میں،

شراب وعیش نہاں چیست کار بے بنیاد　　زدیم بر صفِ رنداں، و ہرچہ بادا باد

یارب بوقتِ گل گنہ بندہ عفو کن　　ویں ماجرا بہ سرو لبِ جوئبار بخش

حاشا کہ من بہ موسم گل ترک می کنم　　من لاف عقل میزنم، ایں کار کے کنم

ای مگس عرصۂ سیمرغ نہ جولانگہ تست　　عرض خود می بری و زحمت[1] ما می داری

دردمندانِ بلا زہر ہلاہل نوشند　　قتل ایں قوم خطا باشد، ہاں تا[2] نہ کنی

اکثر محاورے ایسے ہیں جو صرف بول چال اور بے تکلفی میں استعمال ہوتے ہیں، اہل قلم یہ سمجھ کر کہ وہ متانت کے خلاف ہیں، تصنیفات میں استعمال نہیں کرتے، مثلاً اردو میں یہ محاورات "جاو بھی، رہنے بھی دیجئے، دیکھ لیا، وغیرہ وغیرہ روزمرہ استعمال میں آتے ہیں، لیکن ناسخ خواجہ درد، سودا وغیرہ ان کو نظم متانت کے خلاف سمجھتے ہیں، لیکن اس سے زبان کی وسعت گھٹتی ہے، اس لئے جن شعراء کو زبان کا خیال زیادہ ہے، مثلاً داغ وغیرہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یہ تمام محاورات لاتے ہیں، فارسی میں روزمرہ اور محاورہ کو خواجہ صاحب نے وسعت دی، ان کے کلام میں ایسے بہت سے محاورات ملیں گے جو کسی اور کے کلام میں نہیں مل سکتے، یہاں تک کہ بول چال کے لحاظ سے وہ محاورات بھی خواجہ صاحب نے لئے ہیں جو خاص لہجہ کے محتاج ہیں اور بغیر اس لہجہ کے سمجھ میں نہیں آسکتے، مثلاً

ناصحم گفت کہ جز غم چہ ہنر دارد عشق　　گفتم اے خواجۂ غافل! ہنرے بہتر ازیں

"ہنرے بہتر ازیں" کو ایک خاص لہجہ سے پڑھنا چاہئے، جس سے استفہام کے معنی پیدا ہوں، یعنی کیا اس سے بڑھکر کوئی اور ہنر ہوگا، یا مثلاً یہ شعر ع

کنار و بوسہ و وصلش چگویم چوں نخواہد شد

[1] زحمت کسے بر داشتن، کسی کو ستانا [2] ہاں تا نہ کنی، دیکھو ایسا نہ کرنا،

یعنی جب یہ ہونا نہیں ہے تو اس کا ذکر کیا کروں، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

خوش نوائی | صاحب ذوق صاف محسوس کرتا ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام میں ایک خاص قسم کی خوش گواری پائی جاتی ہے، شاعری میں موسیقی بھی شامل ہے، اس لئے جو شعر موسیقی اور خوش نوائی سے الگ ہوگا، شاعری کے رتبہ سے گھٹا ہوگا، خواجہ صاحب کے کلام میں یہ وصف مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اکثر وہ غزلوں کی بحریں ایسی رکھتے ہیں جو موسیقی سے مناسبت رکھتی ہیں، شعروں کے ارکان اور ان کے ٹکڑے ایسے لاتے ہیں جو تال اور سم کا کام دیتے ہیں، اس غرض کے لئے اکثر ہموزن الفاظ کا پے درپے آنا مدد دیتا ہے اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بار بار تان آکر ٹوٹتی ہے، مثلاً

چو در دست ست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش — کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

یکے از کفر می لافد دگر طامات می بافد — بیا کیں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد — من و ساقی بہم سازیم بنیادش براندازیم

شراب ارغوانی را گلاب اندر قدح ریزم — نسیم عطر گرداں را شکر در مجمر اندازیم

سرو روانِ من چرا میل چمن نمی کند — ہمدم گل نمی شود، یاد وطن نمی کند

دردم از یارست و درماں نیز ہم — دل فدائے او شدہ جاں نیز ہم

گر ز دست زلف مشکینت خطائی رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفائے رفت رفت

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، قدما کے کلام میں صنائع لفظی یعنی صنعت اشتقاق، ترصیع، ایہام نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، مراعات النظیر (تناسب لفظی)، جو حد سے گذر کر ضلع جگت بن جاتی ہے، سلمان ساوجی نے رواج دیا اور کچھ زمانہ تک بڑے زور و شور سے جاری رہی، ان صنعتوں کو عموماً شعرا نے محض صنعت

کی حیثیت سے استعمال کیا، یعنی اس لحاظ سے کہ اس کا التزام وقت آفرینی ہے اور دقت آفرینی ایک کمال کی بات ہے، اس عام رو سے خواجہ صاحب بھی نہ بچ سکے، چنانچہ مراعات النظیر اور ایہام وطباق ان کے ہاں بھی جا بجا پائے جاتے ہیں، مثلاً

تا دل ہرزہ گردِ من رفت بہ چینِ زلفِ او — زاں سفرِ دراز خود قصدِ وطن نمی کند

سخا نماند سخن طے کنم شراب کجاست — بدہ بہ شادیِ روحِ روانِ حاتم طے

ع نانِ حلال شیخ ز آبِ حرام ما

لیکن خواجہ صاحب نے زیادہ تر ان لفظی صنعتوں کو لیا ہے جن سے خوش آہنگی اور خوش نوائی پیدا ہوتی ہے، مثلاً

ایں کہ می گویند آں بہتر ز حسن — یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

اس شعر میں این و آں کا جو مقابلہ ہے اس کو ایک سطحی النظر یہ خیال کریگا کہ مراعات النظیر یا صنعتِ اضداد ہے، لیکن ایک صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ ان دو لفظوں کی آواز کا تناسب ایسا ہے جو خود بخود کانوں کو خوش معلوم ہوتا ہے اور موسیقی کی حیثیت سے دیکھیں تو گویا گیت کے اجزاء ہیں، مثلاً

قاصدِ حضرت سلمےٰ کہ سلامت بادا — چہ شود گر بہ سلامے دلِ ما شاد کند

اس میں سلمیٰ سلامت اور سلام جو ملتے جلتے الفاظ آئے ہیں ان سے عام آدمی کو صنعت اشتقاق کا خیال پیدا ہوگا، لیکن اصل میں یہ متناسب الفاظ ذرا ذرا سے فاصلہ پر بار بار آکر کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتے ہیں، یا مثلاً

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی — خدمت از ما برساں سرو و گل و ریحاں را

اس شعر میں سرو و گل و ریحاں جو الفاظ آئے ہیں، عام لوگ اس کا نام مراعات النظیر

یا صنعت اعداد وغیرہ رکھیں گے لیکن اس شعر کی بحر اور اس میں خاص ان متناسب الوزن الفاظ کا آخر میں آنا ایک خوش نوائی پیدا کرتا ہے، جو دوسری صورت میں ممکن نہ تھی، حالانکہ یہ ممکن تھا کہ وہ صنعتیں باقی رہتیں،

خواجہ صاحب کے کلام میں جہاں اس قسم کی صنعتیں نظر آئیں غور سے دیکھو تو ان میں دراصل خوش نوائی اور خوش آہنگی کا وصف ملحوظ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو،

اعتمادے نیست بر دور جہاں — بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم
از بہر بوسۂ زلبش جاں ہمی دہم — اینم نمی ستاند و آنم نمی دہد
شیوۂ ناز تو شیریں خط و خال تو ملیح — چشم و ابروی تو زیبا قد و بالای تو خوش
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب رکناباد و گلگشتِ مصلا را
گر ز دست زلفِ مشکینت خطای رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفای رفت رفت
برق عشق ار خرمن پشمینہ پوشے سوخت سوخت — جور شاہ کامراں گر بر گدائے رفت رفت
گر دلم از غمزۂ دلدار تابے بُرد بُرد — درمیان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

غور کرو ان اشعار میں جہاں جہاں مکرر الفاظ آئے ہیں کس قدر کانوں کو خوش معلوم ہوتے ہیں، ظاہر بیں اس کو صنعتِ تکرار کہہ دیگا، لیکن کیا ہر جگہ کسی لفظ کا مکرر آنا کوئی لطف پیدا کرتا ہے،

کاروان رفت تو در خواب و بیاباں در پیش — کے روی؟ رہ زکہ پرسی؟ چہ کنی؟ چوں باشی؟

مصرع اخیر میں تم کو خیال ہوگا کہ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ پے درپے سوالات آئے ہیں، جس سے صنعتِ استفہام پیدا ہوگئی ہے، لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھو یہ الفاظ کس طرح کانوں کو ایک خاص تناسب کھٹکا دیتے ہیں، اور خوش آیند معلوم ہوتے ہیں،

خدارا رحمی اے منعم کہ درویش سر کویت — درے دیگر نمی داند رہ دیگر نمی گیرد

بندش کی چستی | بندش کی چستی ایک وجدانی چیز ہے، اس کی تعریف اور تحدید نہیں ہوسکتی لیکن مذاق صحیح آسانی سے اس کا احساس کرتا ہے، مثلاً ان اشعار میں باوجود اتحاد مضمون اور الفاظ کے، بندش کی چستی کا جو فرق ہے ہر شخص محسوس کرسکتا ہے،

سلیم — مشاطہ را جمالِ تو دیوانہ می کند — کائینہ را خیال پری خانہ می کند

صائب — دل را نگاہ گرم تو دیوانہ می کند — آئینہ را رخ تو پری خانہ می کند

غنی — ہر کس کہ دید روی تو دیوانہ می شود — آئینہ از رخ تو پری خانہ می شود

صائب — سر چشمۂ حیات لب می چکان اوست — عمر دوبارہ سایۂ سرو روانِ اوست

فطرت — عیش ابد بہ کام دل دردمند نست — عمر دوبارہ سایۂ سرو بلند تست

صائب — ہمیشہ صاحب طول امل غمیں باشد — کہ چین بقدر بلندی در آستیں باشد

بیدل — دستگاہست ہر قدر بیش است کلفت بیشتر — در خور طول است چین جائے کہ دارد آستیں

خواجہ صاحب جیسا کہ خود انھوں نے متعدد موقعوں پر تصریح کی ہے، سلمان اور خواجو کی غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں، ان غزلوں کے مقابلہ کرنے سے بندش کے زور اور چستی کا فرق صاف نظر آجاتا ہے،

حافظ	سلمان
گوہر مخزنِ اسرار ہمان است کہ بود	ہمچناں مہر توام مونسِ جان است کہ بود
حقۂ مہر بداں مہر ونشان است کہ بود	ہمچناں ذکر توام در وزبان است کہ بود

"مونس جان" کے قافیہ کے جواب میں خواجہ صاحب کا شعر ہے،

از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح — بوی زلفِ تو ہماں مونس جان است کہ بود

سلمان

شوقم افزوں شد و آرام کم و صبر نماند
در فراقِ تو وے عہد ہماں ست کہ بود

حافظ

عاشقاں بندۂ ارباب امانت باشند
لاجرم چشم گہربار ہماں است کہ بود

اس شعر میں سلمان کی بندش کی سستی صاف ظاہر ہے، "در فراق تو" کا موقع پہلے مصرع کے ابتدا میں ہے، وہاں سے الگ ہو کر وے کے ساتھ اس کی ترکیب بالکل بے مزہ ہو گئی ہے،

سلمان

کے بود کے کہ بگویند سراسر اغیار
کہ فلاں یار ہماں یار فلان است کہ بود
در ازل عکسِ مئی لعل تو در جام افتاد
عاشقِ سوختہ دل در طمع خام افتاد

حافظ

طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
ہمچناں در عمل معدن و کان است کہ بود
عکس روی تو چو در آئینۂ جام افتاد
عارف از پرتو مے در طمع خام افتاد

جام کے قافیہ میں حافظ کے اور اشعار ملاحظہ ہوں،

آں شد ای خواجہ کہ در صومعہ بازم بینی
کار من بارخِ ساقی و لبِ جام افتاد

سلمان

عشق بر کشتن عشاق تفاؤل می کرد
اولیں قرعہ کہ زد بر من بد نام افتاد
خالِ مشکینِ تو در عارض گندم گوں دید
آدم آمد ز پے دانۂ و در دام افتاد

حافظ

صوفیاں جملہ حریف اند و نظر باز ولے
زاں میاں حافظ سودا زدہ بدنام افتاد
در خمِ زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ
آہ کز چاہ برون آمد و در دام افتاد

ان اخیر کے دونوں شعروں کے مقابلہ سے بندش کی چستی کا مفہوم تم کو علانیہ

واضح ہو جائیگا، سلمان کا شعر اگرچہ معنی کے لحاظ سے بالکل ناموزوں ہے، چہرہ کو دام سے کوئی مناسبت نہیں بخلاف اس کے خواجہ صاحب نے ذقن کو چاہ اور زلف کو دام کہا ہے، اور یہ عام مسلمہ تشبیہ ہے، لیکن سلمان کے شعر میں بندش کی جو چستی ہے، خواجہ صاحب کے شعر میں نہیں ہے ع آدم آمد زپے دانہ و در دام افتاد،، آدم، دانہ، دام، یہ الفاظ ایسی ترتیب اور خوبصورتی اور روانی سے جمع ہو گئے ہیں کہ مصرع میں نہایت برجستگی پیدا ہو گئی ہے، خواجہ صاحب کا مصرع پھس پھسا ہے، اور خصوصاً آہ کے لفظ نے مصرع کو بالکل کم وزن کر دیا ہے،

سلمان	حافظ
دام زلف تو بہر حلقہ طنابے دارد	آں کہ از سنبل او غالیہ تابے دارد
چشم مست تو بہر گوشہ خرابے دارد	باز با دلشدگان ناز و عتابے دارد
خون چشم من ازاں ریخت کہ تا ظن نہ برم	چشم من کرد بہر گوشہ رواں سیل سرشک
کہ برتش مردم صاحب نظر آبے دارد	تا سہی سرو ترا تازہ بہ آبے دارد
رسن زلف تو سر رشتۂ جان من و شمع	ماہ خورشید نمایش زپس پردۂ زلف
ہر یک از آتش رخسار تو تابے دارد	آفتابے ست کہ در پیش سحابے دارد
آں کہ زابرو و مژہ تیر و کمانے دارد	شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
چشم ہا کردہ سیہ قصد جہانے دارد	بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

ان مقابلوں سے بندش کی چستی اور زور کا مفہوم اچھی طرح تمھاری سمجھ میں آگیا ہوگا، اب خواجہ صاحب کے اشعار ذیل کو اس نظر سے دیکھو،

آں شمع سرگرفتہ دگر چہرہ برفروخت　　واں پیر سالخوردہ جوانی ز سر گرفت

آں عشوہ داد عشق کہ مفتی زرہ برفت — واں لطف کرد دوست کہ دشمن حذر گرفت

زنہار زاں عبارت شیرین و دل فریب — گوئی کہ پستۂ تو سخن در شکر گرفت

من ایستادہ تا کنمش جاں فدا چو شمع — او خود گذر بمن چو نسیم سحر نہ کرد

ماہی و مرغ دوش نہ خفت از فغان من — واں شوخ دیدہ بیں کہ سر از خواب بر نکرد

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من — کوتاہ کرد قصۂ زہد دراز من

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست — وندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جام جہاں بیں بتو کے داد حکیم — گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

زلفیں سیہ خم بہ خم اندر زدہ باز — بختِ منِ شوریدہ بہم بر زدہ باز

بر شیشہ صبرم زدۂ سنگ ولیکن — با تو چہ تواں گفت کہ ساغر زدۂ باز

ہمارے نزدیک حسن کلام کا بڑا جوہر یہی حسن بندش ہے،

جاحظ کا قول ہے کہ مضمون بازاریوں تک کو سوجھتے ہیں، جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لطف ادا اور بندش کا ہے، سیکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ ایک مضمون کسی شاعر نے باندھا بعینہٖ وہی مضمون دوسرے نے باندھا، الفاظ تک اکثر مشترک ہیں، لیکن لفظوں کے الٹ پھیر اور ترتیب سے وہی مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا،

شوخی و ظرافت خواجہ صاحب کے کلام میں جا بجا شوخی اور ظرافت بھی ہے لیکن نہایت لطیف اور نازک ہے، شیخ سعدی اور خیام بھی ظرافت کرتے ہیں، لیکن زیادہ کھل جاتے ہیں، خواجہ صاحب کی شوخی طبع کی لطافت دیکھو،

واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند — قول ما نیز ہمین است کہ او آدم نیست

یعنی واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں، اس قدر تو ہمکو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں ہے،

(باقی فرشتہ ہے یا شیطان اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا)

بکوی می فروشانش بہ جامے در نمی گیرند　　زہی سجادۂ تقوی کہ یک ساغر نمی ارزد

گر ز مسجد بہ خرابات شدم عیب مگیر　　مجلس وعظ دراز است و زمان خواہد شد

یعنی میں اگر مسجد سے اٹھ کر شراب خانہ میں چلا گیا، تو اعتراض کی کیا بات ہے، وعظ تو ابھی تک ہوتا رہے گا، میں پی کے چلا آؤں گا،

اسی مضمون کو قائم نے اردو میں ادا کیا ہے،

مجلس وعظ تو تادیر رہے گی قائم　　یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

حافظ

محتسب خم شکست و بندہ سرش　　سن بالسن و الجروح قصاص

قرآن مجید میں قصاص کی آیت میں مذکور ہے کہ زخم کا بدلا زخم ہے، مثلاً اگر کوئی کسی کا دانت توڑ ڈالے تو اس کا بھی دانت توڑ ڈالا جائیگا،

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ محتسب نے خم شراب کو توڑ ڈالا تھا، میں نے قصاص کے حکم کے موافق اس کا سر توڑ دیا،

پدرم روضۂ رضواں بدو گندم بفروخت　　ناخلف باشم اگر من بجوی نفروشم

میرے باپ (حضرت آدمؑ) نے بہشت کو گیہوں کے بدلہ میں بیچ ڈالا تھا، میں اگر ایک جو کے بدلہ میں نہ بیچوں تو ناخلف ہوں،

من و انکار شراب! این چہ حکایت باشد　　غالباً این قدرم عقل کفایت باشد

میں اور شراب کا انکار! غالباً مجھے تو اتنی ہی عقل کافی ہے، یعنی یہ سمجھ لوں کہ شراب چھوڑنا مجھکو زیبا نہیں، اس سے زیادہ عاقل اور دور اندیش ہونا مجھکو ضرور نہیں،

نہ من ز بے عملی در جہاں ملولم و بس ملامت علما ہم ز علم بے عمل است

میں بیکاری سے (یعنی شراب وغیرہ کا مشغلہ نہیں ہے) دل گرفتہ ہوں، بے عمل ہونا برا ہے اسی لئے عالم بے عمل بھی اچھا نہیں ہوتا،

نقد دے کہ بود مرا صرف بادہ شد قلب سیاہ بود بہ جاے حرام رفت

قلب دل کو بھی کہتے ہیں اور کھوٹے سکہ کو بھی، اس بنا پر کہتے ہیں کہ میرا قلب اگر شراب میں صرف ہوا تو ہونا ہی چاہئے، ع مال حرام بود بجاے حرام رفت،

تسلسل مضامین ایشیائی غزل گوئی کا ایک بڑا عیب یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ کسی خیال کو مسلسل نہیں ظاہر کر سکتے، ہر غزل متعدد اور مختلف بلکہ متناقض مضامین کا مجموعہ ہوتی ہے، غزل کے جو مہمات مضامین ہیں، مثلاً حسن، عشق، سراپاے معشوق، وصل، ہجر، ہزاروں دفعہ بندھے ہیں لیکن ان میں سے کسی مضمون کی نسبت کوئی مسلسل اور تفصیلی بیان کہیں نہیں مل سکتا، اگرچہ حقیقت میں یہ چنداں اعتراض کی بات نہیں مسلسل خیالات کے لئے مثنوی کی صنف متعین کر دی گئی ہے، قصائد اور قطعات سے بھی یہ کام لیا جاتا ہے، غزل اس ضرورت کے لئے خاص کر دی گئی ہے، کہ چھوٹے چھوٹے مفرد خیالات جو شاعر کے دل میں آتے رہتے ہیں، ضائع نہ جانے پائیں، اس صنف کے لئے نہایت قادر الکلامی درکار ہے، یورپ کو اپنی شاعری پر ناز ہے لیکن وہ کسی خیال کو دو چار شعروں سے کم میں نہیں ادا کر سکتے، بخلاف اس کے ہمارے شعرا نہ صرف چھوٹی چھوٹی باتیں بلکہ نہایت وسیع اور بڑے مضامین کو بھی ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں، جو اختصار کی وجہ سے فوراً زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جو نہ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے مثنوی یا قصائد کی وسعت درکار ہو، نہ اتنے مختصر کہ ایک دو شعروں

میں سما جائیں، اس لئے اس قسم کے مضامین کے لئے غزلیں ہی مناسب ہیں، اس صورت میں ضرور ہے کہ غزل مسلسل ہو یعنی پوری غزل یا غزل کے متعدد اشعار ایک ہی مضمون کے لئے خاص کر دیئے جائیں، اس قسم کی غزل کا رواج اگرچہ عام نہیں ہوا تاہم جستہ جستہ پائی جاتی ہیں، اور سب سے پہلے خواجہ صاحب نے اس کو ترقی دی، ان کی اکثر غزلوں میں ایک خاص خیال یا ایک خاص سماں دکھایا گیا ہے، اس قسم کی چند غزلوں کے مطلع ہم نقل کرتے ہیں،

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند — وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند — گرہ از کار فرو بستۂ ما بکشایند

بامداداں کہ بہ خلوت گہ کاخ ابداع — شمع خاور فگند بر ہمہ اطراف شعاع

ای پیک پی خجستہ چہ نامی فدیت لک — ہرگز سیاہ چردہ ندیدم بہ ایں نمک

گر ز دستِ زلفِ مشکینت خطائی رفت رفت — ور ز ہندوی شما بر من جفای رفت رفت

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بہ وجود — بنفشہ در قدمِ او نہاد سر بہ سجود

(بہار کے ذکر میں ہے)

یاد باد آں کہ نہانت نظرے با ما بود — رقمِ مہر تو بر چہرۂ ما پیدا بود

پوری غزل میں پہلی دلچسپیوں کو یاد دلایا ہے، اور ہر شعر یاد باد سے شروع ہوتا ہے،

خوشا شیراز و وضعِ بے مثالش — خداوندا نگہدار از زوالش

(شیراز کی تعریف میں ہے)

نسیمِ صبحِ سعادت بداں نشاں کہ تو دانی — خبر بکوئی فلاں بر بداں زماں کہ تو دانی

(قاصد سے پیغام کہا ہے)

ابن یمین فریومدی

باپ کا نام محمود ہے، قوم کے ترک تھے، اور ترکستان وطن تھا، سلطان محمد خدابندہ کے زمانہ میں خراسان میں آئے اور فریومد میں جو ایک قصبہ کا نام ہے قیام اختیار کیا، یہاں زمین اور جائدادیں خریدیں، یہ ابجاتیو سلطان کا عہد حکومت تھا، اور علاءالدین محمد وزیر السلطنت تھے، علاءالدین نے ان کی نہایت قدردانی کی، شعر کہتے تھے، یہ رباعی ان کے انداز کلام کا نمونہ ہے،

دارم زعتاب فلکِ بوقلموں | وزگردش روزگار خس پرورددوں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک | جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین فریومد میں پیدا ہوئے، باپ نے شاعری کی تعلیم دی، اکثر جن طرحوں پر خود کہتے تھے، بیٹے سے بھی کہلاتے تھے، چنانچہ اوپر کی رباعی پر ان کی رباعی بھی ہے،

دارم زجفای فلک آئینہ گوں | پرآہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہ ہزار غم بہ شب ؤرآرم | تا خود فلک از پردہ چہ آرد بیروں

ابتدا میں سرداروں کی مداحی کرتے تھے،

بالآخر فقر و قناعت اختیار کی، اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے، تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی، اس کی کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے، ۸ رجمادی الثانی ۷۶۹ھ میں وفات پائی، مرتے وقت یہ رباعی لکھی تھی،

منگر کہ دل ابن یمین پر خون شد — بنگر کہ ازین سرای فانی چون شد

مصحف بہ کف و چشم بہ رہ روی بہ دوست — با پیک اجل غمزہ زنان بیرون شد

کلام ان کا دیوان سرداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہوگیا، غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں، کہ میں نے ان کا دیوان ذال کی ردیف تک دیکھا ہے، لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا' تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزل، اور قصائد سب کچھ کہتے تھے' ید بیضا میں انکی غزل کے بعض اشعار نقل کئے ہیں،

سرمہ دہ اے دیدہ ہر دم اشک غماز مرا — تا نسازد فاش پیش مردمان راز مرا

زخود بیگانہ بودن در رہ عشق — بہ آں معشوق طرح آشنائی است

عشق تا در دل آمد نہ در آمد نہ نمود — بادہ پر شور نشد تا کہ بہ مستاں نہ رسید[1]

ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں، لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت اور خودداری ان کا خاص حصہ ہے، ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کرسکا، اور چونکہ ان کا قال، حال کی تصویر ہے، اس لئے ایک خاص اثر رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہوسکتا،

دو قرص نان، اگر از گندم است یا از جو — دو تای جامہ اگر کہنہ است یا خود نو

بہ چار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع — کہ کس نگوید ازین جا بخیز و آنجا رو

ہزار بار فزون تر بہ نزد ابن یمین — ز فر مملکت کے قباد و کے خسرو

اگر دو گاؤ بدست آوری و مزرعۂ — یکے امیر و یکے را وزیر نام کنی

---

[1] یہ تمام حالات ید بیضا سے اور تذکرۂ دولت شاہ سے لئے گئے ہیں،

بداں قدر چو کفافِ معاش تو نہ شود ‌‌ روی و نان جوے از یہود، وام کنی
ہزار بار ازاں بہ کہ از پے خدمت ‌‌ کمر بہ بندی و بر مردکے سلام کنی

ز دیوانۂ کرد روزے سوال ‌‌ سلیمان مرسل علیہ السّلام
کہ چوں بینی ایں سلطنت کزیدہ ‌‌ مرا ماند باایں ہمہ احتشام
چہ خوش گفت دیوانہ اورا جواب ‌‌ کہ چوں نیست ایں مملکت مستدام
پدر مدتے آہن سرد کوفت ‌‌ تو در باد پیمودنے صبح و شام

حضرت داؤدؑ زرہ بنایا کرتے تھے، اور حضرت سلیمانؑ کی نسبت مشہور ہے کہ اُن کا تخت ہوا پر چلتا تھا، فارسی میں آہن سرد کوفتن، اور باد پیمودن کے معنی بیکار کام کرنے کے ہیں، دیوانہ نے حضرت داؤدؑ کے زرہ بنانے اور حضرت سلیمانؑ کے تختِ ہوا پر چلنے کو آہن سرد کوفتن اور باد پیمودن سے تعبیر کیا ہے،

مرد آزادہ در میان گروہ ‌‌ گرچہ خوش گوی و عاقل و داناست
محترم آنگہے تواند بود ‌‌ کہ از ایشاں بمالش استغناست
واں کہ محتاجِ خلق شد خوارست ‌‌ گرچہ در علم بو علی سیناست

شنیدہ ام کہ یکے عقربے ز خانۂ خویش ‌‌ بروں دوید و ہمی زد ہر آنچہ آمد پیش
بہ پیشش آمد سنگے عظیم و بس منکر ‌‌ بزد بہ سنگ دو صد نیش تا جگر دو ریش
ز سنگ نعرہ بر آمد کہ خویش رنجہ مدار ‌‌ کہ ضرب نیش تو ما را نہ کم کند نہ بیش

جواب دادش و گفتش کہ است می گوئی — ولے پدید کند ہر کہ ہست جوہر خویش

شاعری نیست پیشہ کہ ازاں — رسدت نان و نیز ترہ بہ دوغ

راستی، سخت زشت و بے معنی است — اجرتے خواستن برائے دروغ

زاں بود کار شاعران بے نور (واقعی) — کہ ندارد چراغ کذب فروغ

قناعت اور توکل کے ساتھ، یہ نکتہ بھی ابن یمین کے ذہن نشین ہے کہ زر کے بغیر اطمینان نہیں حاصل ہوتا، چنانچہ فرماتے ہیں،

لالہ را گفتم اے پری پیکر — سیرتت خوب و صورتت نیکوست

راست گو ایں سیہ دلی از چیست — گرت زخمے رسید از دوست

گفت زیرا کہ من ندارم زر — زر کہ اسباب شادکامی از وست

غنچہ را بیں کہ خردہ دارد — مے نہ گنجد ز خرمی در پوست

کبھی کبھی فلسفہ کہہ جاتے ہیں،

زدم از کتم عدم خیمہ بہ صحرائے وجود — از جمادے بہ نباتے سفرے کردم و رفت

بعد ازاں کشمکش نفس، بہ حیوانی برد — چوں رسیدم بوی ازوی گذرے کردم و رفت

بعد ازاں در صدف سینۂ انسان بہ صفا — قطرۂ ہستی خود را گہرے کردم و رفت

با ملائک پس ازاں صومعۂ قدسی را — گرد بر گشتم و نیکو نظرے کردم و رفت

بعد ازاں سوی او بردم و چوں ابن یمین — ہمہ او گشتم و ترک دگرے کردم و رفت
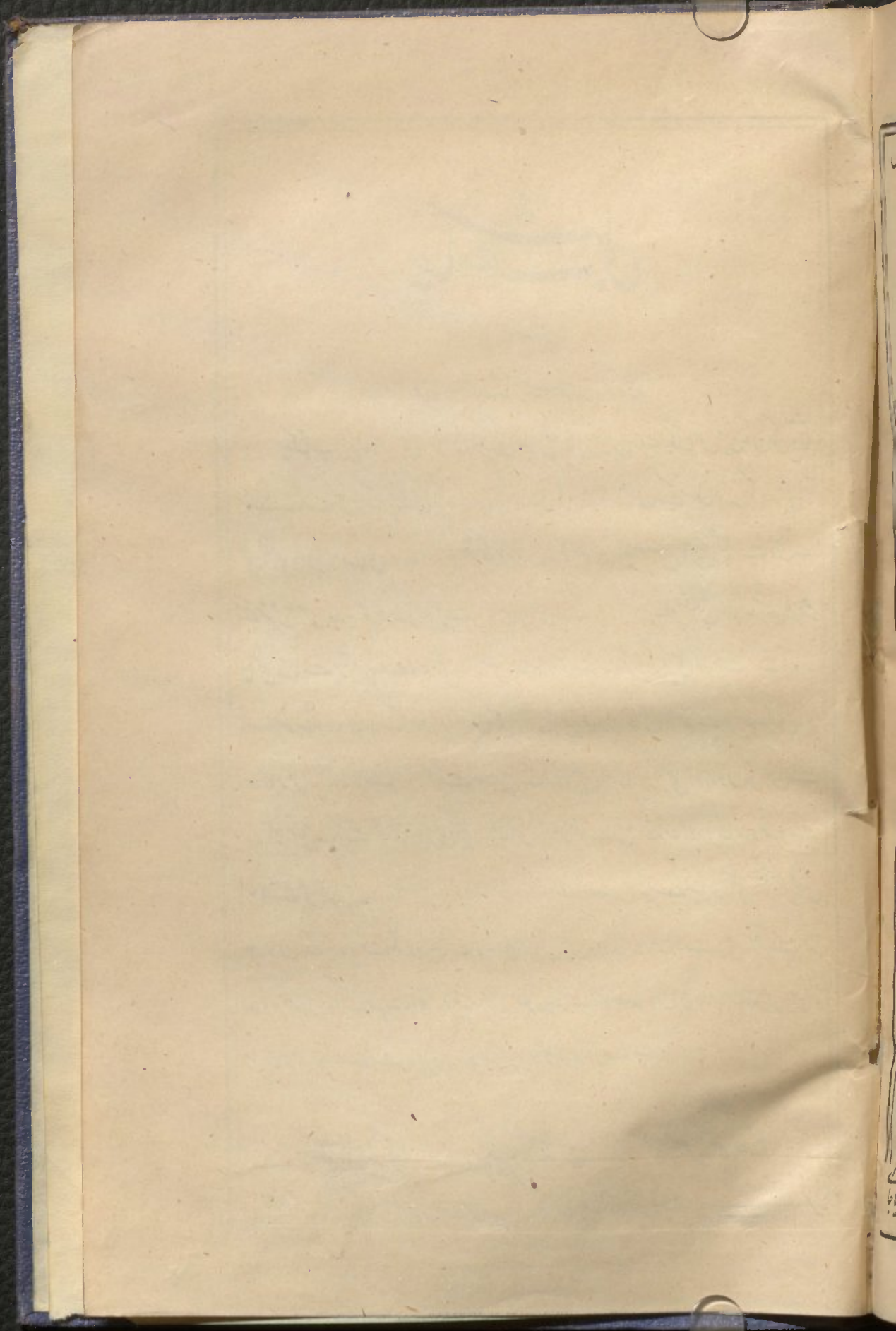
(حصہ اول)

مرتبہ مولٰنا سید سلیمان ندوی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری نہین ہے، بلکہ اس مین اُن کی وفات ۱۹۱۴ء تک اس کے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانون کی مذہبی سیاسی علمی تعلیمی، ادبی، اصلاحی اور دوسری تحریکون اور سرگرمیون کی مفصل تاریخ آگئی ہے، کتاب کے شروع مین جدید علم کلام کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لے کر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانون کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کئے گئے ہین، ضمناً ان تعلیمی ادارون کی جن سے مولانا کا تعلق رہا ہے، مجمل تاریخ بھی آگئی ہے، اس کی ضخامت مع مقدمہ اور دیباچہ وغیرہ کے ۹۲۰ صفحے ہی، جس مین دار المصنفین، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اور شبلی انٹر کالج کی عمارتون کے تیرہ ہاف ٹون بلاک فوٹو بھی شامل ہین، کاغذ اور طباعت اعلی، قیمت غیر مجلد علاوہ محصول ڈاک صرف آٹھ روپیہ، مجلد لعہ یہ کتاب کا حصۂ اول ہی، دوسرا حصہ جس مین مولٰنا کی شاعری اور تصنیفات وغیرہ پر ریو و تبصرہ ہوگا، زیر تالیف ہے،

مسعود علی ندوی — منیجر دار المصنفین — شہر اعظم گڈہ

(مطبع معارف مین صدیق احمد نے چھپوا کر شائع کیا)